شہرِ محبت

طاہر جاوید مغل

جذبات کے تلاطم سے جنم لینے والی ایک سنسنی خیز داستان عشق

چاہت کے سہنے بڑے سندر اور نازک آبگینوں کے مانند ہوتے ہیں جنہیں بہت سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے بھی کرچی کرچی ہوجاتے ہیں مگر...... یہاں تو حسد و رقابت کی اتنی تیز آندھیاں تھیں کہ کوئی زندگی ہی ہار گیا اور کوئی جیت کر بھی زندگی کا لطف نہ اٹھا سکا۔ حسد و رقابت کے جذبات سے جانے کتنی ہی کہانیوں نے جنم لیا۔ جہاں اپنی مقصد برآری کے لیے لوگ کیا کیا گُر اپنا لیتے ہیں اور کسی کو ذلت کے گڑھے میں دھکیلنے کے لیے کیسے کیسے ہُنر آزماتے ہیں لیکن...... قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی...... اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ محبت کے جو لمحات اس کے ہاتھوں سے ریت کے مانند پھسل چکے تھے وہی اتنے دلکش سراپا میں ڈھل کر اس کے سامنے آکھڑے ہوں گے...... مگر جانے کیوں اس بار اس کی آنکھیں شہرِ محبت کا یہ خواب دیکھنے کے لیے راضی نہ ہوسکیں...... خوشبوؤں کی سرزمین پیرس کی حسین رہ گزاروں میں سفر کرتی ایک گنگناتی خوبصورت داستان محبوب مصنف طاہر جاوید مغل کے قلم کی دلکش روانی۔

شہزاد اکمل کرسی پر بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پیرس اس کے سامنے تھا۔ محبتوں، خوشبوؤں، سرمستیوں اور لازوال کہانیوں کا شہر...... وہ اپنی سفیدی مائل رنگت کے ساتھ حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ ہوٹل کی اس چوتھی منزل سے شہر [illegible] دور تک دیکھ سکتا تھا۔

شہزاد اپنی مختصر فیملی کے ساتھ ابھی کچھ ہی دیر پہلے پی آئی اے کی پرواز سے لاہور سے یہاں پہنچا تھا۔ سفر کیسا بھی ہو بندے کو تھکاتا ضرور ہے۔ وہ سب بھی تھکے ہوئے تھے۔

کہیں بھی جانے اور گھومنے پھرنے سے پہلے وہ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتے تھے لیکن اس افسانوی شہر کی کشش اس قدر زیادہ تھی کہ شہزاد سے صبر نہیں ہو پا رہا تھا۔ اسے کھڑکی میں سے مشہور و معروف دریائے سین کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ نیلے پانی پر چلتی ہوئی خوبصورت کشتیاں جو پھولوں سے لدی تھیں اور کناروں پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے لوگ اور اردگرد کے سارے خوبصورت مناظر شہزاد کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے اس کی بیوی کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔ ''شہزاد ادھر آئیں...... یہ دیکھیں۔''

وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں پہنچا۔ اس کی بیوی سونم اور دونوں بچے کھڑکی سے لگے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔

''وہ دیکھیں ابو...... وہ کیا ہے؟'' شہزاد کے بڑے بیٹے بارہ سالہ عمیر نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شہزاد نے اس طرف دھیان سے دیکھا۔ عمارتوں اور درختوں کے عقب سے ایک ''چیز'' نظر آ رہی تھی۔ ہاں یہ وہی عالمی عجوبہ تھا جو اس شہر ہفت رنگ کی پہچان ہے جسے دیکھنے کے لیے ہر سال دنیا سے لاکھوں کروڑوں لوگ امڈے چلے آتے ہیں۔ یہ ایفل ٹاور تھا۔ وہ ان سے قریباً آٹھ دس کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ عمارتوں کے عقب سے بس اس کا بالائی حصہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چاروں مبہوت اسے دیکھتے رہے اور یہ یقین کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ ایفل ٹاور واقعی ان کے سامنے ہے۔

اس کا چھوٹا بیٹا دس سالہ احسن مچل کر بولا۔ ''ابو چلیں، ہمیں ٹاور پر لے کر چلیں۔''

شہزاد ہنسا۔ ''بھئی یہ تو پیرس کا کلائمکس ہے اگر کلائمکس...... پہلے ہی دیکھ لیا تو باقی فلم کا کیا مزہ آئے گا۔ یہ بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں دیکھنے کی اتنی چیزیں ہیں کہ تم دیکھتے دیکھتے تھک جاؤ گے لیکن میرے بھائی! ابھی کھانا کھا کر ذرا آرام کرلیں پھر شام کو نکلیں گے اور رات گئے تک گھومیں گے۔''

''لیکن ہم تو بالکل تھکے ہوئے نہیں ہیں۔'' عمیر نے کہا۔

''اس مہم میں تمہاری امی یقیناً شامل نہیں ہوں گی۔'' شہزاد نے سونم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سونم مسکراتی ہوئی عینک کے شیشے صاف کر کے بولی۔ ''تمہارے ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم لوگ جوان جہان ہو۔ نان اسٹاپ چل سکتے ہیں۔ ہمیں رک رک کر چلنا پڑتا ہے۔ لنچ کرلو، تھوڑی دیر آرام کر کے دریا کی طرف نکلیں گے۔''

[illegible] شہزاد اکمل پھر کھڑکی کے سامنے آ بیٹھا۔ عمیر اور احسن اپنے کیمرے وغیرہ تیار کرنے لگے۔ شہزاد اکمل فائن آرٹ کا پروفیسر تھا۔ وہ پچھلے قریباً پندرہ سال سے پاکستان کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی سے منسلک تھا اور پرکشش مشاہرہ حاصل کر رہا تھا۔ پبلسٹی ڈیزائننگ کے شعبے میں شہزاد اکمل کا شمار ملک کے گنے چنے لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ کئی کتابوں کا مصنف تھا اور اسے اپنے سبجیکٹ میں اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ ایک مقامی انسٹیٹیوشن کی خصوصی دعوت پر وہ پاکستان سے یہاں پہنچا تھا۔ شروع میں فقط اکیلے اسی کا پروگرام تھا لیکن بعد میں بیوی اور دونوں بچے بھی اس پروگرام میں شامل ہو گئے اور یوں یہ پروگرام کام کے ساتھ ساتھ آرام اور تفریح کا پروگرام بھی بن گیا۔ بہرحال اس کے لیے شہزاد اکمل کو اپنے وسیع تعلقات کے باوجود کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی۔ پاسپورٹ تو خیر پہلے سے بنے ہوئے تھے۔ ویزوں کے حصول میں کچھ وقت ہوئی تھی۔ ایک الجھن یہ بھی تھی کہ ویزے وقت پر مل جائیں تاکہ بچوں کی گرمائی تعطیلات سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

بہرطور یہ مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا تھا اور اب وہ دو مہینے کے ٹور پر یہاں پیرس میں قدم رنجہ فرما چکے تھے۔

کھانے کے سلسلے میں بیرون ملک حرام حلال کا بہت مسئلہ ہوتا ہے۔ شکر کا مقام تھا کہ انہوں نے جس ہوٹل میں قیام کیا تھا وہ ایک ترکش ہوٹل تھا۔ انہوں نے کھانا کھایا اور آرام کے لیے لیٹ گئے اور اب شاید شام چھ بجے سے پہلے ان کی آنکھ نہیں کھلنے والی تھی...... اور ہوا بھی یہی تھا۔ عمیر اور احسن نے اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا تھا۔ وہ باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگے۔ سونم کی شکل دیکھتے ہی شہزاد کو اندازہ ہو گیا کہ آج اس کی ٹانگوں میں پھر درد ہے اور شاید وہ ان کے ساتھ باہر بھی نہیں جا سکے گی۔ وہ خود بھی سونم کے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا مگر بچوں کی ضد کے سامنے ڈٹے رہنا بھی محال تھا۔ شہزاد نے ہمیشہ کی طرح درمیانی راستہ اختیار کیا۔ سونم کو دوائی وغیرہ کھلا کر اور ضروری ہدایات دے کر وہ بچوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

یہ پیرس کی ایک نہایت چمکیلی اور خوشگوار شام تھی۔ آسمان بالکل نیلا تھا، ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ یہ شہر کا وسطی حصہ نہیں تھا۔ دریائے سین کے کنارے یہ ایک طرح سے پیرس کا کشادہ اور پوش علاقہ تھا۔ شہر کی اصل آبادی ایفل ٹاور سمیت انہیں دور سے اپنی دائیں جانب نظر آتی تھی۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

دریائے سین کا تذکرہ شہزاد نے شاعری اور ادب میں

بہت پڑھا تھا۔ انگریزی ادب کے رومانی ناولوں میں بھی یہ دریا جگہ جگہ اپنی تمام خوبصورتی اور رومانیت کے ساتھ لہریں لیتا نظر آتا تھا۔ آج وہ ایک حسین شام میں خود اس دریا کے کنارے موجود تھا۔ اس کے اندر کا رومانی شخص اس کے دل و دماغ میں خوبصورت مناظر کے تانے بانے بن رہا تھا مگر یہ سب کچھ تصوراتی تھا۔ حقیقت ان تصورات سے بہت مختلف تھی اور حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک انچاس پچاس سالہ شخص تھا۔ اس کی کنپٹیوں سے بیشتر بال سفید ہو چکے تھے۔ اس کا جسم ڈھل رہا تھا۔ اس کے دو بچے تھے اور اس کی بیوی اپنی ٹانگوں کے درد کے سبب پیرس آ کر بھی ابھی تک پیرس سے دور تھی۔

اس نے گہری سانس لی۔ دریائے سین کی لہروں کو چھو کر آنے والی بہت سی ہوا اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوئی۔

''ابو آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' عمیر نے شہزاد کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ سوچ رہا ہوں...... یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''جب آپ اس طرح لمبی سانس لیتے ہیں اور اپنی آنکھوں کو تھوڑا سا سکیڑتے ہیں تو مجھے پتا چل جاتا ہے کہ آپ کچھ سوچ رہے ہیں۔''

''اور مجھے بھی۔'' احسن نے پنڈلی کیم سے منظر کشی کرتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں تو بڑے نفسیات دان ہو گئے ہو۔'' شہزاد نے کہا۔

''اچھا ابو! بتائیں آپ کیا سوچ رہے تھے؟''

''جو میں سوچ رہا ہوں وہ تمہیں نہیں بتا سکتا اور اگر بتاؤں گا تو تمہیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔''

''لیکن پتا تو چلے آپ کیا سوچ رہے تھے؟''

''مستنصر حسین تارڑ کا نام سنا ہوا ہے آپ نے؟''

''وہ جو کرکٹ کے ریفری ہیں؟''

''دیکھو تمہاری دونوں باتیں غلط ہیں۔ ایک تو کرکٹ میں ریفری نہیں ہوتا، دوسرے مستنصر حسین تارڑ ریفری یا امپائر وغیرہ نہیں ہیں۔''

''تو پھر کھلاڑی ہوں گے۔''

''کھلاڑی بھی نہیں۔ کم از کم ان معنوں میں نہیں جن میں تم کہہ رہے ہو۔''

''تو پھر کیا کیا تھا انہوں نے جس کی وجہ سے آپ اب انہیں یہاں یاد کر رہے ہیں؟''

''انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی 'پیار کا پہلا شہر' یا نہیں وہ پہلا تھا یا نہیں لیکن کتاب ضرور اچھی تھی۔ اس میں اسی دریائے سین کا ذکر تھا۔ اسی لیے ذہن اس طرف چلا گیا۔''

''لیکن ابو جان! شہر تو اینٹوں اور سیمنٹ وغیرہ سے بنا ہے ناں۔ پیار کے شہر کا کیا مطلب ہوا؟'' عمیر نے نکتہ اٹھایا۔

''کچھ شہر اینٹوں اور سیمنٹ سے نہیں بنتے۔'' شہزاد نے عجیب لہجے میں کہا پھر عمیر کے اگلے سوال سے بچنے کے لیے جلدی سے سامنے اشارہ کیا۔ ''ارے وہ دیکھو...... کیا پیارا پل ہے۔''

پل واقعی پیارا تھا اور بڑی مناسب جگہ پر تھا۔ مناسب جگہ پر اس لیے کہ اس نے شہزاد کو عمیر کے اگلے کئی الٹے سیدھے سوالوں سے بچا لیا تھا...... وہ پل پر پہنچے۔ یہاں سے شہر کا دور دراز افتادہ وسطی حصہ نظر آتا تھا۔ اس حصے میں پیرس کا وہ علاقہ بھی شامل تھا جو نہایت بلند عمارتوں میں گھرا ہوا ہے۔ ایفل ٹاور...... کیسا تو نوٹرے ڈیم اور آزادی کے گیٹ کے آثار بھی یہاں سے دیکھے جا سکتے تھے۔ وہ پیرس میں آ کر بھی ابھی پیرس کی اصل گہما گہمی سے دور تھے۔ ان کی حالت اس دلہا کی سی تھی جو دلہن کو بیاہ کر گھر تو لا چکا ہو لیکن ابھی تک اس کی صورت دیکھنے سے محروم ہو۔ وہ دریائے سین کے پل پر گھومتے رہے۔ اردگرد کے صاف شفاف علاقے کو دیکھتے رہے۔ انہوں نے پیرس کی شام دیکھی تاہم پیرس ابھی شام تک جا نہیں سکے تھے۔ پیرس یا کہہ لیں کہ اصل پیرس ابھی ان سے کافی فاصلے پر تھا۔

ایک مقامی فرانسیسی نے انگلش میں انہیں بتایا کہ یہ علاقہ پیرس کے پوش علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ فرانسیسی صدر کی رہائش گاہ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔

شہزاد نے مسکراتے ہوئے لہجے میں فرانسیسی سے کہا۔ ''تو ٹھیک ہے جی پھر ہم ہوٹل واپس چلتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' فرانسیسی نے پوچھا۔

''ہمارے ہاں قول ہے کہ بادشاہوں کے قریب

رہنے میں ہمیشہ خطرات ہوتے ہیں۔"

فرانسیسی نے قہقہہ لگایا۔ "آپ نے اچھی بات کہی۔"

وہ دوبارہ پل پر سے گزرتے ہوئے واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئے۔ پیرس کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ اردگرد کی عمارتوں سے پھوٹنے والی کرنیں دریا کے پانی میں منعکس ہورہی تھیں۔ وہ ہوٹل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شہزاد کو ہرگز معلوم نہیں تھا کہ ہوٹل میں کیا حیرت ناک صورت حال پیش آنے والی ہے۔

قریباً ایک گھنٹا پیدل چل کر وہ واپس ہوٹل پہنچ گئے۔ وہ اپنے سوئٹ میں داخل ہوئے۔ سوئم نے ان کا استقبال کیا۔ وہ بظاہر بالکل نارمل ہی نظر آئی۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت چھپانے میں ہمیشہ کامیاب ہوجاتی تھی۔ شہزاد جانتا تھا کہ پچھلے دو گھنٹے میں وہ درجنوں بار گھڑی دیکھ چکی ہے اور درجنوں بار کھڑکی میں آکر ان کی واپسی کا انتظار کرچکی ہے۔

"عمیر جلدی سے ٹھنڈا پانی پلاؤ۔" شہزاد نے صوفے پر پھیلتے ہوئے کہا۔

"میں لاتی ہوں۔"

"نہیں، تم بیٹھو۔ میں تمہیں اپنی سیر کا حال سناتا ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں سفرنامہ...... یعنی دو گھنٹے کا سفرنامہ۔"

"جی......" وہ کچھ کھوئی کھوئی سی بولی۔ شال حسب معمول اس کی کمزور شانوں پر پھیلی ہوئی تھی اور تب پہلی بار شہزاد کو اندازہ ہوا کہ وہ معمول کے مطابق نہیں ہے۔ شہزاد نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ یہ آنکھیں جیسے کچھ چھپانا چاہ رہی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ بتانا بھی چاہ رہی تھیں۔ شہزاد نے ٹھٹک کر اردگرد نگاہ دوڑائی۔ بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق نظر آیا۔

"کیوں بھئی خیریت تو ہے؟" اس نے سوئم سے پوچھا۔

"ہاں جی۔" اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اور یہی وہ وقت تھا جب ایک دم بغلی دروازہ کھلا اور کئی افراد شور مچاتے ہوئے اندر آگئے۔ ان میں ایک مرد تھا، تین عورتیں اور ایک بچہ۔

"ویل کم ان دی ٹاؤن۔" زبردست شور سے کمرا گونج اٹھا تھا۔

پھر ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی تیزی سے آگے آئی اور اس نے شہزاد کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ شہزاد اور دونوں بچے ہکا بکا تھے۔ ایک خاتون نے بدحواس عمیر کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ لڑکی نے احسن کو بازوؤں میں اٹھالیا اور گول گول چکرانے لگی۔ تب شہزاد نے عمیر کو اپنے ساتھ لپٹانے

والی خاتون کو غور سے دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ شہزاد نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ شہزاد کے بڑے ماموں کی بڑی بیٹی فرزانہ تھی۔ باقیوں میں سے کسی کا چہرہ اس کے لیے شناسا نہیں تھا لیکن یہ بات تو اب عیاں تھی کہ یہ سب فرزانہ کے فیملی ممبران تھے۔ فرزانہ کی فیملی سے شہزاد کی فیملی کے تعلقات عرصۂ دراز سے ابتر چلے آرہے تھے۔ شہزاد کو معلوم تھا کہ فرزانہ اپنے میاں کے ساتھ یہیں کہیں ایسٹ پیرس میں مقیم ہے لیکن اس نے انہیں اپنی آمد کا بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا اور یہ عین ممکن تھا کہ پیرس میں دو ماہ رہنے کے باوجود وہ ان لوگوں سے ملے بغیر ہی واپس چلے جاتے لیکن جو کچھ آج ہوا یہ بالکل آناً فاناً تھا۔ ابھی انہیں پیرس میں لینڈ کیے بمشکل چھ سات گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ ان لوگوں سے یہ چونکا دینے والی ملاقات ہوگئی تھی۔

کچھ دیر بعد ویلکم کا ہلا گلا تھما تو سب لوگ ڈھنگ سے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ شہزاد اپنی ماموں زاد فرزانہ کو آج قریباً آٹھ سال بعد دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر بھی اڑتالیس کے قریب ہوچکی تھی تاہم جسم زیادہ موٹا نہیں ہوا تھا اور وہ اپنی عمر سے تین چار سال کم نظر آتی تھی۔ شہزاد کا تجربہ تھا کہ مغربی ملکوں کی بودوباش عموماً لوگوں کی صحت پر اچھا اثر ہی ڈالتی ہے بشرطیکہ...... وہ ماڈرن ازم کی دیگر خرافات سے محفوظ رہیں۔

فرزانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "شہزاد بھائی! آپ تو پیرس میں وارد ہوتے ہیں۔ آپ فرانس کے کسی دور دراز قصبے میں بھی ہوتے تو ہم پھر بھی آپ کو ڈھونڈ نکالتے۔"

"آپ لوگوں نے تو واقعی چکرا دیا۔" شہزاد کھسیانے انداز میں ہنسا۔ "لیکن آپ کو پتا کیسے چلا؟"

"جیمز بانڈ، دی سینٹ اور شرلاک ہومز کو مجرموں کا پتا کیسے چل جاتا ہے؟" فرزانہ کے ساتھ آنے والی تیس بتیس سالہ لڑکی نے بڑی ادا سے کہا اور سب قہقہہ مار کر ہنس دیے۔

شہزاد نے لڑکی کو دیکھا اور تھوڑا تھوڑا پہچان لیا۔ یہ فرزانہ کی بیٹی تھی۔ "تم زارا ہو نہیں؟" اس نے لڑکی کی طرف انگلی اٹھائی۔

"جی نہیں انکل۔ اب میں زارا ریحان ہوں۔" وہ فرانسیسی لہجے میں اردو بول رہی تھی۔ "یہ ہیں میرے ہاؤس بینڈ ریحان کاظمی۔"

شہزاد نے ایک بار پھر مسکراتے چہرے والے نوجوان سے ہاتھ ملایا۔ یقیناً وہ بھی پاکستانی تھا لیکن لب ولہجے اور اطوار سے اندازہ ہوتا تھا کہ طویل عرصے سے یہیں مقیم ہے۔

"اچھا، میں ایک ہی بار سب کا تعارف کرا دیتی ہوں

ہے۔" فرزانہ مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ "یہ تو ہوں میں، یعنی تمہاری ماموں زاد جس کے ہاتھوں تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو۔ یہ ہے میری بڑی بیٹی زارا۔ یہ ہیں اس کے شوہر ریحان کاظمی۔ انہوں نے یہاں ایم بی اے کیا ہے اور اب ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں جاب کرتے ہیں۔ یہ ان کا بے بی ہے حمدان۔ ایک نمبر کا شریر ہے۔"

"اپنی خالہ کی طرح۔" زارا نے انیس بیس سالہ لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک بار پھر سب ہنسے۔ فرزانہ نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "شاید اسے تم نے نہیں پہچانا۔ سات آٹھ سال پہلے یہ کافی چھوٹی تھی۔"

"اوہو، تو یہ آپ کی چھوٹی بیٹی ہے۔ کیا نام تھا اس کا......" شہزاد نے پیشانی مسلی۔

"عجنا۔" وہ خود ہی چہکی۔ "اور میرے نام کے ساتھ ابھی تک صرف پاپا جانی کا نام آتا ہے۔ میرا مطلب ہے ابھی کوئی ریحان، ذیشان، ارسلان وغیرہ نہیں۔" وہ کمال بے تکلفی سے بولی۔ یہ وہی چلبلی لڑکی تھی جس نے شہزاد کے گلے میں ہار ڈالا تھا۔

اب شہزاد نے پہلی بار پورے دھیان سے اس لڑکی کو دیکھا۔ اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے گہرے سیاہ تراشیدہ بالوں نے آگے کی طرف پھسل کر اس کا ایک تہائی چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ یہ بولتی اور مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ اگر اس کے باقی سارے چہرے کو چھپا بھی لیا جاتا اور صرف آنکھیں ہی دیکھی جاتیں تو کہا جاسکتا تھا کہ وہ بولنے اور مسکرانے کی طاقت رکھتی ہیں۔ ان آنکھوں نے جیسے ایک ہی جھٹکے سے شہزاد کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ شہزاد بظاہر تو وہیں بیٹھا رہا لیکن حقیقت میں اب وہ وہاں نہیں رہا، کہیں دور پہنچ گیا۔ ایک عجیب سے دھند لکے میں۔ اس دھند لکے میں سے بہت سے بھولے بسرے مناظر برق کی طرح کوند کوند کر اپنی جھلک دکھانے لگے اور غائب ہونے لگے۔

فرزانہ بول رہی تھی اور شاید زارا بھی بول رہی تھی لیکن اب ان کی آوازیں غیر غیر سی لگ رہی تھیں اور یہ آوازیں شہزاد کو جیسے کچھ فاصلے سے سنائی دے رہی تھیں۔ فرزانہ اپنی چھوٹی بیٹی عجنا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اصل جیمز بانڈ تو یہی ہے۔ ان فیکٹ اسی نے آپ لوگوں کا کھوج لگایا ہے اور پھر یہ کامیاب چھاپا بھی مارا ہے۔ اس کو اپنی کزن کوثی کی زبانی پتا چلا تھا کہ آپ لوگ پیرس

آرہے ہیں۔ بس اس کے دماغ میں یہ بات سماگئی کہ آپ سے ملنا ہے اور سرپرائز دینا ہے۔ دراصل پچھلے ایک مہینے سے اس کا رابطہ پاکستان میں کوثی سے تھا۔ کوثی کو آپ کے پروگرام کا پتا تھا پھر اس نے کسی طرح یہ بھی معلوم کرلیا کہ پیرس میں آپ کے ہوٹل کی بکنگ کون سی ہے۔ اس نے یہ اطلاع بذریعہ ای میل عجنا کو پہنچا دی اور یوں جناب سر منڈواتے ہی آپ لوگوں کے سر پر اولے یعنی ہم پڑ گئے۔"

"ممی! مجھے تو لگ رہا ہے کہ اصل مجرم فرار ہوگئے ہیں۔ ہم نے ڈمی لوگوں کو پکڑ لیا ہے۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔" عجنا چہکی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" فرزانہ نے مصنوعی غصے سے بیٹی پر آنکھیں نکالیں۔

"انکل شہزاد تو غالباً پروفیسر ہیں ناں پر یہ صاحب جو سامنے بیٹھے ہیں کسی طرف سے بھی پروفیسر نہیں لگ رہے۔" پھر وہ شہزاد کی بیوی سے مخاطب ہوئی۔ "آنٹی جی، آپ کو یقین ہے ناں کہ یہ آپ کے شوہر ہی ہیں؟"

ایک بار پھر زوردار قہقہہ پڑا۔ سوئم ہنستے ہوئے بولی۔ "تم نے تو مجھے بھی شک میں ڈال دیا ہے۔ اب تو رات ہوگئی ہے۔ سورج کی روشنی میں ذرا دھیان سے دیکھوں گی۔"

"تمہارے ذہن میں پروفیسر کا کیا Concept ہے بھئی؟" عجنا کی بڑی بہن زارا نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو پاکستانی پروفیسر ایک الجھے الجھے سفید بالوں اور ڈھلکے ہوئے کندھوں والا بندہ ہونا چاہیے جس نے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی ہو۔ تھوڑی سی توند بھی نظر آرہی ہو...... لیکن یہ تو بالکل الٹ دکھائی دیتے ہیں۔"

"یہ کیا دکھائی دیتے ہیں تمہیں؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے ٹی وی آرٹسٹ لگ رہے ہیں۔ آپ نے کسی ڈرامے میں بھی کام کیا ہے انکل جی؟"

اس کی ماں فرزانہ ہنس کر بولی۔ "اس کی باتوں کا برا منانا شہزاد۔ یہ بڑی اوٹ پٹانگ ہے۔"

"ماماں! آپ بالکل غلط کہہ رہی ہیں۔ میں اوٹ پٹانگ نہیں، میں صرف پٹانگ ہوں۔ اوٹ باجی ہیں۔ ہم دونوں اکیلے اکیلے کچھ بھی نہیں ہیں۔ ویسے آپ میری بات کو مذاق میں نہ ٹالیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے آپ کو کسی پاکستانی یا انگلش ٹی وی سیریل میں دیکھا ہے۔ ہاں ہاں یاد آیا۔ ایک انگلش سیریل میں ایک بڑے اسمارٹ سے جج صاحب تھے۔ ان کو اس سیریل میں اتنی دفعہ مائی لارڈ کہا گیا کہ ان کا نام ہی مائی لارڈ پڑ گیا تھا کہ ان کے فیملی ممبرز بھی ان کو مائی لارڈ ہی

کھینچنے لگے۔"

شہزاد نے کہا۔ "کیا تمہارے بولنے کی عام رفتار یہی ہے یا تم نے آج کوئی خاص گیئر لگایا ہوا ہے؟"

"اوہو! آپ تو شاید ناراض ہو گئے۔ اوکے، اب میں خاموش رہوں گی مائی لارڈ۔ عدالت کا وقت ضائع نہیں کروں گی۔" اس نے سہمنے کی اداکاری کی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ لی فرزانہ کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ ہائر اسکول میں آخری گریڈ کی اسٹوڈنٹ ہے اور عنقریب یونیورسٹی کا سکون تہ و بالا کرنے والی ہے۔

شہزاد نے ایک بار پھر اسے دھیان سے دیکھا۔ جسم میں پھر عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ اس کی آنکھیں حیران کن حد تک قابلِ توجہ تھیں۔ اس کے چلبلے جسم پر یہ بولتی ہوئی آنکھیں بالکل علیحدہ سے دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اچھے قد اور جسم کی تھی مگر جب پاؤں صوفے کے اوپر رکھ کر اور سمٹ کر بیٹھی تو ننھی منی نظر آنے لگی۔

شہزاد فرزانہ سے باتیں کرنے لگا اور وہ اسی طرح صوفے پر سمٹی سمٹائی بڑی عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے دیکھنے کا انداز الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ یہ الجھن اس سنسنی خیزی کے علاوہ تھی جو اس لڑکی کو دیکھ کر شہزاد کے رگ و پے میں جاگی تھی۔ شہزاد کو اپنی کیفیت کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ انجی اور عمیر اور احسن کے ساتھ اٹکھیلیوں میں مصروف ہو گئی۔ وہ دونوں بھی جیسے تھوڑی ہی دیر میں اس کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ بچے تو دل کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ وہ صرف حال کو دیکھتے ہیں۔ ماضی اور مستقبل ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ شہزاد کے بچوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں فیملیز میں کتنی دوریاں ہیں اور ماضی میں یہ دونوں گھرانے کس کس طرح ایک دوسرے سے دشمنی نبھاتے رہے ہیں۔

چھوٹا احسن اچانک حِنا کے ریشمی بالوں سے کلپ کھینچ کر بھاگ گیا۔ وہ "یو لٹل ڈیول" کہتی ہوئی اس کے پیچھے دوڑی۔

فرزانہ مسکرائی۔ "بچوں کے ساتھ بالکل بچہ بن جاتی ہے، پر جب کبھی سنجیدہ ہوتی ہے اور بڑوں میں بیٹھتی ہے تو بالکل اور طرح کی باتیں کرتی ہے۔ انگریزی میں بڑی اچھی اچھی نظمیں بھی لکھتی ہے۔"

اس کی بڑی بہن زارا مسکرائی۔ "اور ہمیں بڑی خوشی ہے کہ یہ انگریزی میں لکھتی ہے اگر یہ اردو شاعری کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جاتی تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے۔"

سب ہنسنے لگے۔

"اس کے پاپا کیا کرتے ہیں؟"

"اب صبر شکر کے علاوہ وہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ اس نے جتنا بگڑنا تھا بگڑ چکی ہے۔" زارا نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

"نہیں ان کا مطلب تھا کہ کام کیا کرتے ہیں؟"

شہزاد کی بیوی سونم نے ہنستے ہوئے وضاحت کی۔

"دو سال پہلے دل کی تکلیف ہوئی تھی۔ اب جاب تو چھوڑ دی ہے۔ دو کال شاپس خرید لی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں پارٹنر شپ ہے۔ اللہ کے فضل سے اچھی گزر بسر ہو رہی ہے۔" اچھی گزر بسر کہتے ہوئے فرزانہ کی گردن میں تھوڑا سا فاخرانہ تناؤ آگیا۔

شہزاد کے اردگرد باتیں ہو رہی تھیں اور وہ یہ ساری باتیں سن بھی رہا تھا۔ کبھی کبھی اس گفتگو میں حصہ بھی لے رہا تھا لیکن ان سب لوگوں میں موجود ہونے کے باوجود وہاں موجود نہیں تھا، وہ جیسے کہیں اور جا چکا تھا...... دور...... کہیں بہت پیچھے...... ماضی کے دھندلکوں میں۔ اس کے پردۂ تصور پر ایک فلم چلنے لگی تھی...... کچھ مناظر ترتیب وار ابھرنے اور معدوم ہونے لگے تھے۔

وہ بظاہر تو وینس میں ہوٹل لیونا کی چوتھی منزل پر اس سوئٹ نمبر 16 میں بیٹھا رہا مگر حقیقت میں 28 سال پیچھے چلا گیا۔

لاہور میں، نومبر کی ایک خوشگوار دوپہر تھی جب نیلے آسمان پر کبوتر اڑتے تھے اور رنگ برنگی پتنگیں فراٹے بھرتی تھیں۔ وہ اپنے ماموں جہانگیر کے گھر میں تھا۔ اپنی والدہ اور بہن عائشہ کے ساتھ وہ چار پانچ روز پہلے ہی بہاولپور سے یہاں پہنچا تھا۔ ان کا گھر بہاولپور کے ایک قریبی چک میں تھا۔ والد فرنیچر بنانے کا کام کرتے تھے۔ وہ اپنی دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور سب سے چھوٹا بھی۔ پڑھائی لکھائی کا شوق اسے بچپن سے تھا۔ ایک دور افتادہ اور پسماندہ علاقے میں رہنے اور غربت کے گھیرے میں ہونے کے باوجود اس نے اپنی بھرپور کوشش کی تھی اور ایف ایس سی کیا تھا لیکن حقیقت میں سائنس سے اس کی دلچسپی واجبی سی تھی۔ وہ آرٹس کا آدمی تھا۔ فوٹو گرافی اور ڈیزائننگ وغیرہ میں اسے خصوصی دلچسپی تھی۔ انہی دنوں اس کی ملاقات نیشنل کالج آف فائن آرٹس کے ایک استاد سے ہوئی اور انہوں نے شہزاد کو مشورہ دیا کہ وہ یہ لائن اختیار کرے۔

شہزاد کی فیملی کا لاہور میں آنا کم ہی ہوتا تھا۔ ویسے بھی شہزاد کی والدہ بڑی خوددار خاتون تھیں۔ کئی دفعہ نہایت مشکل

حالات کا شکار ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی اپنے خوش حال بھائیوں کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اب بھی وہ شہزاد کے اصرار پر یہاں آئی تھیں۔ شہزاد اپنی تعلیم کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نوکری کا خواہش مند بھی تھا تاکہ اپنے گھرانے پر معاشی بوجھ کم کر سکے اور یہ دونوں کام بہاولپور کے اس دور افتادہ چک میں رہ کر نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک لحاظ سے وہ یہاں مہرے کے لیے آیا ہوا تھا۔ اسے دو تین ہفتے رہ کر واپس چلے جانا تھا۔

ماموں جہانگیر کی رہائش گاہ مسلم ٹاؤن کے اچھے علاقے میں تھی۔ ان کا بینکوں کے فریم وغیرہ بنانے کا کارخانہ تھا۔ شہزاد کے چھوٹے ماموں بھی اس کاروبار میں بڑے ماموں کے ساتھ شریک تھے۔ سب سے چھوٹے ماموں کسی دفتر میں ملازمت کرتے تھے اور الگ تھلگ رہتے تھے۔

بڑے ماموں جہانگیر کی منجھلی بیٹی نجمہ بچپن سے ہی شہزاد کو اچھی لگتی تھی۔ دونوں گھرانوں میں میل ملاقات چونکہ بہت کم تھی اس لیے یہ پسندیدگی بس پسندیدگی ہی رہی تھی۔ نجمہ اپنی تین بہنوں میں شکل و صورت کے لحاظ سے سب سے اچھی تھی۔ وہ بہت خوبصورت نہیں تھی تاہم اس کے چہرے کی ملاحت اس کے لمبے گھنے بال اور آنکھوں کی چمک سب مل کر دیکھنے والوں کو متاثر کرتے تھے۔ اس مرتبہ شہزاد نے نجمہ کو قریباً ڈھائی سال بعد دیکھا تھا۔ وہ شہزاد کو ایک دم بہت بدلی ہوئی نظر آئی۔ اس کے بال پہلے سے لمبے اور گھنے ہو چکے تھے، آنکھوں کی چمک میں ایک خاص طرح کی گہرائی آگئی تھی۔ وہ ہنستے ہوئے پہلے بھی اچھی لگتی تھی لیکن اب اس کے چہرے پر ایسے رنگ بکھرتے تھے کہ نظر ہٹانا مشکل ہو جاتی تھی۔ اس کی عمر 20 سال کے قریب تھی جبکہ شہزاد 22 کا ہو چکا تھا۔ نومبر کی اس خوشگوار دوپہر میں وہ ماموں کے گھر کی چھت پر بیٹھا تھا اور نیلے آسمان پر سفید کبوتر رنگ برنگی پتنگوں کے ساتھ مل کر اڑانیں بھر رہے تھے۔ وہ چار پانچ کزن مل کر لوڈو کھیل رہے تھے۔ نجمہ بھی ان میں شامل تھی۔ چاروں کھلاڑی اپنی اپنی باری کھیل رہے تھے لیکن نجمہ کی ہمدردی غیر محسوس طور پر شہزاد کے ساتھ تھی۔ شہزاد ایک گوٹی چلنے لگا تو وہ چلائی۔

"نہیں...... نہیں وہ اس کو رہنے دیں شہزاد۔ یہ تو گھر کے پاس پہنچ چکی ہے۔ آگے آئیں گے تو یہ پٹ جائے گی۔"

فرزانہ تنک کر بولی۔ "یہ کیا بات ہوئی بھئی۔ تم خواہ مخواہ ہدایت کار کیوں بنی ہوئی ہو۔ اپنی اپنی گیم کھیلے۔"

نجمہ اور فرزانہ کے چھوٹے بھائی سکندر نے جل کر کہا۔

"جب بھی کھیلتے ہیں...... یہ ایک دوسرے کے پارٹنر بن جاتے ہیں۔ یہ تو فاؤل ہے۔"

"ہاں بھئی، پارٹنر بننا ہے تو پھر اطلاع دو۔ ہم بھی پارٹنر بنتے ہیں۔" نجمہ کی بہن گڈو نے کہا۔

"چلیں جی چلیں...... بس اب سے اپنی اپنی گیم۔" نجمہ نے معذرت کے انداز میں کہا اور کھیل پھر شروع ہو گیا۔

کچھ دیر بعد نجمہ کی ایک گوٹی شہزاد کے نشانے پر آ گئی۔ اس گوٹی کو پیٹ کر شہزاد کافی فائدے میں رہتا لیکن نجمہ بے چاری کا بڑا نقصان ہوتا۔ اس نے نجمہ کی گوٹی کو نظر انداز کر کے ایک دوسری گوٹی چلنا چاہی تو گڈو تنک کر بولی۔

"پھر بے ایمانی...... پھر بے ایمانی۔ نجمہ کی یہ گوٹی صاف پٹ رہی ہے۔ ہم آپ کو یہ دوسری گوٹی نہیں چلنے دیں گے۔"

"ہاں، ہاں نہیں چلنے دیں گے۔" سب نے ایک دم شور مچا دیا۔

شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھو دوستو! اپنا نفع نقصان تم مجھے خود دیکھنے دو۔ مجھے مناسب لگ رہا ہے کہ میں نجمہ کی گوٹی پیٹنے کے چکر میں نہ پڑوں۔"

"نہیں، یہ بالکل فاؤل پلے ہے۔" گڈو نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ نجمہ کی کزن گیمر کی تھی مگر ایسے معاملوں میں خم ٹھونک کر میدان میں آ جاتی تھی۔

شہزاد نے بہت کوشش کی کہ اسے نجمہ کی گوٹی نہ پیٹنی پڑے لیکن باقیوں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ مجبوراً شہزاد کو یہ ناپسندیدہ کام کرنا پڑا۔ تاہم تھوڑی ہی دیر بعد اس نے بڑی خاموشی سے ایک بار پھر نجمہ کی تلافی کر دی۔ کھیل کی گرما گرمی میں کسی کو پتا نہیں چل سکا۔ نجمہ کی ایک پکی پکائی گوٹی شہزاد کی زد میں آ رہی تھی مگر شہزاد نے نظر بچا کر دوسری گوٹی چلا دی۔ نجمہ اور شہزاد کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے ملیں۔ شہزاد کی اس چوری پر نجمہ کے چہرے پر خوبصورت رنگ بکھر گیا۔

کھیل کے دوران میں گوٹیاں چلاتے ہوئے اور ڈبی پکڑتے ہوئے کھلاڑیوں کی انگلیاں گاہے بگاہے ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ شہزاد کی انگلیاں بھی ٹکراتی تھیں لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ نجمہ کو چھونے سے ہمیشہ کتراتا تھا۔ اب بھی جب وہ لوڈو کھیل رہے تھے، شہزاد نجمہ کے ہاتھ سے دانے والی ڈبی پکڑتے ہوئے بہت محتاط رہتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کی انگلیاں نجمہ کے ہاتھ سے نہ چھوئیں اور اگر کسی وقت ایسا ہو جاتا تو اس کے جسم میں

برقی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا تھا؟ وہ اپنے اس ردِعمل کو کبھی بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

وہ بڑے خوشگوار دن تھے۔ گھر میں ہر وقت ہنسی مذاق رہتا تھا۔ کوٹھی کے گراسی لان پر مختلف کھیل ہوتے تھے تاہم شام کو ماموں جہانگیر کے گھر آتے ہی سب کو سانپ سونگھ جاتا تھا۔ وہ طبیعت کے سخت تھے، پیار بھی کرتے تھے لیکن ذرا سی بات پر بھڑک بھی اٹھتے تھے۔

انہی دنوں شب برات کا تہوار آ گیا۔ وہ یادگار تہوار تھا، چھٹیاں بھی تھیں۔ اس لیے کئی کزن جمع ہو گئے تھے۔ شہزاد کے یہ سارے چچیرے اور ممیرے بہن بھائی لاہور میں رہائش رکھتے تھے اور اس حوالے سے نسبتاً ماڈرن بھی تھے لیکن ان میں سے ایک دو کے سوا کوئی بھی تعلیم میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکا تھا حتیٰ کہ ماموں جہانگیر کے بچوں میں سے بھی کوئی گریجویٹ نہیں تھا۔ نجمہ بھی ان میں شامل تھی۔ اس نے ایف اے کیا تھا تاہم اپنے رکھ رکھاؤ اور اسٹائل سے وہ نسبتاً زیادہ پڑھی لکھی نظر آتی تھی۔ شہزاد بے شک ایک چھوٹے قصبے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اپنے اچھے تعلیمی کیریئر کے سبب اس نے کبھی بھی اپنے ان ماڈرن کزنز کے درمیان کسی طرح کا احساسِ کمتری محسوس نہیں کیا تھا۔ تعلیمی قابلیت کے علاوہ وہ شکل وصورت میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ لمبا قد، سرخ وسپید رنگت، ستواں ناک وہ خوش لباس بھی تھا۔ کبھی کبھی جب سن گلاسز لگاتا تو ایک دم بہت دلکش نظر آنے لگتا تھا۔

سب لڑکے لڑکیوں نے شب برات کو بڑے اچھے طریقے سے منانے کا پروگرام بنایا۔ بڑے اور منجھلے ماموں سے اس کی باقاعدہ اجازت لی گئی۔ شہزاد کے منجھلے ماموں بھی اسی گھر میں رہتے تھے۔ یہ کافی وسیع عمارت تھی۔ بالائی پورشن ان کے استعمال میں تھا۔ شب برات کے روز خرید اور پکوان پکائے گئے، سب نے زرق برق کپڑے پہنے، ہوائیاں چھوڑنے، انار اور پٹاخے وغیرہ چلانے کے لیے گھر کی چھت مخصوص کی گئی۔ جب سارے آتش بازی میں مصروف تھے اور چھت پر ہر طرف دھواں اور پٹاخوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ نجمہ چھت کے دوسرے حصے میں موم بتیاں روشن کرنے میں مصروف تھی، وہ رنگ برنگی موم بتیاں جلا کر چھت کی منڈیر پر ایستادہ کرتی جا رہی تھی۔ اس کی بولتی آنکھوں میں ان شمعوں کی روشنی منعکس ہوتی تھی تو لگتا تھا کہ آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے ہیں۔ شہزاد خاموشی سے اس کے پاس جا کر کھڑا ہوا اور موم بتیاں روشن کرنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

"تمہیں آتش بازی اچھی نہیں لگتی؟" شہزاد نے پوچھا۔

"نہیں شہزاد بھائی، یہ خطرناک کام ہے اور آپ کو؟"

"مجھے بھی نہیں لگتی۔"

"لیکن آپ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوائیاں چھوڑ رہے تھے۔"

"وہ تو بس ان سب کا ساتھ دے رہا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے یہ سب مجھے پینڈو وغیرہ کا خطاب دینے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ اگر میں کسی کام میں پیچھے رہ جاؤں تو فوراً طعنہ بازی شروع ہو جاتی ہے۔"

"ایسی باتوں کی پروا نہ کیا کریں۔ خوشبو کاغذ کے پھولوں سے نہیں آیا کرتی۔ انسان جو ہوتا ہے وہ نظر آتا ہے۔"

"میں تمہیں کیا نظر آتا ہوں۔" شہزاد نے کہا۔

نجمہ نے ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"تم مجھے مستقبل میں کیا دیکھ رہی ہو؟"

"ایک دم کامیاب...... اور کسی اعلیٰ مقام پر، اپنی پڑھائی اور اپنے کام سے آپ کی جو لگن ہے وہ آپ کو ضرور اونچا لے جائے گی۔ یہ وقتی دشواریاں بہت جلد ختم ہو جائیں گی۔"

گھروں کی منڈیروں پر دور تک شمعیں روشن تھیں۔ شہزاد کو لگا کہ یہ ساری امید کی شمعیں ہیں، ایک دم یہ شمعیں شہزاد کو زیادہ روشن لگنے لگیں۔ شاید اس لیے کہ ان کی روشنی میں نجمہ کی نیک تمنائیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔

اسی دوران میں اچانک ہی چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ برساتی کی طرف سے آگ کے شعلے نظر آئے۔ دراصل ایک بڑی ہوائی اوپر جانے کے بجائے افقی رخ پر چلی گئی تھی اور سیدھی برساتی میں گھس گئی تھی۔ یہاں شہزاد کی چھوٹی ممانی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ ان کے پاس ہی لحاف وغیرہ پڑے تھے اور مٹی کے تیل کا چولہا بھی رکھا تھا۔ ہوائی برساتی میں گھسی تو یکایک ہی برساتی کی اشیا نے آگ پکڑ لی۔ ان میں ممانی بھی تھیں، وہ خیر سے کافی موٹی تھیں، ان کے چارپائی سے اٹھتے اٹھتے ہی آگ نے انہیں لپیٹ میں لے لیا۔

یہ بڑے پُرخطر لمحات تھے۔ چند سیکنڈ کے لیے سب ہی ٹھٹک کر رہ گئے۔ یہی وقت تھا جب شہزاد لپکا ہوا برساتی کی طرف گیا۔ ممانی کی موٹی شال نے آگ پکڑ لی تھی اور وہ چارپائی سے اٹھنے کی کوشش میں فرش پر گر گئی تھیں۔ شہزاد نے

جلتے ممانی کی شال کھینچ کر ان کے جسم سے علیحدہ کی پھر انہیں گھسیٹ کر باہر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ ان لمحوں میں نجمہ کے بڑے بھائی ولید نے بھی دلیری کا ثبوت دیا اور جلتی ہوئی برساتی میں گھس آیا۔ انہوں نے مل کر ممانی کو باہر نکالا پھر باقی لوگ بھی حرکت میں آ گئے۔ پانی وغیرہ پھینک کر برساتی کی آگ پر قابو پا لیا گیا۔ ممانی کلثوم کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ موٹے کپڑوں کی وجہ سے وہ بچ گئی تھیں تاہم انہیں باہر نکالنے کی کوشش میں شہزاد اور ولید کو زخم آئے تھے۔ شہزاد کا ایک بازو جل گیا تھا اور ولید کے ہاتھ بھی متاثر ہوئے تھے۔

ممانی جو کچھ دیر پہلے تک برساتی میں بیٹھی بڑے شوق سے آتش بازی دیکھ رہی تھیں...... اب آتش بازی کو اور آتش بازی کرنے والوں کو صلواتیں سنا رہی تھیں۔ ان کی یہ کایا پلٹ اتنی تیزی سے ہوئی تھی کہ سنگین صورت حال کے باوجود سارے لڑکے لڑکیاں چپکے چپکے مسکرانے لگے۔ ممانی کا خیال یہ بھی تھا کہ کسی بچے نے جان بوجھ کر ہوائی ان کی طرف چھوڑی ہے۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ نجمہ کہیں سے ایک اسپورٹنگ مرہم لے آئی۔ یہ جلے پر لگانے کے لیے تھا۔ "اپنی آستین اوپر کر دیں شہزاد بھائی۔ میں آپ کو یہ آئنٹمنٹ لگا دوں۔" وہ کمرے میں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

شہزاد نے آستین اوپر کی۔ وہ بڑی محویت سے مرہم لگانے میں مصروف ہو گئی۔ اس کی انگلیوں کے لمس نے شہزاد کے رگ وپے میں پھر برقی لہریں دوڑا دیں۔ نجمہ کے لمبے ریشمی بال پھسل کر آگے آ گئے تھے کیونکہ وہ شہزاد کے بازو پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے یہ بال شہزاد کے دوسرے ہاتھ سے مس کرنے لگے۔ وہ اسے پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ساری ہمدردی مجھ پر ہی نچھاور نہ کر دو۔ ولید بھائی کا بھی تو ہاتھ جلا ہے۔"

"ان کو فرزانہ باجی نے لگا دی ہے اور ویسے بھی وہ تو گھر کے آدمی ہیں۔ ان کی خدمت میں کسر رہ جائے تو کوئی بات نہیں۔ آپ مہمان ہیں، کچھ دنوں میں چلے جائیں گے۔ آپ نے کوئی بات محسوس کر لی تو ہم سوچتے ہی رہ جائیں گے۔"

"بڑا خیال ہے میرا۔"

"آپ کے اندازے سے بھی زیادہ، پھپھو سے پوچھیں۔ پچھلی مرتبہ جب آپ ان کے ساتھ نہیں آئے تھے تو میں نے کتنی دفعہ ان سے آپ کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"کیا پوچھا تھا؟"

"بس یہی کہ آپ کیوں نہیں آئے؟ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔ آپ کتنے لمبے ہو گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

"تو بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی باتیں تھیں۔"

"تو پھر کیا پوچھتی؟" اس کی ساری توجہ شہزاد کے بازو کی طرف تھی۔

شہزاد چند لمحے مسکراتا رہا پھر ذرا شوخ لہجے میں بولا۔ "یہ پوچھنا تھا کہ اس کی شادی وادی کب کر رہی ہیں، اس کے لیے کوئی لڑکی پسند کی یا نہیں؟ اور نہیں کی تو کیوں؟ وغیرہ وغیرہ۔"

وہ ایک دم ہنسی اور اس کے گالوں سے دانت دمک اٹھے۔ وہ اپنے گھنے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے بولی۔ "یہ سوال پھپھو کے بجائے متعلقہ بندے سے بھی تو کیے جا سکتے ہیں۔"

شہزاد نے کچھ کہنا چاہا مگر ہمیشہ کی طرح آواز اس کے ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے کہیں گم ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے کان تپ اٹھے ہیں۔

"ہاں جی، متعلقہ بندہ خاموش کیوں ہو گیا؟" وہ بدستور شوخ انداز میں بولی۔

شہزاد نے ہمت کر کے کہا۔ "متعلقہ بندے کے لیے اس سوال کا جواب ذرا مشکل ہے۔"

"اچھا رہنے دیں۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ مہمانوں کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہیے۔" اس نے بڑی ادا سے موضوع بدلا اور بولی۔ "مرہم سے جلن تو نہیں ہو رہی؟"

"تھوڑی تھوڑی ہو رہی ہے۔"

"ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے کہا اور ہولے ہولے بازو پر پھونکیں مارنے لگی۔ اس کا ہاتھ نجمہ کے ہاتھ میں تھا اور یہ لمس اس کو بے حال کر رہا تھا۔

اسی دوران میں ماموں جہانگیر وارد ہو گئے۔ ساتھ والے کمرے سے ان کی رعب دار آواز آئی۔

"نجمہ......!"

شہزاد نے جلدی سے اپنا ہاتھ نجمہ کے ہاتھ سے علیحدہ کر لیا۔ نجمہ بھی ذرا ٹھٹک گئی۔ "یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" وہ ذرا غصے سے بولے۔ "جاؤ وہاں تمہاری ماں بلا رہی ہے تمہیں۔ ابھی تک آٹا بھی نہیں گوندھا ہے کسی نے۔"

"اچھا ابا جی۔" نجمہ نے کہا اور جلدی سے دوپٹا درست کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ماموں نے شہزاد پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی۔ ماتھے پر

ٹل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کیا بنا ہے تمہارے داخلے کا؟''

''کوشش کر رہا ہوں ماموں۔ دو چار دن میں پتا چل جائے گا۔''

''میں نے پہلے بھی پوچھا تھا تم نے کہا تھا، دو چار دن میں پتا چل جائے گا۔ شہروں کی زندگی بڑی تیز ہوتی ہے بھئی۔ اس کے ساتھ تیزی سے چلنا پڑتا ہے بلکہ بھاگنا پڑتا ہے اور میں تو ویسے بھی یہی کہوں گا تم سے کہ دیں بہاولپور یا ملتان وغیرہ میں تمہارا کام بن جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ ملتان بھی سنا ہے کافی اچھا شہر ہے۔''

''لیکن لاہور سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے ماموں۔''

''چلو، جیسے بھی تم بہتر سمجھو۔'' ماموں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور باہر چلے گئے۔

اگلے آٹھ دس روز بھی شہزاد کے لیے یادگار رہے۔ نجمہ اس کے اردگرد موجود تھی اور وہ اسے ہمیشہ سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ روز نت نئے پروگرام بنتے تھے، شرارتیں ہوتی تھیں، کبھی پکنک، کبھی کیرم، کبھی لوڈو، کبھی باہر کھانے کا پروگرام۔ شہزاد کی سنجیدگی کی وجہ سے چنڈال چوکڑی کے دیگر ارکان اسے مزاحیہ انداز میں حضرت جی کا خطاب دیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی طنزیہ فقرہ بھی اس پر چسپاں کر دیا کرتے تھے لیکن وہ ان باتوں کا برا نہیں مانتا تھا۔ وہ بڑے دل کا مالک تھا۔ ان آٹھ دس دنوں میں اس نے غیر محسوس طور پر نجمہ کے ساتھ ایک عجیب سے تعلق کو پروان چڑھتے محسوس کیا۔ اب پتا نہیں تھا کہ نجمہ بھی اس تعلق کو محسوس کر رہی ہے یا نہیں۔

واپسی سے دو دن پہلے کی بات ہے۔ شہزاد نے نجمہ کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔

''دومنٹ کے لیے کمرے میں آؤ گی، تم سے ایک ضروری بات پوچھنی ہے؟''

''یہ کپڑے چھت پر ڈال کر ابھی آئی شہزاد بھائی۔'' وہ بے تکلفی سے بولی اور الھڑ انداز میں سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ شہزاد اپنے کمرے میں اس کا انتظار کرنے لگا لیکن جب وہ چھت سے واپس آئی تو اس کی قریبی سہیلی گڈو آ دھمکی۔ اس نے نجمہ کو ایسا گھیرا کہ شہزاد دو گھنٹے تک انتظار کی سولی پر لٹکا رہا۔ گڈو جب بھی آتی تھی ایسے ہی لسوڑے کی لیس بن جاتی تھی۔ جانے کا نام نہیں لیتی تھی اور نجمہ کے ساتھ تو اس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ وہ دونوں گہری سہیلیاں تھیں۔ گڈو کا گھر اسی لین میں بس ایک گھر چھوڑ کر تھا۔ وہ اپنی اپنی چھتوں سے بھی ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی تو شہزاد کو نجمہ کی اس آفت جان دوست سے رقابت محسوس ہونے لگتی تھی۔ سب سے چھوٹے ماموں کی بیٹی فاخرہ کو بھی گڈو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی حالانکہ فاخرہ کی ہر کسی کے ساتھ دوستی تھی۔ (فاخرہ بچپن میں ایک حادثے کی وجہ سے جسمانی معذوری کا شکار ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود سب کے ساتھ مل جل کر رہتی تھی) اس روز خدا خدا کر کے گڈو واپس اپنے گھر گئی اور نجمہ اپنے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھتی ہوئی شہزاد کے کمرے میں آ گئی۔

''جی جناب! کیا پوچھنا تھا آپ نے؟'' وہ میٹھے لہجے میں بولی۔

''پوچھنا تو کچھ اور تھا لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ گڈو جو ہے اس کا کوئی قرض وغیرہ تو نہیں دینا تمہیں؟''

''ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' وہ مسکرائی۔

''بھئی ایسے تو پٹھان قرض خواہ اپنے قرض داروں کو چمٹتے ہیں۔ یہ تمہیں صرف ہیلو کہنے کے لیے بھی آئے تو ایک گھنٹے سے پہلے جان نہیں چھوڑتی۔''

''لیکن یہ یک طرفہ ٹریفک نہیں ہے۔ میں بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں۔ ایک ہی تو سہیلی ہے میری۔'' اس نے ادا سے کہا۔

''بڑی خوش قسمت ہے۔'' شہزاد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ چونک کر شہزاد کی طرف دیکھنے لگی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اچھا جی، کیا پوچھنا تھا آپ جناب نے؟''

''جو پوچھنا وہ پوچھنا کچھ نہیں تھا۔ بس شکریہ ادا کرنا تھا تمہارا۔''

''آ گئیں آپ۔ کس بات کا شکر...؟''

''تم سب نے اور خاص طور سے تم نے اتنا خیال جو رکھا ہے میرا اور امی جی کا۔''

''وہ آپ کی امی ہیں تو میری بھی پھوپھی ہیں اور آج آپ یہ غیروں والی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ آپ اپنے ہیں اور اپنے شکریہ ادا نہیں کرتے۔''

''اپنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' شہزاد نے جرأت کر کے اس کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھا۔

وہ گڑبڑا گئی۔ بات بدل کر بولی۔ ''آپ نے الماری دیکھی ہے اپنی؟ یہ دیکھیں۔'' اس نے الماری کے پٹ کھول دیے۔

الماری میں شہزاد کے سارے کپڑے استری شدہ

حالت میں ہینگرز پر لٹک رہے تھے۔ انہیں اتنی محبت سے استری کیا گیا تھا کہ لگتا تھا ڈرائی کلین ہو کر آئے ہیں۔ شہزاد کے رومال، ٹائی اور جرابیں وغیرہ سب کچھ دھلا دھلایا الماری میں موجود تھا۔ اس نے اپنے رخسار سے بالوں کی ریشمی لٹ ہٹا کر تعریف طلب نظروں سے شہزاد کو دیکھا۔

شہزاد نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''اب پھر شکریہ ادا کروں گا تو تم اپنے پن کی بات کرو گی۔ بہتر ہے کہ پہلے میرے سوال کا جواب دے دو۔ اپنے پن سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

اس کے چہرے پر رنگ لہرائے۔ چور نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے دیوار سے ٹیک لگائی اور بولی۔ ''میں آپ کے سوال کا جواب تب دوں گی جب آپ میرے سوال کا جواب دیں گے۔''

''کون سا سوال؟'' شہزاد کی دھڑکنیں زیروزبر ہو رہی تھیں۔

''وہی اس دن والا۔ متعلقہ بندے نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اس کے لیے کوئی لڑکی وغیرہ پسند ہوئی ہے یا نہیں...... یا اس کو خود کوئی پسند آئی ہے یا نہیں۔'' نجمہ کی بولتی آنکھوں میں عجیب سی حیا آمیز شوخی تھی۔ دیوار کے ساتھ لگا ہوا اس کا جسم اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ایک خوش رنگ تصویر کے مانند نظر آ رہا تھا۔ وہ بے دھیانی میں اپنی ایک طویل لٹ کو شہادت کی انگلی کے گرد بل دیتی چلی جا رہی تھی۔

شہزاد کا جی چاہا کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے کہہ ڈالے مگر اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی گونج میں اس کی بات کے دب جانے کا خدشہ تھا۔ اس نے کہا۔ ''اچھا...... کل شام کو بتاؤں گا جانے سے پہلے۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔

''کل شام کو دومنٹ کے لیے یہاں کمرے میں آؤ گی نا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسی دوران میں اس کے منجھلے بھائی شارق کی گونج دار آواز آئی۔ ''نجمہ کہاں ہو؟''

''آئی بھائی۔'' وہ ٹھٹک کر بولی اور جلدی سے باہر چلی گئی۔ ماموں جہانگیر کی طرح ان کے منجھلے بیٹے شارق کا بھی گھر میں کافی رعب داب تھا۔ شارق غیر معمولی حد تک سنجیدہ شخص تھا۔ گھر میں جو بھی ہلا گلا ہوتا تھا اور محفلیں جمتی تھیں، شارق ان سے کافی فاصلے پر رہتا تھا۔

اس روز نجمہ سے ملنے کے بعد شہزاد نے محسوس کیا کہ اس کے سینے میں جو دھیمی دھیمی آگ جل رہی ہے، اس کی حدت دوسری طرف بھی محسوس کی جا رہی ہے۔ ایک بے نام کشش تھی جو ان دونوں کو ایک دوسرے سے باندھ رہی تھی۔ ہاں یہ بات تھی کہ ابھی تک اقرار کا مرحلہ طے نہیں ہوا تھا۔

اس رات شہزاد نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ براہ راست نجمہ سے بات نہیں کر سکے گا۔ آخر اس نے وہی ذریعہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، جو محبت کی آگ میں جلنے والے لوگ مدتوں سے کرتے آئے ہیں۔ نامہ و پیام...... جس میں مدعا بھی بیان ہو جاتا ہے اور روبرو ہونے کی زحمت بھی نہیں اٹھانا پڑتی۔ ان دنوں موبائل وغیرہ کا تو رواج نہیں تھا۔ ٹیلی فون بھی خال خال ہی ہوتے تھے۔ شہزاد نے دھڑکتے دل کے ساتھ نجمہ کے لیے ایک چھوٹا سا خط لکھا۔ یہ پانچ چھ سطروں کا ''اظہار محبت'' تھا۔

پروگرام کے مطابق شام کے وقت نجمہ کو اس کے کمرے میں آنا تھا۔ شہزاد کو بہت اچھا لگ رہا تھا کہ وہ اس سے زبانی کچھ کہنے کے بجائے یہ خط اس کے ہاتھ میں تھما دے گا...... لیکن شام کو جو کچھ ہوا وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ شہزاد کی ممانی کلثوم کی بڑی بیٹی امید سے تھی۔ کسی بھی وقت کوئی خوشخبری آ سکتی تھی، یہ خوشخبری اس شام کو ہی ''تشریف'' لے آئی جب شہزاد وغیرہ کو یہاں سے واپس جانا تھا۔ بچے کی اطلاع کے ساتھ ہی اردگرد کے رشتے دار یلغار کر کے گھر میں آ گئے۔ ان میں زیادہ تر بچے کے ددھیالی تھے۔ شام سات بجے تک گھر کا نقشہ وہی ہو گیا جو شادی والے گھر کا ہوتا ہے۔ اب کہاں کی تنہائی اور کہاں کی ملاقات۔ شہزاد والے کمرے میں بھی بچوں نے اودھم مچایا ہوا تھا۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے بار بار صحن اور برآمدے کی طرف دیکھتا تھا کہ شاید نجمہ چند سیکنڈ کا وقت نکال کر اس کی طرف آ جائے لیکن وہ بری طرح مہمانوں اور کزنز میں گھری ہوئی تھی۔

ایک بار اس نے کوشش بھی کی۔ وہ مٹھائی والا ڈبا لیے شہزاد کے کمرے کی طرف آئی تاہم راستے میں ہی کوئی درجن بھر بچوں نے اسے گھیر لیا پھر اسی دوران میں شہزاد کی امی اور بڑی ممانی بھی الوداعی گفتگو کرتی ہوئی شہزاد والے کمرے میں آ گئیں۔

شہزاد سٹپٹا گیا۔ اس کے سٹپٹائے ہوئے چہرے کو نجمہ نے ذرا شوخ نظروں سے دیکھا اور دوسری طرف چلی گئی۔

شہزاد وغیرہ کی ٹرین کا وقت نو بجے تھا۔ ضروری تھا کہ وہ آٹھ بجے تک گھر سے نکل جائیں۔ شہزاد کا ماموں زاد سکندر انہیں اپنی گاڑی پر اسٹیشن چھوڑنے جا رہا تھا۔ انہیں

[illegible] کے لیے پارٹی کے اندر کئی افراد جمع ہو گئے تھے۔ ان میں نجمہ بھی تھی۔ آخری لمحوں میں ایک بار پھر ان دونوں کی نگاہیں ملیں تو ان بولتی ہوئی آنکھوں نے جیسے شہزاد کو تسلی دی...... تم کچھ کہہ نہیں سکے ہو۔ لیکن جو تم کہنا چاہتے تھے وہ بغیر کہے مجھ تک پہنچ گیا ہے۔ ہم دعاؤں میں ایک دوسرے کو یاد رکھیں گے اور ایک دوسرے کا انتظار کریں گے۔

☆☆☆

قریباً پانچ مہینے اسی طرح گزر گئے۔ گرمیوں کے آغاز میں شہزاد اور اس کی فیملی کو پھر بہاولپور سے لاہور آنا پڑا۔ اس مرتبہ وہ لوگ مستقل طور پر لاہور شفٹ ہو گئے تھے۔ شہزاد، اس کی والدہ اور بہن کے علاوہ والد صاحب بھی آ گئے تھے۔ والد صاحب نے وہاں بہاولپور میں فرنیچر کا کارخانہ بند کر کے لاہور میں ایک چھوٹی سی دکان اور چند سو روپے ماہوار پر کرائے کا ایک مکان لے لیا۔ شہزاد کو لاہور کے فائن آرٹس کالج میں داخل کیا گیا تھا۔ اس داخلے کے لیے مطلوبہ کوالیفکیشن ایف ایس سی تھی لیکن اس نے بی ایس سی کیا ہوا تھا۔ اس نے پینٹنگ ڈیزائننگ کا شعبہ پسند کیا تھا۔ یہ چار سالہ ڈپلوما تھا۔ تاہم اس ڈپلومے سے کہیں زیادہ خوشی شہزاد کو اس بات کی تھی کہ وہ لاہور کی وسیع و عریض لائبریریوں میں غوطہ زن ہو سکتا تھا اور اپنے مطلب کے مواد تک اس کی رسائی بآسانی ہو سکتی تھی۔

شہزاد کا گھر ماموں جہانگیر کے گھر سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ تاہم یہ تین چار کلومیٹر اسے تین چار قدم لگا کرتے۔ وجہ یقیناً نجمہ ہی تھی۔ وہ کوئی بھی بہانہ بنا کر اسپورٹس بائیک پر جانے کہیں رہتا تھا اور مقناطیس کی طرح ماموں کے گھر کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا۔ نجمہ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے ڈھیروں باتیں کرتے تھے مگر ابھی تک اظہار اور اقرار کا مرحلہ طے نہیں ہوا تھا۔ (نجمہ ان دنوں پرائیویٹ بی اے کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی)

وہ بہار کی ایک سہانی شام تھی۔ وہی موسم جب دل میں کلیاں چٹکتی ہیں اور منہ زور جذبے مصلحتوں کے دبیز پردے چاک کر کے نمودار ہوتے ہیں۔ وہ سب لوگ جناح گارڈن کی سیر کو گئے تھے۔ دراصل منجھلے ماموں کا بیٹا سجاد تین سال بعد کویت سے آیا تھا۔ وہاں وہ ایک شیخ کے ساتھ مل کر الیکٹرک اسٹور چلاتا تھا۔ یہ پارٹی اس کے اعزاز میں دی جا رہی تھی۔ وہ ماموں ممانی کا لاڈلا بیٹا تھا۔ بہت دیر تک ہلا گلا کرنے کے بعد سب لوگ ٹولیوں کی شکل میں گھومنے پھرنے نکل گئے۔ شہزاد تھکا ہوا تھا، وہ وہیں سامان کے پاس بیٹھا رہا۔ فرانزسٹر ریڈیو پر ایک دلگداز نغمہ چل رہا تھا۔ ”بے کل رات گزاری، بے چین دن گزارا، نجانے کس آس پر ہم نے تمہیں پکارا۔“

موسیقی کی لہروں پر بہتے بہتے شہزاد اونگھنے لگا۔ پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ ناک میں ہونے والی سرسراہٹ کے سبب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نجمہ اس کے سامنے دری پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اس کی انگلیوں میں گھاس کا تنکا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ باغ میں لائٹس روشن ہو رہی تھیں تاہم وہ جس جگہ بیٹھے تھے وہاں نیم تاریکی سی تھی۔

”تم واپس کیوں آ گئیں؟“ شہزاد نے پوچھا۔

”نئی جوتی ہے، بری طرح کاٹنے لگی ہے۔“ نجمہ نے اپنی گلابی ایڑی شہزاد کو دکھائی۔ ایک طرف سے ایڑی بالکل سرخ ہو رہی تھی۔

شہزاد کا دل بجھ سا گیا۔ چند لمحوں کے لیے اس کے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ شاید نجمہ کے واپس آنے کی کوئی اور وجہ ہو۔ یہاں تو ایک نہایت معقول جواز موجود تھا۔

”کس سوچ میں پڑ گئے ہیں؟“ وہ مسکرائی۔

”سوچ رہا ہوں، وہ سوال ابھی تک تمہارے ذہن میں اٹکا ہو گا جس کا جواب میں نے تمہیں پچھلی دفعہ دینا تھا۔“

”جی نہیں، بالکل نہیں اٹکا ہوا۔ میں وہ بھول چکی ہوں۔“

”لیکن میں تو نہیں بھولا۔“

”اگر بھولے نہ ہوتے تو پھر جواب دے دیتے۔“

”تم جانتی ہو کہ مناسب وقت ہی نہیں ملا۔“

”ہائے اللہ وہ کیسا مناسب وقت ہو گا، کیا اس مناسب وقت کے لیے کوئی مہورت وغیرہ نکلوانا پڑے گی۔“ وہ زور سے ہنسی اور اس کے ریشمی بالوں نے پھسل کر ایک طرف سے اس کا چہرہ ڈھانپ لیا۔

شہزاد نے گہری سانس لی اور اپنے اعصاب کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”اچھا چلو بتا دیتا ہوں۔“

”فرمائیے۔“ وہ بولی۔

”فرماؤں گا نہیں، لکھوں گا۔“

”تو لکھیے۔“ اس کی آواز میں ہلکی سی جذباتی لرزش تھی۔

دری پر ایک طرف موتیے کے بہت سے پھول پڑے تھے۔ شہزاد نے ان پھولوں کو گھاس پر ترتیب سے اس طرح ساتھ ساتھ رکھا کہ NAJMA لکھا گیا۔ ایسا کرتے

ہوئے اس نے خیال رکھا تھا کہ نجمہ دیکھ نہ پائے۔ وہ نجمہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے پوچھا تھا کہ میں نے شادی کے لیے کوئی لڑکی پسند کی ہے یا نہیں؟ اور کی ہے تو کون ہے؟ اس کا جواب میں نے لکھ دیا ہے۔“

”دکھائیں۔“ اس کے لہجے میں حیا آمیز گھبراہٹ تھی۔

شہزاد نے تھوڑا سا پیچھے کھسک کر نجمہ کو گھاس پر ترتیب سے رکھے ہوئے پھول دیکھنے دیے۔

وہ گم صم سی ہو گئی۔ شہزاد نے ہمت کر کے اس کا چہرہ دیکھا۔ نیم تاریکی میں اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر شفق کے رنگ تھے جو تیرگی میں گھل مل گئے تھے۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی۔ اس کی خاموشی ایک بہت وزنی بوجھ کی طرح شہزاد کو چبھنے لگی۔

”کوئی جواب نہیں دو گی؟“ شہزاد نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

”کیا جواب دوں؟“ اس نے گہری سانس لی۔ آواز میں وہ لرزش بدستور موجود تھی جو جذبات کو ابھارتی تھی اور حوصلے کو بڑھاتی تھی۔

”کچھ بھی دو۔“

”میں بھی لکھ کر دوں گی۔“ وہ ایک دم سنجیدگی میں سے ابھری اور شوخ لہجے میں بولی۔

”اچھا لکھ کر ہی دو۔“

”آپ کو..... اسی طرح بیٹھے رہنا ہے۔ مڑ کر نہیں دیکھنا۔“

”کیا مطلب؟“

”بس کہا ہے ناں، اسی طرح بیٹھے رہیں۔“

وہ اٹھلا کر کھڑی ہوئی اور شہزاد کے عقب میں آ گئی۔ اس نے اپنی انگلی شہزاد کی کمر پر رکھی اور انگلی کے لمس سے شہزاد کو کھو دیا۔

شہزاد کے رگ و پے میں مسرت و انبساط کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس نے مڑ کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن وہ الٹے قدموں چلتی ہوئی پیچھے جا چکی تھی۔ نیم تاریکی کے باوجود اس کے چہرے پر شفق کے شوخ رنگ دکھائی دیتے تھے پھر وہ تاریکی میں اوجھل ہو گئی۔

اس اظہار محبت کے بعد دونوں میں جھجک سی پیدا ہو گئی۔ اب وہ سب کے سامنے بہت کھل کر بات نہیں کرتے تھے اور کسی نے اس تبدیلی کو شاید محسوس کیا یا نہیں مگر نجمہ کی بیسٹ فرینڈ گلدو نے ضرور کر لیا۔ اس نے نجمہ سے استفسار کیا اور نجمہ نے اسے سب کچھ بتا بھی دیا۔ اب ایک طرح سے گلدو ان دونوں کی رازدار بھی بن گئی۔

چھوٹے ماموں طفیل کا نے پالک بیٹا سجاد کویت سے مستقل طور پر واپس آ گیا تھا۔ اب وہ یہاں بجلی کے سامان کی شاپ کھولنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے ایف اے پاس کیا ہوا تھا یا شاید ”ایف اے“ نے اسے پاس کیا ہوا تھا۔ بہرحال یہ تھوڑی بہت تعلیم بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکی تھی۔ اچھے حلیے، لباس اور بول چال سے خبیث دکاندار ہی نظر آتا تھا۔ بڑے ماموں کا بیٹا شارق بھی چونکہ اسی مزاج کا تھا اس لیے اکثر دونوں اکٹھے ہی نظر آتے تھے۔ یہ بھی سنا تھا کہ وہ ”الیکٹرک اسٹور“ میں ساجھے دار بن رہے ہیں۔ شہزاد کو شک تھا کہ چھوٹے ماموں، سجاد کا رشتہ نجمہ کی طرف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ایک دن شہزاد نے اپنی والدہ سے اس بارے میں پوچھا۔ والدہ نے جو کچھ بتایا اس سے شہزاد کی فکرمندی ایک دم بڑھ گئی۔ والدہ نے کہا۔ ”تمہیں ایک دفعہ بتایا تو تھا میں نے..... جس دن نجمہ پیدا ہوئی تھی، اس دن تیری ممانی کلثوم نے کہا تھا کہ میں اسے اپنی بہو بناؤں گی۔“

”لیکن ایسی باتیں تو ہنسی مذاق میں کی جاتی ہیں امی۔ وہ کوئی وقت ہوتا ہے ایسی باتیں کرنے کا۔“

”ہاں وقت تو نہیں ہوتا لیکن کچھ لوگ بے وقت کی ہوئی باتوں کو بھی گرہ میں باندھ کر رکھ لیتے ہیں۔ خاص طور سے ایسی صورت میں کہ جب انہیں اس میں فائدہ بھی نظر آ رہا ہو۔“

”آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ کیا وہ لوگ سجاد کا رشتہ نجمہ کی طرف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”میں نے تو یہی سنا ہے بلکہ مجھے تو یہ پتا چلا ہے کہ سجاد کو کویت سے بلایا ہی اس لیے گیا ہے تاکہ اس کام کو نمٹایا جا سکے۔“

شہزاد کے سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ ”امی! یہ کیسے ہو سکتا ہے..... یہ تو..... یہ تو بالکل بے جوڑ شادی ہوگی۔ سجاد بالکل اور رنگ ڈھنگ کا لڑکا ہے۔ شکل صورت، قد کاٹھ، پڑھائی لکھائی وہ کسی طرح بھی نجمہ کا ہم پلہ نہیں ہے۔“

”لیکن بیٹا! بات یہ ہے کہ ایسے معاملوں میں سب سے خاص چیز جو دیکھی جاتی ہے وہ مرد کی خوشحالی ہوتی ہے، جو کچھ بھی ہے لیکن سجاد کماؤ ہے اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ تمہاری ممانی کسی صورت بھی یہ رشتہ چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ تم جانتے ہی ہو کہ وہ کتنی سخت طبیعت کی ہے۔ جب کسی بات پر اڑ جائے تو پھر اڑ جاتی ہے۔ حقیقت میں تمہارے دونوں ماموں

تو اس سے ڈرتے ہیں۔“

”یہ سب کچھ میری سمجھ میں تو نہیں آ رہا امی، جس رشتے کی بنیاد ہی ڈر اور ضد پر ہو اس میں سے کیا خیر نکل سکتی ہے اور..... اور اس کے علاوہ بھی کسی نے نجمہ سے بھی پوچھنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کیا چاہتی ہے؟“

”لیکن شہزاد! تو اس معاملے میں کیوں اتنا پریشان ہو رہا ہے؟“ ماں نے اسے کھوجتی نظروں سے دیکھا۔

”نہیں، مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اگر ایک ”بے اصولی“ ہو رہی ہو تو بندے کا دماغ سوچتا تو ہے ناں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔“

والدہ کی نگاہیں بدستور بیٹے کے چہرے پر جمی رہیں۔

”کہیں..... تیرے اپنے دل میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے..... میرا مطلب ہے نجمہ کے متعلق.....؟“

”نن..... نہیں۔“ وہ گڑبڑایا۔

”کسی ایسی بات کو دل میں جگہ بھی نہ دینا شہزاد۔ ہمارے اور ان کے درمیان بڑا فرق ہے۔ ہمیں ابھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ تیرے سامنے ابھی لمبا راستہ ہے بیٹا۔ اپنی پڑھائی پوری کرنی ہے، ڈھنگ کی نوکری ڈھونڈنی ہے، گھر بنانا ہے، بہن کی ذمے داری ہے..... دیکھنا جب وقت آئے گا میں تیرے لیے ایسی چاند سی لڑکی ڈھونڈوں گی کہ.....“

”امی جی! آپ بات کو کہاں سے کہاں لے گئی ہیں۔“ شہزاد نے بیزاری سے ان کی قطع کلامی کی۔ ”میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ..... جس لڑکی کی زندگی کا فیصلہ ہو رہا ہو کم از کم اس لڑکی سے تو پوچھ لینا چاہیے۔“

”ہو سکتا ہے کہ اس کو پتا ہو؟“

”نہیں۔ اس کو کچھ پتا نہیں ہے امی۔“ شہزاد نے زور دے کر کہا۔

والدہ نے ایک بار پھر چونک کر اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا گیا اور باہر نکل گیا۔

اسی روز شام کو شہزاد، نجمہ کے گھر گیا۔ ابھی بڑے ماموں اور شارق وغیرہ گھر نہیں آئے تھے۔ امتحانات ہو رہے تھے اس لیے باقی کزن اور چھوٹے بچے بھی پڑھائی میں مصروف تھے۔ شہزاد چھت پر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک باسی روٹی تھی۔ وہ اس کے ٹکڑے کر کر کے مرغیوں کو ڈالنے لگا۔ اسی دوران میں نجمہ بھی اپنے چھوٹے بھتیجے کو اٹھائے چھت پر آ گئی۔ وہ ایک چھوٹی سی پتنگ اڑانے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ شہزاد اور نجمہ باتیں بھی کرنے لگے۔ شہزاد اب تنہائی میں نجمہ کو پیار بھرے انداز میں سوہنم کہہ کر بلاتا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ نام کب اور کیسے پڑ گیا تھا۔ غالباً قربت کے لمحات میں اس نے نجمہ کو ایک دو بار سوہنو کہا تھا۔ پھر سوہنو سے سوہنم ہو گیا تھا۔ جس طرح شہزاد کو سوہنم کہہ کر اچھا لگتا تھا اسی طرح نجمہ کو سوہنم سن کر اچھا لگتا تھا۔ اس کے گال شہابی ہو جاتے تھے اور بولتی آنکھوں میں ستارے چمک اٹھتے تھے۔

”سوہنم ایک بات بتاؤ گی تم؟“ شہزاد نے کہا۔

”پوچھیں۔“ وہ بھی آج خلافِ معمول سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

”کیا یہ سچ ہے کہ..... چھوٹے ماموں، سجاد کے لیے تمہاری بات کر رہے ہیں؟“

”ہاں، کوئی گڑبڑ تو ہے۔“ نجمہ نے ایک آہ کھینچی۔ ”پرسوں بھی چچا چچی ہماری طرف آئے ہوئے تھے۔ بند کمرے میں بات بھی ہوتی رہی ہے۔“

”تم نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں؟“

”ابھی مجھے خود بھی ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔ ویسے بھی کئی دن سے آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“

”اگر کوئی ایسی بات سامنے آئی تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟“

اس نے جھکی ہوئی پلکوں کے ساتھ کہا۔ ”میرے جواب کا آپ سے زیادہ کس کو پتا ہوگا..... لیکن..... چچی طبیعت کی بہت سخت ہیں۔ پتا نہیں وہ کیا کریں گی۔ آپ کو تو پتا ہی ہے، کبھی کبھی چچا بھی ان کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔“

”لیکن صرف اس وجہ سے کہ ممانی کلثوم سخت طبیعت کی ہیں اور وہ جھگڑا کریں گی، تمہاری اور میری زندگی تو برباد نہیں کی جا سکتی۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے ایک دو بار امی سے سجاد بھائی کے بارے میں بات کی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ کافی حد تک میری مرضی جان بھی گئی ہیں۔ وہ ابا جی سے اس بارے میں ضرور بات کریں گی۔“

”لگتا ہے کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تمہاری مرضی جلد از جلد ماموں ممانی پر واضح ہو جانی چاہیے۔“

”میں اندر سے بڑی کمزور ہوں شہزاد۔ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ خاص طور سے ابا جی سے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ پیار میں وہ طاقت نہیں ہے۔“

اس نے عجیب نظروں سے شہزاد کو دیکھا پھر مسکراتے لہجے میں بولی۔ ''آپ کو اس طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ کبھی موقع آیا تو بتادوں گی۔''

اسی دوران میں عرفی کی پتنگ نیچے گر گئی۔ وہ پتنگ لینے نیچے دوڑ گیا۔ اب چھت پر ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ شہزاد ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''لو جی موقع آ گیا ہے۔''

''کس چیز کا؟''

''پیار کی طاقت دکھانے کا۔'' اس کی نظروں میں تھوڑی سی شوخی آ گئی۔

''آپ آرام سے بیٹھیں، برساتی کا دروازہ کھلا ہے۔''

''تو میں کون سا تمہارے ساتھ ''دوگانا'' گانا چاہتا ہوں۔ وہ ویکنڈ کے لیے عید ہی تو ملی ہے۔''

اس کے چہرے پر شام کے سارے رنگ اتر آئے۔ ''آرام سے رہیں...... ابھی عید آنے میں ایک ہفتہ باقی ہے۔''

''ابھی پیشگی عید مبارک......''

''ابا جی کہا کرتے ہیں کہ پیشگی، ایڈوانس وغیرہ بالکل نہیں لینا چاہیے۔ یہ بڑی پریشانی والے کام ہوتے ہیں۔'' اس نے اٹھلا کر کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو پیشگی نہ سہی، گزشتہ ہی سہی، چھوٹی عید پر بھی کب ملے تھے ہم۔'' شہزاد بھی آج خلاف معمول کھلنڈرے موڈ میں آ گیا تھا۔

''وہ پرانی بات ہو چکی ہے۔'' وہ دور ہٹ کر رکی۔

شہزاد نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ وہ سمٹ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تاہم انداز میں نیم آمادگی تھی۔ بس یہی چھوٹی چھوٹی ترنگیں تھیں، جو ان کی محبت کی گاڑی کو ایندھن فراہم کر رہی تھیں۔

شہزاد نے نجمہ کو کندھوں سے تھاما ہوا تھا جب اچانک اسے محسوس ہوا کہ سیڑھیوں کی نیم تاریکی میں کوئی سایہ سا ابھرا ہے۔ وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ نجمہ بھی چونک گئی تھی۔ اگر عرفی ہوتا تو وہ سیدھا چھت پر ہی آتا۔

''پتا نہیں کون تھا؟'' نجمہ نے ہراساں انداز میں کہا۔

''چلو تم نیچے چلی جاؤ۔'' شہزاد نے اسے مشورہ دیا۔ وہ چلی گئی تو وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر مرغیوں کو باسی روٹی کے ٹکڑے ڈالنے لگا۔

دس پندرہ منٹ خیریت سے گزر گئے تو شہزاد کو بھی کچھ تسلی ہو گئی۔ اس دوران میں عرفی اپنی پتنگ لے کر واپس آ گیا تھا اور اسے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش میں شہزاد بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔ یہی وقت تھا جب آہٹ ہوئی اور چھت کی نیم تاریکی میں شہزاد کو نجمہ کا منجھلا بھائی شارق نظر آیا۔ ''ہیلو۔ شارق بھائی کیسے ہو؟'' شہزاد نے کہا۔

''ٹھیک۔'' شارق کا جواب ہمیشہ کی طرح مختصر تھا۔ پھر وہ عرفی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''عرفی تم نیچے جاؤ، ہمیں بات کرنی ہے۔'' شارق کے لب و لہجے نے شہزاد کو بری طرح کھٹکا دیا۔ تمام اندیشے پھر اس کے ذہن میں تازہ ہو گئے۔

عرفی نیچے چلا گیا تو شارق نے برساتی کے دروازے کو چھت کی طرف سے کنڈی چڑھا دی...... وہ گھوم کر شہزاد کی طرف آیا اور عین اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولا۔ ''کیا سمجھتے ہو تم؟ یہاں سب اندھے ہیں، کسی کو کچھ نظر نہیں آ رہا۔''

''تم...... میں سمجھا نہیں شارق؟'' شہزاد ہکلایا۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ شام کی گہری ہوتی تاریکی میں شارق کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

شارق نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور ایک وحشیانہ جھٹکے کے ساتھ اسے دیوار سے لگا دیا۔ پھنکار کر بولا۔ ''گھٹیا بندہ گھٹیا ہی ہوتا ہے، اس سے کسی اچھے کام کی امید رکھنی ہی نہیں چاہیے۔ تم جنگلی ہو...... تم سب جنگلی ہو۔''

''شارق! تم ہوش میں تو ہو؟'' شہزاد نے اس سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی۔

''دیکھ شہزاد! اگر اب تو مجھے اپنے گھر کے آس پاس بھی نظر آیا ناں، تو میں تیری ٹانگیں توڑ کر اور تجھے چارپائی پر ڈال کر تیرے باپ کے پاس پہنچاؤں گا۔ بس اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔'' اس نے ایک جھٹکا دینے کے بعد شہزاد کا گریبان چھوڑا اور برساتی کا دروازہ کھولتا ہوا نیچے چلا گیا۔

شہزاد کچھ دیر وہیں چھت پر کھڑا اپنے کشیدہ اعصاب کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ جو لاوا آج بڑی شدت کے ساتھ نکلا ہے وہ کافی عرصے سے اندر ہی اندر شارق کے دل میں پک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سیڑھیاں اترا اور بڑی ممانی سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد گھر سے باہر نکل آیا...... اسے لگ رہا تھا کہ شاید اب وہ کبھی اس دہلیز پر قدم نہ رکھ سکے۔ اس کے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔

گھر آ کر وہ پورے چوبیس گھنٹے تک اپنے کمرے میں بند رہا اور سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا ہے...... وہ اپنے گریبان کو مسلسل شارق کے ہاتھ میں محسوس کر رہا تھا اور اس کے کانوں میں جنگلی کا لفظ گونج رہا تھا۔ یہ لفظ شارق کی زبان پر اب آیا تھا لیکن شارق اور اس جیسے دوسرے لوگوں کے دلوں میں یہ لفظ بہت دیر سے موجود تھا۔ وہ تعلیم، تہذیب اور اخلاق میں ان سے پیچھے نہیں تھا بلکہ شاید کچھ آگے ہی تھا مگر وہ اپنے دلوں میں اسے دیہاتی گردانتے تھے۔ اسے اپنے سے کم تر سمجھنا اور اس بات کو جتانا ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔

دوسرے روز والدہ کے بار بار پوچھنے پر اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ اس نے ماں کے سامنے اقرار کیا کہ وہ اور نجمہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے...... دو روز پہلے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بھی اس نے سب کچھ ماں کے گوش گزار کر دیا۔ والدہ کافی دیر گم صم رہیں۔ آخر انہوں نے کہا۔ ''میں اسی بات سے ڈرتی تھی شہزاد...... تمہیں تھوڑا سمجھاتی بھی رہتی تھی۔ ماؤں سے کچھ بھی چھپا نہیں رہتا بیٹے۔''

''آپ جا کر بڑے ماموں سے نجمہ کا ہاتھ مانگیں امی۔'' شہزاد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''وہ تو اب کرنا ہی ہوگا...... لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہوگا شہزاد۔ بڑا رولا پڑے گا۔ تمہارا ماموں طفیل اور ممانی آسانی سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں اور اپنے بڑے ماموں کی سخت طبیعت کو بھی تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''وہ کتنی بھی سخت طبیعت کے ہیں لیکن انہیں اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کرنا ہوگی، وہ گاؤں کے بھینس نہیں ہے کہ جہاں جی چاہا ہانک دیا۔''

''ہمارے خاندان میں جو کچھ ہوتا ہے تمہیں پتا ہی ہے شہزاد۔''

''پر یہ لوگ تو اب ماڈرن بلکہ بہت ماڈرن بن چکے ہیں، خود کو نئی روشنی کے ٹھیکیدار سمجھتے ہیں۔ ہر روایت کو توڑ رہے ہیں، پھر ان فرسودہ روایتوں کو کیوں نہیں توڑتے...... پیدا ہوتے ہی بچے کا رشتہ طے کر دینا، ڈولی میں بٹھانے سے ایک گھنٹا پہلے بیٹی کی مرضی پوچھنا اور جائیداد کی خاطر بے جوڑ رشتے کرنا یہ کہاں کی نئی روشنی ہے۔ اس کی اجازت نئی روشنی دیتی ہے نہ پرانی روشنی اور نہ ہمارا مذہب......'' شہزاد طیش کے عالم میں بولتا چلا گیا۔

والدہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''بس بچے باتیں کہنی آسان ہوتی ہیں، ان پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال...... میں کل جاؤں گی جہانگیر کی طرف۔''

والدہ، ماموں جہانگیر کی طرف چلی گئیں اور دو دن وہاں رہیں۔ اس دوران میں شہزاد بڑی بے چینی سے ان کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ تیسرے روز دوپہر کو وہ واپس آئیں تو ان کا چہرہ نوشتہ دیوار کی طرح تھا۔ ان کی آنکھوں کی اداسی شہزاد کو غم و الم کی ساری کہانی سنا رہی تھی۔ ماموں جہانگیر نہ صرف بے رخی سے پیش آئے تھے بلکہ انہوں نے صاف انکار بھی کر دیا تھا...... انہوں نے کہا تھا کہ کلثوم (شہزاد کی منجھلی ممانی) نجمہ کا رشتہ بہت پہلے مانگ چکی ہے۔ اگر اب وہ اس رشتے سے انکار کریں گے تو سب کچھ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔

اگلے روز والدہ ہی کی زبانی شہزاد کو یہ پتا بھی چل گیا کہ کاہا اور نجمہ کی منگنی کی تیاری ہو رہی ہے۔

شہزاد کا برا حال تھا، وہ کسی بھی طرح نجمہ سے ملنا چاہتا تھا۔ تاہم وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ والدہ کے ساتھ بات چیت میں ماموں جہانگیر نے شارق اور شہزاد والی جھڑپ کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن یہ بات تو یقینی تھی کہ ماموں کو اس واقعے کا علم ہو چکا ہے اور نہ صرف وہ بلکہ پورا گھر بھی یقیناً آگاہ ہو چکا تھا۔ ایسی صورت حال میں نجمہ کے لیے گھر سے باہر نکلنا اور شہزاد سے ملنے کی کوشش کرنا نہایت دشوار کام تھا۔ نجمہ کے گھر فون موجود تھا۔ شہزاد نے ''پی سی او'' سے ایک دو بار ٹرائی کیا مگر ہر بار کسی اور نے ہی کال ریسیو کی۔ فون کامن روم میں ہوتا تھا اور گھر میں اتنے افراد اور اتنی چہل پہل تھی کہ نجمہ سے فون پر بات ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ بہرحال شہزاد نے اگلے تین چار روز میں کوشش جاری رکھی اور پھر ایک دن خوش قسمتی سے نجمہ کی آواز اس کے کانوں میں پڑ ہی گئی۔ اتفاقاً نجمہ کے ارد گرد دو تین بچوں کے سوا کوئی اور موجود بھی نہیں تھا۔ شہزاد نے جلدی جلدی بات کی اور اسے بتایا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی، تاہم ان دونوں کے درمیان طے ہوا کہ وہ کل سہ پہر کو کینٹ بیزار میں ملیں گے۔

شہزاد مقررہ وقت پر پہنچ گیا اور بے چینی سے نجمہ کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کی گھڑیاں کٹھن ہوتی ہیں اور شہزاد کے لیے کچھ زیادہ ہی کٹھن ثابت ہو رہی تھیں...... وہ ہر دو منٹ بعد گھڑی کی طرف دیکھتا تھا اور پھر دروازے کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ سہ پہر، شام میں بدلی اور شام تاریکی میں لیکن نجمہ نہیں آئی۔ بڑی مایوسی کے عالم میں شہزاد نے اس کو فون کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف سے بڑے ماموں کی بھاری بھرکم آواز آئی۔ ''کون ہے؟'' شہزاد نے فون بند کر دیا۔

اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں، شاید نجمہ کے گھر میں کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ

وہ شہزاد سے ملنا چاہ رہی ہے یا پھر کوئی اور بات ہوگئی تھی۔

وہ کئی ہفتے بلکہ بے فون پر کوشش کرتا رہا اور پھر دس بارہ روز بعد ایک دن پھر اچانک اس کی بات نجمہ سے ہوگئی۔ شکوے شکایات کا دور ہوا۔ شہزاد نے دکھی لہجے میں اسے بتایا کہ اس کے پچھلے دو ہفتے کس کرب کے عالم میں گزرے ہیں۔ وہ بھی رونے لگی۔ اس نے بتایا کہ سب لوگ ایک شادی پر گئے ہوئے ہیں۔ وہ بیماری کا بہانہ کر کے نہیں گئی۔ وہ صبح سے دعا کر رہی تھی کہ کسی طرح فون پر اس سے بات ہو جائے۔

"گھر میں اور کون ہے؟" شہزاد نے پوچھا۔

"بس بھائی ولید اور بھابی ہیں، لیکن وہ بھی اپنے کمرے میں ہیں۔"

"کیا تم کسی طرح باہر مل سکتی ہو؟"

"یہ تو ناممکن ہے، ہاں ہم فون پر پندرہ بیس منٹ بات کر سکتے ہیں۔"

"ہاں اب کیا کرنا ہے سوئم؟" شہزاد کا لہجہ دل گرفتہ تھا۔

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا.......... میں آپ کے سوا کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" وہ سسک اٹھی۔

"تصور تو میں بھی نہیں کر سکتا لیکن کیا تصور نہ کرنے سے حالات بدل جائیں گے؟"

"تو پھر مجھے بتائیں میں کیا کروں، اباجی اور بھائی شارق وغیرہ اتنے سخت ہوگئے ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ خاص طور سے بھائی شارق۔ وہ اتنی بری باتیں کرتے ہیں کہ مجھے تو ڈر ہے کہ وہ آپ کو...... کسی طرح کا نقصان نہ پہنچا دیں۔"

"کیا یہ سب کچھ صرف چھت والے واقعے کی وجہ سے ہوا ہے، وہ تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ ہم دونوں بس پاس پاس کھڑے تھے۔"

"نہیں شہزاد۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "اندر ہی اندر بہت لاوا بڑی دیر سے پک رہا تھا۔ ایک دو چھوٹی موٹی باتیں میں نے سنی تھیں لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ چکی ہے۔ اب پتا چل رہا ہے کہ سجاد کو خاص طور پر اسی لیے کوئٹہ سے بلایا گیا ہے۔"

"تمہاری امی کیا کہتی ہیں؟"

"وہ بھی بڑی دکھی ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ بھی سجاد کو پسند نہیں کرتیں لیکن اباجی کے سامنے ان کی کوئی بات نہیں چل سکتی۔"

"اچھا تم اس دن وعدہ کرنے کے باوجود کیوں نہیں آئی تھیں؟"

"مجھے لگتا ہے شہزاد کہ کسی طرح بھائی شارق کو پتا چل گیا تھا یا شاید انہیں شک ہو گیا تھا۔ وہ دوپہر کو ہی گھر آگئے۔ میں انارکلی سے کتابیں خریدنے کے بہانے جانا چاہتی تھی۔ انہوں نے مجھے خود ہی کتابیں لا دیں۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا سوئم کہ تم سجاد سے بات کرو اور اسے بتا دو کہ تم دونوں خوش نہیں رہ سکتے ہو۔"

"شہزاد! آپ بھی اسے اچھی طرح جانتے ہیں، وہ اس ٹائپ کا بندہ نہیں ہے اور یہ کوئی اب کی بات نہیں، بچپن سے ہی پرلے درجے کا ڈھیٹ ہے۔ آج کل اوٹ پٹانگ کپڑے پہن کر میرے ارد گرد گھومتا ہے اور امپریس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئٹہ سے جو پیزا وغیرہ لے کر آیا ہے اس کی بھی بڑی خماری ہے اس کو۔ کل ولید بھائی کہہ رہے تھے، لگتا ہے کہ سجاد میں تو کسی بلیے کی روح گھس گئی ہے، ہر وقت دو اور دو چار کی باتیں کرتا رہتا ہے۔"

"ولید بھائی کا کیا نظریہ ہے؟"

"وہ شارق بھائی سے بالکل مختلف سوچتے ہیں مگر اباجی کے سامنے ان کا بس بھی نہیں چل سکتا۔ کل اباجی نے کسی بات پر امی جی کو بھی بہت جھڑکا ہے۔ مجھے بند کمرے میں سے آوازیں آرہی تھیں۔ امی نے مجھے بتایا تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میری ہی بات ہو رہی تھی۔" نجمہ ایک بار پھر روہانسی ہوگئی۔

"رونے سے قسمت نہیں بدلتی ہے سوئم۔" شہزاد نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"تو پھر میں کیا کروں۔ میں آپ کے سوا کسی اور کی دلہن نہیں بن سکتی۔ اس سے تو مجھے مرنا اچھا لگتا ہے۔"

"اگر ہماری محبت سچی ہے اور ہمارا ارادہ مضبوط ہے تو اوپر والا ہمارے لیے کوئی نہ کوئی راستہ بھی ضرور نکالے گا۔ حالات کا رخ دیکھو اور ساتھ ساتھ دعا کرو۔"

وہ بولی۔ "اگلے جمعے کو اباجی اور شارق بھائی کو...... دو دن کے لیے کراچی جانا ہے۔ سجاد بھی ساتھ ہوگا۔ وہ شاید سجاد کی دکان کے لیے سامان وغیرہ لینے جارہے ہیں۔ آپ جمعے کی دوپہر کو فون کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ......"

اچانک نجمہ کو خاموش ہونا پڑا۔ وہ ہکلائی۔ "میرا خیال ہے کہ سجاد اس طرف آرہا ہے، اچھا جمعے کو.. خدا حافظ۔" فون بند ہو گیا۔

شہزاد نے جمعے تک کا وقت بڑی مشکل سے کاٹا۔ یہ آٹھ دس دن اس کے لیے آٹھ دس مہینوں کی طرح تھے۔ آخر

خدا خدا کر کے جمعے کی دوپہر ہوئی اور شہزاد نے مختلف "پی سی اوز" سے نجمہ کو فون کرنا شروع کیا۔ فون لائن پر مسلسل انگیج کی ٹون جارہی تھی۔ لگتا تھا کہ ریسیور ویسے ہی کریڈل سے ہٹا دیا گیا ہے۔ وہ ایک اور اذیت ناک شام تھی۔ جاں گسل انتظار کے بعد جب رابطے کی گھڑی آئی تھی تو ایک بار پھر سفاک نارسائی کا سامنا ہو گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ شہزاد نے بڑے کرب سے سوچا۔ کہیں نجمہ جان بوجھ کر تو......

نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے خیال کو خود ہی بڑی شدت سے رد کر دیا تو کیا پھر قدرت کو ہی منظور نہیں تھا کہ ان کے لیے مناسب حالات پیدا ہو سکیں۔ وہ ایک بار پھر غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔

اس واقعے کے صرف پانچ چھ روز بعد غم کے اس سمندر کی گہرائی کچھ اور بڑھ گئی۔ شہزاد کو پتا چلا کہ اتوار کے روز نجمہ اور سجاد کی منگنی ہو رہی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی گھریلو تقریب تھی جس میں چند افراد ہی مدعو تھے۔ شہزاد کی والدہ اور والد کو بھی بلایا گیا تھا۔ والد تو نہیں گئے، صرف والدہ گئیں اور زیادہ دکھی ہو کر واپس آئیں۔ ان کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ واپسی پر راستے بھر روتی بھی رہی ہیں۔ ماں بیٹے میں بہت پیار تھا۔ ایک دوسرے کی چھوٹی سی تکلیف پر بھی دونوں تڑپ اٹھتے تھے۔ شہزاد کے والد صاحب الگ تھلگ اور خاموش طبع قسم کے شخص تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے۔ یہاں لاہور آکر انہوں نے فرنیچر کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لی تھی اور ایک کارپینٹر لڑکا ملازم رکھ لیا تھا۔ ان کی خاموش زندگی بس دکان سے گھر اور گھر سے دکان تک محدود تھی لیکن والدہ تو سب کچھ دیکھ رہی تھیں اور محسوس کر رہی تھیں۔ بیٹے کے غم کا کوہ گراں ان کے ناتواں جسم کو بھی پیتا ہوا گزر رہا تھا۔

چند روز بعد ایک دن آخر شہزاد کو نجمہ سے ملنے کا موقع مل ہی گیا۔ پہلے فون پر ان کا رابطہ ہوا پھر ملاقات کی جگہ طے ہوگئی۔ وہ ایک نیم گرم شام کو شیخ میران کے ایک فیملی کیبن میں ملے۔ آج شہزاد نے نجمہ کو تین چار ماہ بعد دیکھا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی شہزاد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی اس کی طرح برابر دکھ کی آگ میں جلتی رہی ہے۔ اس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد تھا اور رخساروں کی ہڈیاں قدرے ابھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ہلکے رنگوں سے بنائی گئی ایک غمگین لیکن دلکش تصویر جیسی دکھائی دیتی تھی۔

وہ میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ شہزاد نے اس کے دونوں سرد ہاتھ تھام لیے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی سوئم کو کھینچ کر اپنے سینے لگا لے اور اپنے بازوؤں میں اس طرح چھپا لے کہ کوئی قیامت تک اسے ڈھونڈ نہ سکے۔ "شہزاد، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے بار بار انتظار کے زہر سے کیوں مار رہی ہو۔ پچھلی دفعہ کیا ہوا تھا۔ میں نے شام تک کوئی پچاس دفعہ تمہیں کال کی۔ تمہارا فون مسلسل انگیج جاتا رہا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس روز تم نے مجھے کتنی تکلیف دی۔"

"کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا شہزاد۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ تقدیر بھی ساتھ نہیں دے رہی۔ شارق بھائی کو...... ابا جی اور سجاد کے ساتھ ہی کراچی جانا تھا لیکن وہ نہیں گئے۔ جمعہ کے روز وہ سارا دن گھر میں رہے۔ میں نے جان بوجھ کر فون کا تار نکال دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ بار بار فون کریں گے اور شارق بھائی کو شک ہو جائے گا۔ اس کے باوجود مجھے لگتا ہے کہ ان کو کسی طرح کا شک ہو چکا تھا۔ اس روز شام کو انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور بڑے سخت لہجے میں اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے صاف کہا کہ میں ان کو بے خبر نہ سمجھوں۔ انہوں نے آپ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں نے آپ سے یا آپ نے مجھ سے ملنے کی کوشش کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ بات بڑی دور تک چلی جائے گی......"

اچانک شہزاد کو لگا کہ خون اس کی رگوں میں منجمد ہو رہا ہے۔ نجمہ سے بات کرتے کرتے اس کی نظر کیبن کے ریشمی پردے کی سائڈ سے گزر کر کیفے کی کھڑکی پر پڑی تھی۔ اس...... آدم کھڑکی کے پار سڑک کی چہل پہل نظر آتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ کار پارکنگ کا کچھ حصہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ شہزاد کو جو چیز نظر آئی تھی وہ بڑے ماموں جہانگیر کی سرخ ٹویوٹا گاڑی تھی۔ اس گاڑی میں شارق ایک اور شخص کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ انہوں نے گاڑی کیفے کی پارکنگ میں کھڑی کر دی تھی اور اب دروازے لاک کر رہے تھے۔

"کیا ہوا شہزاد؟" نجمہ نے شہزاد کی نظروں کا تعاقب کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"اٹھو نجمہ۔" شہزاد نے نجمہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور میز پر بل کے پیسے رکھ کر کیبن سے باہر آگیا۔

"بات کیا ہے شہزاد۔" نجمہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔

شہزاد نے کوئی جواب نہیں دیا اور نجمہ کا ہاتھ پکڑے پکڑے ڈائننگ ہال کے عقبی دروازے کی طرف آگیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ دونوں ذیلی سڑک پر تھے۔ "میرا خیال ہے کہ

شارق آرہا ہے۔ تم فوراً گھر چلی جاؤ۔'' شہزاد نے نجمہ کو ایک خالی رکشا میں دھکیلتے ہوئے کہا۔

نجمہ کا زرد چہرہ مزید زرد ہو گیا۔ تاہم یہ بات تو وہ بھی سمجھ چکی تھی کہ یہ سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔ شہزاد کے اشارے پر رکشا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ نجمہ کے جانے کے بعد شہزاد بھی فوراً ایک ویگن میں سوار ہو گیا۔

اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ پتا نہیں کہ شارق کو کیسے خبر ہو گئی تھی۔ یہ امکان تو بعید از قیاس تھا کہ وہ اتفاقاً یہاں آیا ہو گا۔ گاڑی میں سے اس کے نکلنے کا عجلت آمیز انداز اور اس کے تاثرات سب گواہی دے رہے تھے کہ وہ ''کچھ'' سمجھ آیا ہے۔ کیا وہ نجمہ کا پیچھا کر رہا تھا؟ لیکن اگر پیچھا کر رہا ہوتا تو پھر نجمہ کے آنے کے فوراً بعد ہی آ جاتا۔ انہیں تو وہاں کیبن میں بیٹھے ہوئے دس پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ تو کیا پھر وہ پہلے سے جانتا تھا کہ نجمہ کیفے میزان میں جائے گی؟ شہزاد کو عجیب سنسنی سی محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ کوئی ہے جسے نجمہ کے ساتھ اس کے رابطے کی پہلے سے خبر ہو جاتی ہے اور وہ مخبری کر دیتا ہے۔ ایسا کون ہو سکتا ہے؟

تیزی سے چلتی ویگن میں شہزاد کا ذہن بھی تیزی سے دوڑ تا رہا۔ یہ کوئی ہمراز ہی ہو سکتا تھا۔ شہزاد کا تو ایسا کوئی ہمراز نہیں تھا لیکن......

اچانک شہزاد کے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ اس کا دھیان نجمہ کی سب سے عزیز سہیلی گڈو کی طرف چلا گیا۔ شہزاد کو پتا تھا کہ نجمہ کچھ بھی گڈو سے چھپاتی نہیں ہے۔ تو کیا...... یہ سب کچھ...... گڈو کر رہی تھی۔ اگر وہ کر رہی تھی تو کیوں؟

گھر آ کر بھی شہزاد سخت پریشان رہا۔ دو تین بار دروازے پر دستک ہوئی اور ہر بار شہزاد کو یہی لگا کہ شارق تند بگولے کی طرح گھر میں داخل ہونے والا ہے اور سب کچھ تہس نہس کرنے والا ہے۔

دوسرے روز صبح تک تو خیریت ہی گزری۔ صبح دس بجے کے قریب جب شہزاد کالج جانے کے لیے گھر سے نکلا تو بڑی سڑک تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک گاڑی اس کے قریب رکی۔ یہ ایک سفید ڈاٹسن تھی۔ گاڑی کے اندر دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ شارق نہایت سرخ چہرے کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اس کا کوئی دوست تھا۔

شارق نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''اندر بیٹھو، تم سے بات کرنی ہے۔''

شہزاد کو خطرے کا احساس تو ہوا لیکن نجانے کیوں وہ اندر بیٹھنے سے انکار نہ کر سکا۔ اپنے اندر صورت حال کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر کے وہ اندر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی شارق اگلی نشست سے اتر کر نیچے آیا اور شہزاد کے ساتھ ہی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

''چلو راجا۔'' اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص سے کہا۔

''کہاں جانا ہے شارق! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' شہزاد بولا۔

''مجھے پتا ہے، بڑے مصروف ہو تم۔ بس پانچ دس منٹ لوں گا۔'' شارق کا لہجہ زہرناک تھا۔

گاڑی نے ایک چھوٹا سا چکر کاٹا اور گندے نالے کے پل پر سے گزرتی ہوئی ایک چھوٹے سے پارک کی سنسان سڑک پر رک گئی۔ یہ دراصل ایک ویران ہاؤسنگ اسکیم تھی۔ ویران سڑکوں اور بجلی کے ٹیڑھے میڑھے کھمبوں کے سوا یہاں اور کچھ نہیں تھا۔

شارق کا دوست راجا نامی دوست گاڑی سے باہر نکل گیا۔ اندر پچھلی نشست پر شارق اور شہزاد بیٹھے رہ گئے۔ شارق کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ اس نے ایک لفظ کہے بغیر شہزاد کا گریبان پکڑ لیا اور وحشیانہ انداز میں جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ ''تجھے کہا تھا ناں، نجمہ کے آس پاس نظر نہ آنا۔ تجھے کہا تھا ناں؟''

''شارق، تم تحمل سے میری بات سنو۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ نہ ہی نجمہ......''

''خبردار...... خبردار۔'' وہ پھنکارا۔ ''میری بہن کا نام اپنی گندی زبان پر نہ لانا۔ میں منہ توڑ دوں گا تمہارا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک زوردار گھونسا شہزاد کے منہ پر مارا۔ شہزاد چکرا گیا اور اس کے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا۔

ایک دم شہزاد میں اتنا حوصلہ نجانے کیسے پیدا ہو گیا۔ اس نے شارق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شارق! میں کوئی فلرٹ نہیں کر رہا، میں نجمہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں......''

''حرامزادے...... کتے۔'' شارق پھر دھاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ اپنی قمیص کے نیچے گیا اور شہزاد کو اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پستول نظر آیا۔

شہزاد کا رنگ اڑ گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ شارق اس حد تک چلا جائے گا۔ شارق نے پستول کی سرد نال شہزاد کی گردن میں گھسیڑ دی۔ وہ اس کے اوپر تقریباً سوار ہی ہو گیا تھا...... ایک بار پھر زہرناک انداز میں پھنکارا۔ ''میں نے تجھے کہا ہے میری بہن کا نام اپنی زبان پر نہ لانا۔ میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ اسی جگہ خون کر دوں گا تیرا۔''

شہزاد کے دل نے گواہی دی کہ یہ شخص جنون کا شکار ہے اور اس حالت میں یہ واقعی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس نے جواب دینے کے بجائے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ شارق نے اس کے بال مٹھی میں جکڑے۔ ''جنگلی! تو ڈنگر باپ کی جنگلی اولاد ہے، پینٹ شرٹ پہننے اور کتابیں چاٹنے سے جانور انسان نہیں بن جاتا۔ میں تیرا وہ حال کر دوں گا کہ لوگ کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔''

شہزاد نے اور تو بہت کچھ برداشت کیا تھا لیکن والد کی توہین برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے پستول کی پروا کیے بغیر اپنا پاؤں شارق کے پیٹ سے لگایا اور اسے ٹانگ کے زور سے اتنی شدت کے ساتھ دھکیلا کہ وہ پیچھے ہوا میں اڑتا ہوا گاڑی سے باہر جا گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ شارق دوبارہ پستول پکڑ لیتا، شہزاد نے باہر نکل کر اسے جھاپ لیا۔ پچھلے آٹھ دس ماہ میں اس کے اندر جتنی بھی تلخی و ترشی پیدا ہوئی تھی وہ ساری ایک دم غیظ و غضب میں ڈھل گئی۔ اسے پینڈو کا خطاب دینے والے غصے کے جابجا کتنے بھی تیز تھے، جسمانی لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے چند سیکنڈ میں شارق کو دھنک کر رکھ دیا۔ ''خبردار، میرے باپ کے بارے میں کچھ کہا تو...... خبردار۔'' وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔

اس دوران میں شارق کا ساتھی عقب سے آیا۔ اس نے ایک اینٹ سے شہزاد کے سر پر ضرب لگائی۔ شہزاد گر گیا۔ وہ دونوں اس پر پل پڑے۔ شہزاد کے ناک منہ سے خون چھوٹنے لگا۔ اس دوران میں شہزاد نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ فاصلے سے کچھ افراد بھاگے ہوئے آ رہے ہیں۔ وہ غالباً شہزاد کی جان بچانا چاہتے تھے۔

تاہم ان کے پہنچنے سے پہلے ہی شارق اور راجا اسے ادھ موا کر کے پیچھے ہٹ گئے۔ شارق نے اس کے سینے پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ ''اب چھوڑ رہا ہوں۔ اگلی بار نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے اور ہوا ہو گئے۔

چند راہگیر شہزاد کے پاس پہنچے۔ اسے اٹھنے میں مدد دی۔ ''کیا ہوا تھا بھائی؟'' کسی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں بس لین دین کا جھگڑا تھا۔'' شہزاد نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔

ایک شخص اس کے کپڑے جھاڑنے لگا۔ دوسرے نے اس کا گرا ہوا خستہ حال ہٹو اسے تھمایا۔ وہ لوگوں کے سوالوں سے بچتا بچاتا بازار کی طرف چلا گیا۔ اس کے چہرے اور سر پر تو چوٹیں آئی ہی تھیں، کوئی آہنی چیز لگنے سے ایک کلائی پر بھی گہرا کٹ آیا تھا۔ یہاں اسٹچنگ وغیرہ کی ضرورت تھی۔ وہ رکشا میں بیٹھ کر قریبی کلینک کی طرف چلا گیا۔

وہ کالج سے فارغ ہو کر اپنے پارٹ ٹائم جاب پر جایا کرتا تھا اور وہاں سے اس کی واپسی رات کو نو دس بجے ہی ہوتی تھی، آج وہ دو گھنٹے بعد ہی گھر واپس آ گیا۔ والدہ ٹھٹک گئیں، پھر جب اس کا سوجا ہوا چہرہ دیکھا تو ان کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ ''ہائے میرا بچہ، یہ کیا ہوا، ہائے میں مر گئی۔''

''کچھ نہیں امی! ان ویگن والوں کو آفت آئی ہوئی ہے۔ طوفان کی رفتار سے چلتے ہیں، سڑک کراس کر رہا تھا، یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ بڑی پسلی بچ گئی۔''

سادہ لوح والدہ فوراً ہی ایکسیڈنٹ والی بات مان گئیں۔ ان کا دھیان پریشانی کے سبب کسی اور طرف گیا ہی نہیں۔ شہزاد کا ارادہ تھا کہ اگر شارق خود اس بات کو ظاہر نہیں کرے گا تو وہ بھی کسی کو نہیں بتائے گا لیکن شارق نے اس بات کو راز نہیں رکھا۔ چند ہی گھنٹوں میں یہ واقعہ پورے خاندان میں مشہور ہو چکا تھا۔ بس اس میں سے یہ بات حذف کر دی گئی کہ شہزاد اور نجمہ کیفے میں ملے تھے۔ یہ کہا گیا کہ شہزاد بار بار نجمہ سے ملنے کی کوششیں کر رہا تھا۔

شہزاد کو بھی سارا واقعہ گھر والوں کو بتانا پڑا۔ والدہ اور بہن عائشہ کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ شہزاد کے والد جو بہت خاموش طبع تھے یہ بات سن کر طیش میں آ گئے کہ شارق نے شہزاد کو اپنے دوست کے ساتھ مل کر مارا پیٹا ہے اور اس پر پستول نکالا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ تھانے جا کر اس کی رپورٹ درج کرائیں گے۔ شہزاد اس کی والدہ اور بہن نے بڑی مشکل سے انہیں تھانے جانے سے روکا۔

دوسرے روز شام کو اطلاع ملی کہ نجمہ اسپتال میں ہے۔

اس خبر نے شہزاد کو ہلا کر رکھ دیا۔ پہلا خیال تو اس کے ذہن میں یہی آیا کہ شاید اپنے دیوانے پن میں شارق نے اس کو بھی مارا پیٹا ہے یا کسی طرح نقصان پہنچایا ہے۔ بہرحال بعد ازاں یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ ایک دوسرے رشتے دار کی زبانی پتا چلا کہ نجمہ کی طبیعت خراب ہوئی ہے۔ اس کا بلڈ پریشر اچانک خطرناک حد تک کم ہو گیا تھا جس کے بعد اسے ایمرجنسی میں لے جانا پڑا۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا ہوگا یہ کوئی بات سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ وہ پہلے سے شدید تناؤ میں تھی جب اسے پتا چلا تھا کہ اس کے بھائی نے شہزاد پر پستول نکالا ہے اور اسے زدوکوب کیا ہے تو وہ غیر معمولی طور پر پریشان ہوگئی تھی۔

شہزاد کے منع کرنے کے باوجود اس کی امی اگلے روز نجمہ کی عیادت کرنے اسپتال چلی گئیں۔ عائشہ بھی اصرار کرکے ان کے ساتھ گئی۔ وہی ہوا جس کا شہزاد کو اندیشہ تھا۔ کسی اور نے تو خیر کوئی بات نہیں کی لیکن اسپتال کی راہداری میں شہزاد کی والدہ کی مڈبھیڑ ممانی کلثوم سے ہوگئی۔ ممانی کلثوم نے ان کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال کیے۔ گھر آکر والدہ نے تو کچھ نہیں بتایا مگر ان کی روئی روئی آنکھوں نے شہزاد کو غم ناک اشارے دے دیے۔

رات کو جب والدہ اور والد سوگئے تو شہزاد نے کرید کرید کر عائشہ سے پوچھا۔ عائشہ نے آنکھوں میں نمی لے کر بتایا۔ ''ممانی نے بڑی بدتمیزی کی ہے، کہا ہے کہ ہم لالچی لوگ ہیں۔ محلوں کے سپنے دیکھتے ہیں، ہمارا مذہب صرف پیسا ہے۔''

''امی نے کوئی جواب نہیں دیا؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''امی کا آپ کو پتا ہی ہے کہ سختی سے بات کر ہی نہیں سکتیں اور ممانی کلثوم تو ایسی عورت ہیں کہ بڑوں بڑوں کو چپ کرا دیتی ہیں۔ امی نے انہیں تحمل سے بات کرنے کو کہا تو وہ ترخ کر بولیں۔ ''ہم میں تحمل نہیں ہے۔ جس کے گھر میں نقب لگائی جارہی ہو وہ کیسے کرے تحمل...... یہ تحمل تو تمہارے جیسوں کا ہتھیار ہوتا ہے، جنہوں نے میٹھی چھری بن کر جڑیں کاٹنی ہوتی ہیں۔ تم جڑیں کاٹنے والی ہو...... اور تمہاری میٹھی چھری تمہارا وہ بیٹا ہے......'' ممانی کلثوم نے آپ کے بارے میں بھی غلط سلط باتیں کہیں۔'' عائشہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

شہزاد نے چھوٹی بہن کا سر اپنے زخمی کندھے سے لگا کر اسے تسلی دی۔

شہزاد کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ حالات کو خراب کرنے میں نجمہ کی سہیلی گڈو ضرور کردار ادا کررہی ہے۔ یہ لڑکی شہزاد کو آغاز میں ہی اچھی نہیں لگی تھی۔ بظاہر بہت میٹھے لہجے میں بات کرتی تھی لیکن اس مٹھاس کے اندر ہی کہیں کڑواہٹ بھی چھپی رہتی تھی۔ بار بار شہزاد کا دل چاہ رہا تھا کہ گڈو سے ایک بار ضرور ملے۔ گڈو کی کام کررہی تھی اور وہ جس کالج میں پڑھتی تھی اس کا بھی شہزاد کو پتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے ایک دوست سے موٹر سائیکل مستعار لی اور گڈو کے کالج پہنچ گیا۔ جو کچھ بھی تھا مگر بظاہر تو گڈو نجمہ کی سہیلی ہی تھی۔ وہ اس سے مل کر نجمہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ شاید گڈو کو سمجھنا بھی چاہتا تھا۔

پہلے دن تو گڈو سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ وہ کالج ہی نہیں آئی تھی لیکن دوسرے دن نہ صرف گڈو سے ملاقات ہوگئی بلکہ ایک اہم انکشاف بھی ہوگیا۔ یہ سب کچھ اتفاقیہ لیکن بڑا حیرت انگیز تھا۔ چھٹی کے وقت گڈو اپنی سہیلیوں کے ساتھ نکلی۔ وہ ذرا آگے گئی تھی کہ ایک نئی کار اس کے پاس رکی۔ اس میں ممانی کلثوم کی بیٹی مہروز ڈرائیونگ کررہی تھی۔ شہزاد کو معلوم تھا کہ مہروز بھی ایک قریبی کالج میں پڑھتی ہے تاہم یہ پتا نہیں تھا کہ یہ دونوں آپس میں ملتی بھی ہیں۔ دونوں بڑی بے تکلفی سے گپ شپ کرتی آگے چل دیں۔ شہزاد نے کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا پیچھا شروع کردیا۔ راستے میں ایک جگہ کار رکی۔ یہ ایک سلمنگ سینٹر تھا (ان دنوں سلمنگ سینٹر بہت کم ہوتے تھے) سلمنگ سینٹر میں سے کچھ دیر بعد چھوٹی ممانی کلثوم برآمد ہوئیں اور وہ بھی کار میں آبیٹھیں۔ کار مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی مال روڈ کے ایک جوس کارنر پر رک گئی۔ کار کے اندر بیٹھے بیٹھے تینوں عورتوں نے ملک شیک پیا۔ ممانی کا گلاس ان کے جثے کے مطابق ڈبل تھا۔ وہ جتنا تاثر موٹاپا کم کرنے پر صرف کرتی تھیں اس سے کہیں زیادہ تاثر کھانا کھانے میں لگاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ معاملہ جوں کا توں تھا۔ نجانے کیوں شہزاد کی نگاہوں میں کچھ عرصہ پہلے کا وہ منظر گھوم گیا جب شب برات کے موقع پر ہوائی ممانی کے کپڑوں میں چلی گئی تھی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھنے کی ناکام کوشش کرتی رہی تھیں۔

شہزاد ایک محفوظ فاصلے سے انہیں دیکھ رہا تھا اور حیران ہورہا تھا۔ وہ گھل مل کر باتیں کررہی تھیں اور گاہے بگاہے کھلکھلا کر ہنستی تھیں اور یہ وہ وقت تھا جب نجمہ ابھی اسپتال سے ڈسچارج نہیں ہوئی تھی۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ شہزاد نے ماموں جہانگیر کے گھر میں بھی کبھی ممانی کلثوم، ان کی بیٹی اور گڈو کو اتنی بے تکلفی سے باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہاں ممانی گڈو کے ساتھ ایسے ہی ملتی تھیں جیسے ایک پڑوسن سے ملا جاتا ہے۔ گڈو کی زیادہ دوستی نجمہ کے ساتھ ہی سمجھی جاتی تھی۔

شہزاد کی چھٹی حس نے گواہی دی کہ یہاں کوئی گڑبڑ موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں یہ خیال مزید پختہ ہوگیا کہ اب تک نجمہ اور اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے اس میں گڈو کا ہاتھ تھا اور گڈو کا تعلق ممانی کلثوم سے تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ممانی پس پردہ رہ کر مسلسل اپنا کام دکھاتی رہی

ہیں...... اور بڑی حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔ شارق کی آتش مزاجی کی وجہ سے ممانی کا کام مزید آسان ہوا تھا اور اب شہزاد اور نجمہ ایک دوسرے سے ناقابلِ عبور فاصلے پہ کھڑے تھے۔

اچانک ہی ایک موٹر سائیکل شہزاد کے قریب آکر رکی شہزاد ٹھٹک گیا۔ اس پر چھوٹی ممانی کلثوم کا بیٹا فردوس سوار تھا۔ غالباً وہ بھی کہیں جا رہا تھا اور اپنی فوکسی کو جوس کارنر پہ کھڑے دیکھ کر اس طرف آ گیا تھا لیکن فوکسی تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی نگاہ شہزاد پر پڑ گئی تھی۔ عام حالات میں شہزاد اپنے اس ماموں زاد کو دیکھتا تو اسے کیا پریشانی ہو سکتی تھی لیکن یہ موقع ہرگز مناسب نہیں تھا۔

"آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں شہزاد بھائی؟ کیا آپ کو جوس پلانے سے انکار کر دیا گیا ہے؟"

"نن نہیں...... میں تو بس یونہی۔ میں دراصل...... ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔"

"اور دوست آ گیا ہے۔ یعنی میں...... چلیں اب ان لوگوں پہ چھاپا مارتے ہیں۔" فردوس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ تاہم لہجے میں تھوڑی سی چبھن بھی تھی۔ شاید اسے شہزاد پہ کچھ شبہ ہوا تھا۔

"نہیں یار! اب مجھے واپس جانا پڑے گا۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔" شہزاد نے کہا اور سٹپٹایا ہوا سا موٹر سائیکل پہ بیٹھ گیا۔

اس کے ذہن میں مختلف اندیشے چنگھاڑنے لگے تھے۔ فردوس کا اسے یوں دیکھنا نیک شگون نہیں تھا۔ گڈو اور ممانی کلثوم کے گٹھ جوڑ کے حوالے سے بھی شہزاد کے ذہن پہ بہت بوجھ تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ نجمہ اس کے سامنے ہو۔ وہ اسے ممانی کلثوم کی اس بے رحم سازش کے بارے میں سب کچھ بتائے لیکن نجمہ تو اس سے بہت دور جا چکی تھی...... ہاں غمگسار ماں پاس تھی، اس نے ماں کو بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔ جس وقت شہزاد اپنی والدہ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ بیرونی دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ دستک کے انداز نے شہزاد کو چونکا دیا تھا۔ عائشہ نے دروازہ کھولا تو ممانی کلثوم آندھی کی طرح اندر داخل ہو گئیں۔ ممانی کلثوم کی سخت طبیعت سارے خاندان میں مشہور تھی اور اس وقت تو وہ بالکل شعلہ جوالا بنی ہوئی تھیں۔

انہوں نے سلام دعا کے بغیر ہی آتے کے ساتھ ہی چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ ان کا پہلا ہدف شہزاد تھا۔ شہزاد کے عین سامنے کھڑے ہوتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "کیا چاہتا ہے تو۔ کن چکروں میں ہے؟ اب کیا نیا چاند چڑھانا ہے تو نے؟"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"تجھے نہیں پتا تو کیا کر رہا ہے؟ ہماری لڑکیوں کا پیچھا کر رہا ہے۔ ہماری جاسوسیاں، مخبریاں کر رہا ہے۔ ہمارا جینا حرام کر رہا ہے۔"

"میں نے کسی کی جاسوسی نہیں کی۔ یہ آپ لوگ ہیں جو سازشیں کر رہے ہیں۔ ہمیں خاندان سے کاٹنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔"

"اچھا میں سازشی ہوں؟ سازشی ہوگا تو، سازشی ہوگی تیری ماں، تیرا باپ۔ تیری رگوں میں خون ہی گندا ہے۔"

"ممانی! زبان سنبھال کر بات کریں۔ آپ عورت نہ ہوتیں تو میں آپ کو جواب دیتا۔"

"کیا کرے گا تو میرا۔ مجھے گولی مار دے گا، لے مار گولی، باپ کا ہے تو مار گولی۔" وہ بپھری ہوئی شہزاد کی طرف بڑھیں اور دوپٹا اتار کر دور پھینک دیا۔

شہزاد کی والدہ تڑپ کر ان دونوں کے درمیان آ گئیں۔ "کلثوم...... کلثوم...... خدا کے لیے نہیں۔" انہوں نے ممانی کو روکنے کی کوشش کی۔ کہاں شہزاد کی دھان پان والدہ، کہاں گرانڈیل ممانی۔ وہ اپنی کوشش میں ناکام نظر آئیں۔ اچانک شہزاد نے محسوس کیا کہ اس کی والدہ لڑکھڑا گئی ہیں۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے انہوں نے ممانی کی آستین کا سہارا لیا۔ "امی جان۔" شہزاد چلایا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے والدہ کو سنبھالا مگر وہ اس کے ہاتھوں میں لٹکتی چلی گئیں۔ ان کا رنگ ہلدی جیسا ہو رہا تھا۔

"لے پکڑ مر رہی ہے۔ مر رہی ہے بچا پاگلی۔" ممانی کلثوم نے ہرزہ سرائی کی۔

شہزاد والدہ کو بازوؤں میں اٹھا کر چارپائی پر لایا۔ عائشہ پانی لینے کے لیے دوڑی۔ والدہ کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ یہ ہارٹ اٹیک تھا۔ شہزاد ان کو ابتدائی طبی امداد دینے لگا۔ وہ مخصوص انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے سینے کو دل کے مقام پر پمپ کرنے لگا۔ عائشہ پانی کے چھینٹے دینے لگی۔ کچھ دیر بعد والدہ کی پلکوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ تاہم ان کی سانس مسلسل غیر ہموار تھی۔ جس وقت دونوں بہن بھائی والدہ کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے، ممانی کلثوم خاموشی سے کھسک گئی تھیں۔

والدہ کی طبیعت میں ذرا سی بہتری تو آئی تھی لیکن انہیں فوری طور پہ اسپتال لے جانے کی ضرورت تھی۔

شہزاد نے تین چار منٹ کے اندر ٹیکسی کا انتظام کیا اور انہیں لے گیا۔ چار روز بعد اسپتال کے سی سی یو میں ہی والدہ کی طبیعت ایک دم پھر بگڑی اور اس سے پہلے کہ ان کے لیے کچھ کیا جا سکتا وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے سر پہ سہرا دیکھنے کی حسرت لیے وہ منوں مٹی کے نیچے جا سوئیں۔

یہ بڑا جانکاہ صدمہ تھا۔ شہزاد کی والدہ بیمار تو پہلے سے تھیں لیکن ان کی فوری موت کا سبب وہ شدید "ٹینشن" ہی تھی جو ممانی کلثوم کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اپنی پیاری ماں کے ساتھ شہزاد کی وابستگی غیر معمولی تھی۔ وہ تین چار ماہ تک اس واقعے کے صدمے سے نکل نہیں سکا تھا۔ اس المناک واقعے کے سبب بڑے ماموں جہانگیر کے رویے میں بھی انیس بیس کی تبدیلی واقع ہوئی۔ بڑی ممانی کا جھکاؤ بھی سجاد والے رشتے کی طرف نہیں تھا اور نجمہ تو ظاہر ہے کہ اس رشتے کے حق میں ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ اس رشتے کا دکھ ہی تو تھا جو اسے دھوپ میں رکھی برف کی طرح پگھلا رہا تھا۔ اب اس سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ گڈو اس کی سہیلی نہیں تھی بلکہ آستین کا سانپ تھی...... نجمہ کے ساتھ اس کی "گہری دوستی" کے پیچھے ممانی کلثوم اور ان کی بیٹی مہروز کا ہاتھ تھا۔ وہ بڑے غیر محسوس طریقے سے گڈو کے ذریعے نجمہ پر نگاہ رکھتی رہی تھیں اور یہ کوئی دو چار دن کی بات نہیں تھی۔ قریباً تین چار سال سے یہ چکر چل رہا تھا۔ اب گڈو کے ساتھ وہ بالکل قطع تعلق کر چکی تھی۔ بظاہر یوں لگ رہا تھا کہ سجاد کے ساتھ نجمہ کے رشتے کا معاملہ بھی کچھ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ گھریلو معاملات پر موت بھی کسی نہ کسی صورت میں اثرانداز ضرور ہوتی ہیں۔ بڑی ممانی بھی اپنے خاوند پر اثرانداز ہو رہی تھیں۔ خاندان میں کچھ ایسی باتیں بھی کہی سنی جا رہی تھیں کہ شادیوں میں بچیوں کی خوشی مقدم رکھنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

کسی وقت شہزاد کے سینے میں آس کی مدھم سی لو جاگ اٹھتی تھی۔ وہ سوچتا تھا، شاید کسی طور حالات ان دونوں کے لیے تبدیل ہو جائیں۔ سجاد اور شارق نے پارٹنرشپ میں دکان کی تھی لیکن اس کام میں انہیں متوقع کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ شارق نے گوجرانوالہ میں عینکوں کے فریم بنانے کا کارخانہ لگا لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ رات کو بھی واپس نہیں آتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں نجمہ بھی کچھ سکھ کا سانس لے رہی تھی۔

ایک دن شہزاد نے ہمت کر کے ماموں جہانگیر کے گھر فون کیا۔ بڑی ممانی نے فون اٹھایا۔ شہزاد کا حال چال پوچھا۔ شہزاد کچھ دیر تک معمولی باتیں کرتا رہا پھر اس نے دبے دبے لہجے میں ممانی سے کہا کہ وہ نجمہ کی بات اس سے کرا دیں۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد ممانی نے ہامی بھر لی۔ کچھ ہی دیر بعد شہزاد نے ریسیور پر نجمہ کی بھولی بسری آواز سنی۔ آج اس کی آواز میں بھی شہزاد کو امید کی مدھم لہریں محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ چچی کلثوم کا ان کے ہاں آنا جانا اب بہت کم ہو گیا ہے۔ وہ اپنے کیے پہ شرمندہ ہیں۔ نجمہ نے کہا۔ "چند دن پہلے چھوٹے چچا نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اس عورت کی وجہ سے ہماری بہن کی جان گئی ہے۔"

شہزاد نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی ہے نجمہ! رشتے کے معاملے میں ممانی اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہیں۔ اگر وہ چپ ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ چھوٹے ماموں کی طرح ماموں جہانگیر کو بھی اپنا مخالف کرنا نہیں چاہتیں۔ تھوڑا سا وقت مزید گزر گیا تو وہ پھر سے حالات کو اپنی مٹھی میں کر لیں گی۔"

"ویسے شہزاد! امی اپنی سی کوشش تو کر رہی ہیں۔ دعا کریں کہ ان کی کوشش کا کوئی اچھا نتیجہ نکل آئے۔ میں آپ کے لیے بڑی دکھی رہتی ہوں شہزاد۔ عائشہ کا بھی دھیان رہتا ہے، میں آپ بہن بھائی کا غم بڑی شدت سے محسوس کرتی ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ آپ دونوں کی دل جوئی کے لیے اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں لیکن کچھ بس نہیں چلتا آپ بھی مجھے معاف کر دینا۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی اصل قصوروار تو میں ہی ہوں۔"

"کوئی قصوروار نہیں ہے سونم اور مجھے پوری امید ہے کہ ہم نے حوصلہ نہ چھوڑا تو ہمارے لیے کوئی اچھا راستہ نکل آئے گا۔"

"لو جی، ایک اچھا راستہ تو نکل آیا ہے۔" نجمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا؟"

"فاخرہ آ گئی ہے۔"

فاخرہ سب سے چھوٹے ماموں کی وہی بیٹی تھی جو پاؤں سے معذور تھی۔ خاندان میں سب اسے بڑا پیار کرتے تھے۔ فاخرہ پیدائشی ایسی نہیں تھی۔ وہ سات آٹھ سال کی تھی جب سڑک پر اس کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ اس حادثے کے سبب نہ صرف اس کی ٹانگ کی ہڈی بری طرح ٹوٹ گئی بلکہ کمر کو بھی سنگین چوٹ آئی۔ کمر کی یہی چوٹ تھی جس نے کم عمری میں ہی اس کی دونوں ٹانگوں کو متاثر کر دیا تھا۔ یہ نیم مفلوج ٹانگیں پوری طرح نشوونما بھی نہ پا سکیں۔ فاخرہ درمیانی شکل صورت کی لڑکی تھی۔ اگر وہ ٹھیک رہتی تو یقیناً کسی نہ کسی کا گھر بساتی

اور ایک نارمل زندگی گزارتی، لیکن اس حادثے نے اس کے جسم کو ہی نہیں زندگی کو بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ویسے وہ خوش گفتار تھی۔ اس نے جیسے تیسے ''بی ایس سی'' بھی کر لیا تھا۔ وہ خاندان کے تقریباً سب ہی افراد کی طرح شہزاد اور نجمہ کی محبت کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی تھی...... اور وہ ان دونوں کی زبردست خیرخواہ بھی تھی۔

وہ سیدھی ٹیلی فون پر آئی اور علیک سلیک کے بعد بولی۔ ''شہزاد بھائی! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میں برادری کے سارے لڑکے لڑکیوں کی ایک یونین بنا رہی ہوں۔ یونین کے سارے لوگ...... نہیں...... نہیں آدھے لوگ ماموں جہانگیر کے اس عالیشان گھر کے سامنے دھرنا دیں گے اور مل کر گانا گائیں گے...... چاندی کی دیوار کو توڑ دو...... پیار بھرا دل نہ توڑو اور جب تک ماموں آپ کے اور نجمہ کے رشتے کے لیے مان نہیں جاتے یہ سارے لوگ اپنی جگہ ڈٹے رہیں گے۔ بھنے ہوئے چنے کھا کر ٹھنڈا پانی پیتے رہیں گے لیکن اپنی جگہ سے اٹھیں گے نہیں۔''

''اچھا آئیڈیا ہے۔'' شہزاد نے کہا۔ ''لیکن پہلے تم نے یونین کے سارے ممبر کہا پھر ممبر آدھے کر دیے۔ باقی آدھے ممبر کیا کریں گے؟''

''وہ ممانی کلثوم کے دروازے کے سامنے دھرنا دیں گے، یہ لوگ گانا گائیں گے، جھوٹ بولے، کوا کاٹے، کالے کوے سے ڈریو۔''

''تم اگر یونین بنانے کے بجائے صرف سچے دل سے دعا کر دو تو سارا کام ہو جائے گا۔''

''دعا کے ساتھ ساتھ دوا بھی ضروری ہوتی ہے۔'' وہ ہنسی۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہارے لیے بھی دعا کے ساتھ ساتھ دوا کرنی پڑے گی۔'' شہزاد نے کہا۔

''کس سلسلے میں؟''

''تمہاری شادی کے سلسلے میں۔''

ایسی باتوں پر لڑکیاں شرما جاتی ہیں لیکن فاخرہ شرمایا نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے لیے ایک دم بے رحم سی ہو جاتی تھی اور کوئی الٹا سیدھا جواب دے دیتی تھی۔ اس بار بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ ہنس کر بولی۔ ''میری شادی ہو چکی ہے شہزاد بھائی۔''

''اوہو، بڑی چوری ہو تم۔ مجھے بتایا ہی نہیں۔ کب ہوئی شادی اور کس سے؟''

''ان سے۔'' فاخرہ نے کہا اور اپنی لکڑی کی بیساکھیوں کو آپس میں ٹکرا کر شہزاد کو ان کی آواز سنائی۔

''بڑے افسوس کی بات ہے فاخرہ۔'' شہزاد نے رنجیدہ ہو کر کہا...... شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اسی دوران میں ماموں جہانگیر کی گاڑی کا ہارن سنائی دے گیا۔

نجمہ نے جلدی سے ریسیور فاخرہ کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا شہزاد، ابا جان آگئے ہیں۔ خدا حافظ۔''

☆☆☆

بے شک حالات میں مثبت تبدیلی آئی تھی۔ بڑے ماموں ایک دو دفعہ ممانی کے ہمراہ شہزاد کے گھر بھی آئے۔ ایک دفعہ اسے موٹر سائیکل کی مبارکباد دینے۔ دوسری مرتبہ ملازمت کی مبارکباد دینے۔ شہزاد کو ڈپلوما حاصل کرنے سے پہلے ہی ایک معروف ایڈورٹائزنگ کمپنی میں بڑی اچھی جاب مل گئی تھی۔ اس سب کے باوجود ایک ڈر سا شہزاد کے دل میں بیٹھا رہتا اور یہ ڈر کلثوم ممانی کی طرف سے تھا اور کسی حد تک شارق کی طرف سے بھی۔

...... قریباً دو ماہ اسی طرح گزرے اور پھر ایک روز وہ ہو گیا جس کا ڈر کسی آسیب کی طرح شہزاد کے دل میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس روز شہزاد اور عائشہ اپنے سب سے چھوٹے ماموں انو کے گھر گئے ہوئے تھے۔ ماموں انو کی بیٹی فاخرہ کی سالگرہ تھی۔ وہ بے چاری 29 فروری کو پیدا ہوئی تھی، اس لیے اس کی سالگرہ چار سال بعد آتی تھی، اس لیے ذرا اہتمام سے بھی منائی جاتی تھی۔ اس حوالے سے فاخرہ کہا کرتی تھی۔ ''میری تقدیر لکھتے ہوئے اوپر والے کے قلم میں شاید تھوڑی سیاہی رہ گئی تھی۔ اس لیے خوشیوں کے خانے میں اس نے سب کچھ تھوڑا تھوڑا لکھا۔ تھوڑا سا دادی کا پیار، اس لیے دادو جلدی دنیا سے چلی گئیں، تھوڑا سا کھیل کود، اس لیے ٹانگیں چھن گئیں، تھوڑا سا بناؤ سنگار اس لیے چہرہ بگڑ گیا، تھوڑی سی ہیپی برتھ ڈے اس لیے 29 فروری کو پیدا کر دیا۔''

بہرحال جو کچھ بھی تھا، ایک بات سے فاخرہ انکار نہیں کر سکتی تھی، اپنی تمام تر جسمانی خامیوں کے باوجود وہ ہر دلعزیز تھی، سب اس سے پیار کرتے تھے۔ ممکن ہے اس پیار کی گہرائی میں کہیں ترحم کا جذبہ بھی شامل ہو۔

سالگرہ کی اس تقریب میں دونوں بڑے ماموں اور ان کی فیملیز بھی شامل تھیں۔ نجمہ بھی آئی ہوئی تھی۔ بڑے ماموں ممانی شہزاد کے ساتھ بڑے اچھے طریقے سے ملے۔ بڑے ماموں نے شہزاد کو باقاعدہ گھر آنے کی دعوت بھی دی۔ عائشہ اور نجمہ بھی گھل مل کر باتیں کرتی رہیں۔ شہزاد جانتا تھا کہ ممانی کلثوم کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہوں گے۔

بہرحال ظاہری طور پر ممانی کلثوم نے خود کو سنبھالے رکھا۔ آگے بڑھ کر عائشہ اور شہزاد کے سر پر پیار دیا اور دو چار باتیں بھی کیں۔ یہیں اس تقریب میں شہزاد کو ایک اور شناسا چہرہ بھی نظر آیا۔ یہ جانی بے بے تھیں۔ جانی بے بے کی عمر ستر سال سے اوپر تھی۔ وہ رشتے دار تو نہیں تھیں لیکن اس خاندان کے ساتھ ایک عرصے سے تعلق تھا۔ اس لیے رشتے داروں ہی کی طرح سمجھی جاتی تھیں۔ عرصہ ہوا اپنے شوہر سے ان کی علیحدگی ہو گئی تھی، وہ اپنے ایک نواسے کے ساتھ رہتی تھیں۔ اٹھارہ بیس سال پہلے شہزاد کے تینوں ماموں اور اس کی والدہ وغیرہ اپنے بزرگوں کے ساتھ نارووال کے ایک گاؤں میں رہائش رکھتے تھے۔ یہ جانی بے بے وہاں ان کی پڑوسن تھیں، اب یہ سب لوگ لاہور میں آباد ہو چکے تھے تاہم جانی بے بے کبھی کبھی ان سے ملنے آجاتی تھیں۔

جانی بے بے نے شہزاد کے سر پر بھی دونوں ہاتھوں سے پیار دیا۔ پھر شہزاد کی والدہ کی موت پر گہرے افسوس کا اظہار کیا اور دو چار آنسو بھی بہائے۔ نجانے کیوں شہزاد کو جانی بے بے کی یہ بے وقت آہ کچھ کھٹکی۔

ایک گھنٹے کے بعد کھانا کھایا گیا۔ پھر سب گپ شپ اور اٹکھیلیوں میں مصروف ہو گئے۔ لان میں ٹیوب لائٹس کی روشنی میں بیڈمنٹن کھیلا جانے لگا۔ شہزاد خاموشی سے چھت پر چلا گیا۔ اس کے دل میں یہ آس موجود تھی کہ شاید نجمہ بھی موقع دیکھ کر اوپر چلی آئے اور اس سے ایک دو باتیں ہو سکیں۔ آج وہ فیروزی رنگ کے کامدار سوٹ میں اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اسے قریب سے دیکھنے کے لیے شہزاد کا دل مچل مچل جا رہا تھا۔ وہ فاصلے پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے بس دو چار لفظوں کا تبادلہ بھی کر لیتے تو یہ شہزاد کے لیے بڑی بات ہوتی۔

نجمہ تو اوپر نہیں آئی، تاہم نجمہ کی امی (بڑی ممانی) اسے ڈھونڈتی ہوئی اوپر آ گئیں۔ ان کے ہاتھ میں آئس کریم کا کپ تھا۔ انہوں نے شہزاد کو آواز دی۔ ''کہاں ہو شہزاد بیٹا؟''

''یہاں ہوں مامی جی۔'' شہزاد نے چھت کے ایک نیم تاریک گوشے سے انہیں جواب دیا۔

''سب تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، لو یہ آئس کریم...... گرم ہو جائے گی۔''

شہزاد نے شکریے کے ساتھ کپ ممانی کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ شاید نجمہ نے ہی والدہ کو اوپر بھیجا ہے، اس نے شہزاد کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شہزاد اور ممانی تب تک رسمی باتیں کرتے رہے۔ شہزاد نے دبے لفظوں میں نجمہ کا ذکر بھی کیا۔ ممانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں شہزاد۔ مجھے سب پتا ہے میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہی ہوں۔ باقی ہونا وہی ہے جو اللہ سوہنے کو منظور ہوگا اور مجھے امید ہے کہ اللہ اچھا ہی کرے گا۔''

اسی دوران میں سیڑھیوں پر قدموں کی چاپیں سنائی دیں۔ ممانی زینب شہزاد کے ہاتھ سے خالی کپ لیتی ہوئی نیچے چلی گئیں۔ کئی بچے دھما چوکڑی مچاتے ہوئے اوپر آگئے۔ وہ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ بچوں کی اپنی ہی دنیا ہوتی ہے۔ تقریبات کے دوران میں وہ اپنا کھیل کود کا علیحدہ ہی ماحول بنا لیتے ہیں، ان کی بھاگ دوڑ دیکھ کر شہزاد کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد آگیا۔ کتنے سہانے دن تھے وہ۔ جب بھی وہ اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ بہاولپور سے یہاں آتا تھا۔ اسی طرح ممیرے اور چچیرے بھائی بہن مل کر اودھم مچایا کرتے تھے۔ اپنے دیہاتی رہن سہن کی وجہ سے شہزاد باقی بہن بھائیوں سے مختلف تھا اور بھاگ دوڑ میں بھی آگے تھا۔ اسی لیے وہ اکثر کھیلوں میں جیت جایا کرتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا، اس کی جیت پر نجمہ دل ہی دل میں خوش ہوا کرتی تھی اور دوسرے اس سے جلتے تھے۔ ایسے کھیل جن میں ٹولیاں بنا کر کھیلا جاتا، نجمہ اسی ٹولی میں شامل ہونا پسند کرتی تھی جس میں شہزاد ہوتا تھا اور دھیرے دھیرے جیسے غیر شعوری طور پر سب کے ذہن میں یہ بات طے ہو گئی تھی کہ نجمہ اسی ٹولی میں شامل ہوگی جس میں شہزاد ہوگا۔ بہرحال وہ بالکل بچپن کا زمانہ تھا۔ اس عمر میں باہم کھیلنے والے بچوں کے ذہن اس قابل نہیں ہوتے کہ ایسی باتوں کو کسی خاص تناظر میں دیکھ سکیں۔

نیچے سے ہائے ہاؤ کا شور مسلسل بلند ہو رہا تھا۔ شہزاد واپس نیچے چلا گیا۔ کچھ مہمان واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کچھ ابھی گپ شپ میں مصروف تھے۔ لڑکے لڑکیوں نے جانی بے بے کو گھیرا ہوا تھا اور اس سے ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔ نجمہ بھی وہیں موجود تھی۔ جانی بے بے نے ایک نظر نجمہ کو دیکھا پھر شہزاد سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''وے شہزادا! ادھر آ۔ مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی ہے۔ آ تجھے تیری خالہ سے ملواؤں۔''

''کون سی خالہ جانی بے بے۔'' شہزاد نے جانی بے بے کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ذرا تو خود اندازہ لگا۔ یہاں کون سی ہے تیری خالہ؟''

شہزاد نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ چاروں طرف

لڑکے لڑکیاں ہی تھے۔ بس ایک ادھیڑ عمر ملازمہ شریفاں قالین پر بیٹھی تھی۔

”مجھے تو کچھ پتا نہیں چلا۔ تم ہی بتاؤ۔“ شہزاد نے ناکامی کا اعتراف کیا۔

جانی بے بے نے اپنا بازو لمبا کر کے نجمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ”یہ جو نجمہ ہے ناں، یہ تیری خالہ بھی ہے۔“

”ہائیں۔“ ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں، سب جانی بے بے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

جانی بے بے نے کہا۔ ”ہاں بھئی مذاق نہیں ہے، میں چشم دید گواہ ہوں اس کی۔“

”چشم دید گواہ۔“ میرو نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ مزہ لینے والے انداز میں بولی۔ ”دراصل نجمہ نے اپنی دادی اللہ بخشے جنت بی بی کا دودھ پیا ہوا ہے۔ جب یہ بالکل چھوٹی تھی ناں تو بالکل گڑیا کی طرح ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں اس کی امی زینب بی بی کو موتی بخار ہوا جو تین چار مہینے چلا۔ اس کا دودھ بھی سوکھ گیا۔ یہ بے چاری چارپائی پر پڑی روتی رہتی تھی۔ اس زمانے میں چوسنیاں شوسنیاں کہاں ہوتی تھیں اور چھوٹے دیہاتیوں میں تو رواج بالکل ہی نہیں تھا۔ جب یہ نجمہ رونی کرلاتی تھی تو اس کی دادی اسے اپنا دودھ پلا دیتی تھی۔ ماشاءاللہ پکی عمر میں بھی صحت مند تھیں جنت بی بی...... تو ذرا سوچو اب اس حساب سے یہ نجمہ تم میں سے کسی ایک کی خالہ اور کسی ایک کی پھوپو ہو گئی ناں۔“

”خالہ...... پھوپی؟“ کئی حیرت زدہ آوازیں ابھریں۔

جانی بے بے نے تسلی کے ساتھ اور ٹھہر ٹھہر کر سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو ناں بچو، اب شہزاد کو ہی لو۔ جس عورت کا دودھ شہزاد کی ماں خدیجہ نے پیا، اسی عورت کا دودھ نجمہ نے بھی پی لیا۔ اب اس حساب سے شہزاد کی ماں اور نجمہ دودھ شریک بہنیں ہو گئیں، ہو گئیں ناں؟ جب نجمہ اور شہزاد کی ماں بہنیں ہیں تو پھر نجمہ شہزاد کی خالہ ہی لگی ناں......“

اس گفتگو کے دوران میں ممانی کلثوم اور چھوٹی ممانی بھی پاس آ کھڑی ہوئی تھیں، ممانی کلثوم نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں بھئی...... ویسے یہ بات تو ہم نے بھی سنی ہوئی ہے کہ نجمہ نے دادی کا دودھ پیا تھا۔“

”دودھ پینے سے کیا ہو جاتا ہے۔“ فاخرہ نے کہا۔

”ہو کیوں نہیں جاتا جی۔“ جانی بے بے ذرا چمک کر بولی۔ ”کسی عالم فاضل سے پوچھ کر دیکھو، وہ سب کچھ بتائے گا۔“

”ہاں، یہ ویسے ہے تو پوچھنے والا مسئلہ۔“ ممانی کلثوم نے کہا۔

جانی بے بے، ایسا ہی ایک گاؤں کا واقعہ سنانے لگی۔ جس میں دودھ کی شراکت کا مسئلہ کھڑا ہوا تھا اور پنچایت نے ایک بڑے مفتی صاحب کے ساتھ مشورہ کر کے لمبا چوڑا فیصلہ دیا تھا۔

شہزاد کے سینے میں بے چینی کی عجیب سی لہریں پیدا ہونے لگیں۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ بہرحال وہاں ہونے والی گفتگو جاری رہی۔

اگلے روز شہزاد کو پتا چلا کہ جانی بے بے نے جو شوشا چھوڑا ہے اسے زبردست پذیرائی مل گئی ہے۔ اب ہر طرف دودھ میں شراکت والی بات ہو رہی تھی۔ ماموں جہانگیر جیسے بھی تھے لیکن مذہبی ذہن رکھتے تھے اور ایسے معاملات میں بڑے کٹر تھے۔ ان کی طبع کی عام تختی بھی اس کٹرپن کو بڑھاتی تھی۔ بعدازاں شہزاد کو پتا چلا کہ یہ دودھ میں شراکت والا معاملہ واقعی توجہ طلب بھی ہے۔

اگلے آٹھ دس روز میں ماموں جہانگیر صاحب نے کئی علما اور مفتی حضرات سے مشورہ کیا۔ اسی سلسلے میں وہ ایک دو روز لاہور سے باہر بھی رہے۔ انہی دنوں میں شہزاد نے فون پر بڑی ممانی سے بات بھی کی۔ وہ بھی پریشان تھیں۔ انہوں نے آزردہ لہجے میں کہا۔ ”شہزاد! پتا نہیں تم دونوں کی قسمت میں کیا لکھا ہے، مجھے تو لگتا تھا کہ حالات بہتری کی طرف جا رہے ہیں مگر اب یہ نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے، تمہارے ماموں بھی پریشان ہیں۔“

شہزاد نے کہا۔ ”مامی جی، مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب بھی مامی کلثوم کا ہی کیا دھرا ہے، جب انہوں نے دیکھا ہے کہ بازی پلٹ رہی ہے تو جانی بے بے کو یہاں لا کر یہ بات اڑا دی ہے۔“

”ہاں اس بات کا تو مجھے بھی پتا چلا ہے کہ جانی بے بے کو یہاں بلانے والی کلثوم ہی ہے لیکن جو کچھ بھی ہے شہزاد مسئلہ تو اپنی جگہ موجود ہے ناں۔ یہ بات سچ ہے کہ نجمہ کی پیدائش کے بعد مجھے ٹائیفائیڈ ہوا تھا اور ان دنوں نجمہ کی دادی اسے کبھی کبھی چھاتی سے لگا لیا کرتی تھیں۔ اس وقت دیہات میں اکثر عورتیں ایسا کر لیا کرتی تھیں۔ کوئی بھی اس بات کی گہرائی میں نہیں جاتا تھا۔“

”لیکن...... اگر...... مامی جی میرا مطلب ہے۔“ شہزاد گڑبڑا کر رہ گیا۔ موضوع ایسا تھا کہ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

پریشانی کے عالم میں وہ خود بھی ایک دو مفتی صاحبان کے پاس پہنچا۔ اپنی مسجد کے ”صاحب علم“ امام صاحب سے بھی اس نے تفصیلی گفتگو کی۔ جو پتا چل رہا تھا، وہ یہ تھا کہ اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آئے اور دودھ پلانے والی عورت کا دودھ جاری بھی ہو جائے تو پھر شرعی احکام لاگو ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس میں ابہام کے مواقع موجود تھے اور شک کے فائدے کی بات بھی کی جا سکتی تھی لیکن یہاں صورت حال نے عجیب رخ اختیار کر لیا۔ خاندان میں جو لوگ اس رشتے کے خلاف تھے ان کے ہاتھ ایک اچھا موضوع اور ایک زبردست دلیل آ گئی تھی۔

صرف تین ہفتے کی قلیل مدت میں سب کچھ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ نجمہ اور شہزاد کے لیے امید کی جو روشن کرنیں نمودار ہوئی تھیں وہ ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بدلیں کہ روشنی کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہا اور یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ شہزاد بھونچکا رہ گیا۔ عائشہ پر بھی اس واقعے کا بہت اثر ہوا۔ شہزاد کے والد صاحب کئی روز بیمار رہے۔

اب شہزاد گلہ کرتا تو کس سے؟ زمین تو تھی ہی بے رحم، آسمان نے بھی ساتھ نہیں دیا تھا۔ شاید قدرت کو ان کا ملاپ منظور ہی نہیں تھا۔ ماموں جہانگیر نے بھی اپنی طرف سے حتمی فیصلہ اپنے گھر والوں کو سنا دیا تھا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی...... انہی دنوں مامی کلثوم نے پھر ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ شہزاد کی والدہ کی وفات والے واقعے کے بعد ماموں جہانگیر مامی کلثوم سے کچھ دور ہو گئے تھے۔ اب مامی کلثوم نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس فاصلے کو کم کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ماموں جہانگیر سے معافی وغیرہ بھی مانگی اور آنسو بہا کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش بھی کی...... مامی کلثوم اور شارق وغیرہ کے ساتھ ساتھ وہ سارے دوسرے کردار بھی پھر سے متحرک ہو گئے جو سجاد اور نجمہ کی شادی کے حق میں تھے۔ سجاد چونکہ منجھلے ماموں طفیل کا لے پالک تھا اس لیے اس پر وہ ”دودھ کی شراکت“ والی صورت حال لاگو نہیں ہوتی تھی (وہ لے پالک نہ ہوتا تو پھر نجمہ اس کی پھوپی کہلاتی)

رشتوں کا یہ الٹ پھیر اور معاملات کا گمبھیرپن شہزاد کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ بس یہ جانتا تھا کہ وہ نجمہ سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔ نجمہ اس سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔ ماموں جہانگیر اب یہ باب بالکل بند کر چکے تھے اور وہ اس حوالے سے کسی کی کوئی بات بھی سننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔

اس دوران میں خاندان کے ہی کسی فرد نے ماموں جہانگیر کو بتایا کہ ان کے گھر میں اب بھی کبھی کبھی شہزاد کا فون آتا ہے۔ ماموں اس پر بہت تپ پا ہوئے۔ وہ ایک روز رات کو شہزاد کے گھر آ پہنچے۔ کال بیل پر شہزاد باہر آیا تو وہ واپس اپنی نئے ماڈل کی ہنڈا گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

”جی ماموں۔“ شہزاد نے ادب سے کہا۔

وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے رکھائی سے بولے۔ ”شہزاد، تم میری مرحوم بہن کی نشانی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے لیکن تم جس طرح کے کام کر رہے ہو وہ تمہیں ضرور خوار کریں گے۔“

”تم...... میں نے کیا کیا ہے ماموں؟“

”تم نے کچھ نہیں کیا، میں ہی الو کا پٹھا ہوں، مجھے ہی کچھ نظر نہیں آتا ہے۔“ وہ حسب عادت گرجے اور گرجتے چلے گئے۔

انہوں نے صاف لفظوں میں شہزاد سے کہا کہ کچھ دنوں تک نجمہ کی شادی ہونے والی ہے۔ اب نجمہ سے اور اس گھر سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ پھر ان کی گاڑی پھنکارتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

دودھ کی شراکت والا معاملہ اتنی تیزی سے ابھرا اور کچھ لوگوں کی وجہ سے اتنی تیزی کے ساتھ پھیلا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کچھ ہی عرصے میں خاندان کے سارے بزرگ اس امر پر متفق تھے کہ نجمہ اور شہزاد کا رشتہ کسی صورت نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف نجمہ اور سجاد کے رشتے میں جو تھوڑی بہت رکاوٹیں پیدا ہوئی تھیں وہ جلد ہی دور کر لی گئیں۔ ان کی منگنی تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ چند ہفتوں بعد ان کی شادی کے دن بھی طے کر لیے گئے۔ حالات بتا رہے تھے کہ بالآخر ممانی کلثوم جیت گئی ہیں...... اور پھر وہ دن قریب پہنچ گیا جس سے بچنے کے لیے شہزاد نے ہزار جتن کیے تھے۔ وہ راتوں کو خون کے آنسو رویا تھا۔ دنوں میں دیوانوں کی طرح بے قرار پھرتا تھا اور ان گنت پل کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزار دیے تھے۔ جوں جوں نجمہ کی شادی کا دن قریب آ رہا تھا شہزاد کے سینے میں دھواں سا بھرتا جا رہا تھا۔ کسی وقت تو اسے لگتا تھا کہ اس کا دم گھٹ جائے گا اور دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ شادی میں آٹھ دس روز باقی رہ گئے تھے جب شہزاد نے سوچا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے کہیں دور نکل جائے۔ تب لوٹے جب یہ سب کچھ انجام پا چکا ہو، بلکہ اس کی بہن عائشہ بھی یہی سوچ رہی تھی۔ بھائی کے گمبھیر دکھ نے اسے بھی ہلکان کر دیا تھا۔ وہ بھی کچھ دنوں کے لیے فرار چاہتی تھی مگر انہی دنوں میں ان

کے ابانی پھر بیمار پڑ گئے، ان کے لیے کہیں بھی جانا ممکن نہیں رہا۔

پتا نہیں کیوں شہزاد کا دل کہتا تھا کہ شادی سے پہلے کم از کم ایک بار نجمہ کے ساتھ اس کی ملاقات ضرور ہوگی۔ کیسے ہوگی؟ کب ہوگی؟ اسے یہ بھی پتا نہیں تھا۔ شاید وہ کوئی خط بھیجے گی جس میں اس سے ہمیشہ کے لیے اجازت چاہی جائے گی یا کوئی ٹیلی فون، یا کوئی پیغام۔ کسی وقت شہزاد کا دل چاہتا کہ وہ خود ماموں کے گھر فون کرے۔ ممانی سے کہے کہ وہ آخری بار اسے نجمہ سے بات کرنے دیں۔ آنسوؤں کی بارش میں اسے الوداع کہہ لینے دیں۔ بہرحال وہ کوشش کے باوجود اس کی ہمت نہیں کر سکا۔

انہونیوں کی خواہش کس کے دل میں نہیں ہوتی۔ شہزاد کے دل میں بھی تھی۔ شاید یہ وہی امید تھی جو پھانسی پانے والے بدنصیب قیدی کے دل میں اس وقت تک موجود رہتی ہے جب تک تختہ اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل نہیں جاتا۔

بچپن کی محبت اس سے جدا ہو رہی تھی۔ وہ تعلق جو شہزاد کے ساتھ ہی پل بڑھ کر پروان چڑھا تھا۔ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ رہا تھا۔ انسان جو کہتا اور سنتا ہے وہ زندگی بھر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ کچھ صدائیں شب و روز شہزاد کا بھی پیچھا کرتی تھیں...... اور بے شک ان میں نجمہ کی ایک صدا بھی شامل تھی، اس کے ایک جملے کی بازگشت اکثر اس کے کانوں میں رہتی تھی۔

''آپ کو میرے پیار کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ کبھی موقع آیا تو بتادوں گی......''

ہاں نجمہ نے یہ کہا تھا اور اب موقع بھی آیا تھا لیکن وہ کچھ کر نہیں سکی تھی اور وہ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ شہزاد کو اس سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک مشرقی لڑکی کی حدود کیا ہیں۔ وہ کہاں تک پھڑپھڑا سکتی ہے۔

اور پھر ایک شام...... تختہ شہزاد کے پاؤں کے نیچے سے نکل گیا۔ اس کی محبت کی لاش اندھے کنویں میں لٹک گئی۔ شہنائیوں کی گونج میں وہ سجاد کی دلہن بن گئی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ قسمت میں ناکامیاں ہوں تو حالات کی کروٹ بھی کچھ بدل نہیں سکتی۔ حالات کی کروٹ نے نجمہ اور شہزاد کے لیے آس امید کے چند دیے روشن کیے تھے مگر تقدیر کی تیز ہوا نے انہیں پھر سے گل کر دیا تھا اور اس مرتبہ اندھیرا اتنا گھٹا ٹوپ تھا کہ شہزاد کو اپنا آپ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اس رات شہزاد نے نجمہ کی ساری نشانیاں جلا دی تھیں اور صبح کو والدہ کی قبر پر جا کر دیر تک روتا رہا تھا۔ جیسے ایک بچہ اپنی ماں کو اپنا دکھ بتاتا ہے، اس سے لپٹ کر آنسو بہاتا ہے۔

شہزاد کے گھر میں سے کوئی بھی شادی پر نہیں گیا تھا۔ ماموں ممانی نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ ایک طرح سے اس شادی کے بعد دونوں گھرانوں میں تعلق بالکل ختم ہو گیا تھا۔ ممانی کلثوم جیت گئی تھیں، شہزاد ہار گیا تھا۔ یہ ایک قطعی بے جوڑ شادی تھی۔ خاندان میں بہت سے لوگ تھے جنہوں نے اس بے جوڑ شادی پر تنقید کی تھی تاہم ماموں جہانگیر کے رعب کی وجہ سے کسی کو کھلے عام بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

شادی کے آٹھ دس روز بعد شہزاد کے ایک کزن حسنات نے شہزاد کو بھی شادی کی ایک تصویر دکھائی۔ شہزاد دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر دلہن پر نگاہ پڑی تو جیسے جم کر رہ گئی۔ وہ اس کے خیالوں سے زیادہ حسین نظر آئی۔ یہ ایک ایسا حسن تھا جس کی تہ میں غم کی لامحدود تپش بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔

خاندان کے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح حسنات بھی اس شادی سے زیادہ خوش نہیں تھا۔ وہ شہزاد کا چچا زاد تھا اور خواتین کے ایک رسالے میں کام کرتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''یار شہزاد! میں یہ تصویر پرچے میں چھاپنا چاہتا ہوں۔ ساتھ میں کوئی کیپشن بھی ہونا چاہیے۔ پہلو میں حور لنگور والا فقرہ تو بڑا پرانا ہو چکا ہے، کوئی اور فقرہ ہے تمہارے ذہن میں۔''

پھر شہزاد کے چہرے کی گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ''پتا نہیں شہزاد! تمہارے ماموں صاحب کو کیا نظر آیا تھا اپنے اس بھتیجے میں۔ ٹھیک ہے کہ شادی لڑکی کی مرضی سے نہ ہوتی لیکن کم از کم ایسی جگہ تو ہوتی کہ......''

''حسنات!'' شہزاد نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اب ہمیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ......'' شہزاد کی آواز غم کے بوجھ سے بھرا گئی۔ وہ کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

اس کے بے پناہ دکھ کو محسوس کر کے حسنات کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اس نے شہزاد کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''شہزاد۔ تائی جی کے جانے کے بعد یہ گھر ویران ہو گیا ہے۔ ایک آدھ سال میں عائشہ بہن کی شادی بھی ہو جانی ہے، تب یہ ویرانی اور بڑھ جائے گی۔ اب اس بارے میں کچھ سوچو، زندگی کسی جا رکنے کا نام نہیں ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ابھی زخم تازہ ہے، شاید یہ بات تمہیں بری لگے لیکن، تمہیں بھی اب شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور کام وقت پر ہی اچھا لگتا ہے۔ تم اب ماشاءاللہ برسر روزگار ہو، اپنے پاؤں پر کھڑے ہو، جلد ہی تمہارا اپنا مکان بھی ہوگا۔ خاندان میں اور خاندان سے باہر

اچھی سے اچھی لڑکی تمہیں مل سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے تو نہیں، میں شادی کروں گا...... اور ضرور کروں گا۔'' شہزاد نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ ہوئی ناں بات۔ اب بتاؤ کوئی لڑکی نظر میں ہے یا نہیں؟''

''لڑکی...... بھی...... مل ہی جائے گی۔''

''نہیں...... نہیں۔'' حسنات نے انگلی لہرائی۔ ''تمہارے انداز سے لگتا ہے کہ کوئی ہے تمہاری نظر میں۔''

''شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''تو پھر بتاؤ۔'' وہ جوش سے بولا۔

''وقت آنے پر بتاؤں گا۔''

حسنات نے بہت اصرار کیا لیکن شہزاد نے کہا کہ اسے سرپرائز ہی رہنے دو۔ آخر وہ ہار مانتے ہوئے بولا۔ ''سرپرائز خوبصورت تو ہے ناں؟''

''ہاں بہت خوبصورت۔'' شہزاد نے عجیب انداز میں کہا۔

نجمہ کی شادی کے قریباً چھ ماہ بعد شہزاد کی شادی بھی ہو گئی۔ نجمہ کی شادی نے سب کو دل گرفتہ کیا تھا مگر شہزاد کی شادی نے پورے خاندان کو بلکہ اردگرد کے لوگوں کو بھی ششدر کر دیا۔ شہزاد کی شادی ماموں انور کی اپاہج بیٹی فاخرہ سے ہوئی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فاخرہ بھی بیاہی جائے گی۔ بے شک سب اس سے پیار کرتے تھے مگر اسے اپنانے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ خاندان کے اندر تو کجا، خاندان سے باہر بھی امید نہیں تھی کہ کوئی اس کا ہاتھ تھامے گا، لیکن شہزاد نے پورے خلوص اور بے حد اصرار کے ساتھ یہ ہاتھ تھاما تھا اور فاخرہ کو اپنا لیا تھا۔ اس حوالے سے خود فاخرہ کی ساری کوشش بھی ناکام رہی تھی اور شہزاد نے غیر متزلزل عزم کے ساتھ اپنے ارادے میں کامیابی حاصل کی تھی۔

ماضی کی یادوں کو سینے میں دفن کر کے شہزاد نے فاخرہ کے ساتھ زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ فاخرہ کو کسی محرومی اور کمی کا احساس نہ ہو۔ اس نے اسے اپنی بساط کے مطابق ہر خوشی دینے کی سعی کی لیکن کیا یادیں واقعی سینے میں دفن ہو جاتی ہیں۔ کیا انسان اپنے ماضی کو یکسر بھول سکتا ہے؟ شاید اس کا جواب نفی میں ہے۔ اپنی تمام تر کوشش اور نیک نیتی کے باوجود شہزاد ماضی کو مکمل طور پر بھلا نہیں پایا تھا۔ وہ اور نجمہ ایک ہی شہر میں رہتے تھے، ایک ہی خاندان کا حصہ تھے، زیادہ نہ سہی، کم ہی سہی لیکن ان کا آمنا

سامنا ہوتا رہتا تھا۔ ہر بار جب کوئی ایسا واقعہ ہوتا تھا۔ شہزاد کے زخموں سے کئی دن تک خون رستا رہتا تھا۔

سجاد سخت طبیعت کا مالک تھا۔ اس کے علاوہ وہ احساس کمتری کا شکار بھی رہتا تھا۔ خاص طور سے اپنی کم تعلیم کے حوالے سے اس کا یہ احساس زیادہ شدت اختیار کر جاتا تھا۔ بہرحال نجمہ نے ایک اچھی شریک حیات کی طرح خود کو شوہر کے مزاج کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس کی یہ کوشش پورے خاندان کے لیے قابل تعریف تھی۔

دوسری طرف شہزاد نے بھی اپنی شریک حیات فاخرہ کو اپنا خلوص اور بھرپور پیار دینے کی کوشش کی۔ فاخرہ جب زندگی کے دھارے میں شامل ہوئی تو اس کے ٹوٹے ہوئے حوصلے بھی بندھ گئے۔ معذور ہونے کے باوجود اس نے پورے گھر کا کام کاج کچھ اس انداز میں سنبھالا کہ شہزاد کو کسی کمی کا احساس نہ ہونے پائے۔ وہ عائشہ کی شادی کی بھرپور تیاری بھی کر رہی تھی۔

عائشہ کی شادی کے فوراً بعد شہزاد نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ اس نے لاہور کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا پروگرام بنا لیا۔ بقول شاعر...... میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا۔ اب وہ نجمہ اور نجمہ کی زندگی سے بہت دور چلے جانا چاہتا تھا۔ یہاں لاہور کی فضاؤں میں گم گشتہ صداؤں کی بازگشت تھی اور قدم قدم پر یادوں کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ چاہتا تو وہ یہ تھا کہ پاکستان سے باہر کہیں نکل جائے، لیکن ابھی اس کا انتظام نہیں ہو پا رہا تھا۔ لہٰذا وہ کراچی سدھار گیا۔ کراچی بہت وسیع شہر ہے۔ یہاں ایڈورٹائزنگ کا شعبہ بھی بڑا ''پراسنگ'' ہے۔ شہزاد کو اب ڈپلوما مل چکا تھا لیکن ڈپلوما سے بھی زیادہ اس کی خداداد صلاحیت اسے ترقی کے زینے طے کرا رہی تھی۔ کراچی میں ہی فائن آرٹ کالج میں اسے درس و تدریس کا موقع بھی مل گیا۔ اس کام نے شہزاد کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔ نہایت اعلیٰ درجے کی اسٹل فوٹوگرافی شہزاد کی پہچان بنتی جا رہی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے، شہزاد شام کو گھر واپس آیا تو اپنے کمرے میں فاخرہ بڑی خاموشی کے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ شہزاد نے عقب سے جا کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ٹانگیں کمزور ہونے کے سبب وہ قد میں بھی چھوٹی نظر آتی تھی۔ اس کا سر بمشکل شہزاد کے سینے تک آ رہا تھا۔ شہزاد نے اسے آئینے کے سامنے سے ہٹانا چاہا لیکن وہ جمی کھڑی رہی۔

''حقیقت کا سامنا نہ کرنے سے حقیقت بدل تو نہیں

جاتی۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

''حقیقت کو کیا ہوا ہے؟ اچھی بھلی تو ہے۔'' شہزاد نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

''میں بہت بری لگتی ہوں نا؟'' اس نے آہ بھری۔

''کون کہتا ہے؟ تمہارے اندر کی خوبصورتی ہر شے پر حاوی ہوگئی ہے۔ تم تو میری سوئم ہو۔'' شہزاد نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے گرم جوش لہجے میں کہا۔

''سوئم؟ یہ کیا ہوتا ہے؟'' اس نے مڑ کر شہزاد کی طرف دیکھا۔

''بس...... سوئم...... سوئم کا مطلب ہے...... سوہنا، خوبصورت۔'' شہزاد نجانے کیوں گڑبڑا سا گیا۔

''لفظ تو اچھا ہے، لیکن اچھی جگہ استعمال نہیں کیا گیا۔'' اس نے اپنا سر اداسی کے ساتھ شہزاد کے سینے سے لگا دیا۔

بعد میں شہزاد دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے منہ سے فاخرہ کے لیے بے ساختہ سوئم کا لفظ کیوں نکل گیا۔ یہ لفظ تو وہ بھی نجمہ کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ ہاں ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ماضی بھی مکمل طور پر سینے میں دفن نہیں ہوتا۔ وہ مختلف شکلوں میں سر ابھارتا ہی رہتا ہے۔ اگلے روز شہزاد نے فاخرہ کو دیکھا وہ بڑی بنی سنوری ہوئی تھی اور واقعی جب وہ بنتی سنورتی تھی تو اپنی مجروح ناک کے باوجود قبول صورت لگنے لگتی تھی۔

''آج تو غضب ڈھا رہی ہو۔'' شہزاد نے اس کے ریشمی بالوں کو چوما۔

''آپ نے سوئم جو کہا تھا۔'' وہ خوش دلی سے بولی۔

سوئم کا لفظ فاخرہ کو اچھا لگا تھا...... وہ اسے اکثر سوئم ہی کہنے لگا۔ پتا نہیں کیا بات تھی...... ''فاخرہ'' اسے ویسے بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نام میں اسے کچھ عجیب سا تناؤ محسوس ہوتا تھا۔ ان کی زندگی کی گاڑی اچھی چل رہی تھی۔ بس ایک کمی تھی۔ شادی کو دو سال بیت گئے تھے مگر ابھی تک کوئی بچہ نہیں تھا۔

دوسری طرف نجمہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ دوسرا بچہ اس کے شکم میں تھا۔ ممانی کلثوم نے آہستہ آہستہ اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ نجمہ کے ساتھ اکثر ان کی لڑائی رہتی تھی۔ وہ نجمہ کے شوہر سجاد کو بھی بھڑکاتی رہتی تھیں اور وہ تو پہلے سے ہی بھڑکا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نجمہ کو اپنی تعلیم کا گھمنڈ ہے۔ حقیقت میں وہ خود کو ہر طرح سے نجمہ سے کم تر سمجھتا تھا اور اس کا یہ احساسِ کمتری مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا رہتا تھا۔ شہزاد کے کانوں تک یہ بات بھی پہنچی تھی کہ وہ نجمہ پر ہاتھ بھی اٹھاتا ہے۔ ماموں جہانگیر اور ممانی اس صورتحال پر

پریشان تھے۔ یہاں تک کہ شارق بھی جو سجاد کا پکا یار بنا ہوا تھا۔ اب اس سے اختلاف رکھنے لگا تھا۔

اور پھر ایک روز شہزاد تک ایک روح فرسا اطلاع پہنچی۔ وہ اپنی کلاس میں لیکچر دے کر اسٹاف روم میں واپس آیا ہی تھا کہ گھر سے فاخرہ کا فون آ گیا۔ ''شہزاد، لاہور سے ایک بری خبر ہے۔''

''کیا ہوا؟'' شہزاد چونک گیا۔

''امی نے اطلاع دی ہے کہ باجی نجمہ سیڑھیوں سے گر گئی ہیں۔ انہیں کافی چوٹیں آئی ہیں، وہ اسپتال میں ہیں۔''

شہزاد کے سینے میں جیسے کوئی شے چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ اگلے بیس تیس منٹ میں اس واقعے کی مزید تفصیل کا پتا چلا۔ نجمہ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ حمل سے تھی اور آٹھ دس زینوں سے لڑھکتی ہوئی گری تھی۔ معلوم ہوا کہ سجاد نے نجمہ سے جھگڑا کیا تھا۔ گھریلو ملازمہ چھٹی پر تھی اور سجاد کی قمیص استری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ناشتا بھی نہیں کیا اور بغیر استری کی قمیص پہن کر شاپ کے لیے روانہ ہوگیا۔ نجمہ جلدی جلدی قمیص استری کر کے اس کے پیچھے چلی۔ وہ اسے آوازیں دیتی سیڑھیوں پر پہنچی تو پھسل گئی۔

نجمہ کا بچہ ضائع ہوگیا تھا۔ آپریشن کے بعد اس کی اپنی حالت بھی بگڑ گئی۔ شہزاد اور فاخرہ بائی ایئر لاہور پہنچے۔ شہزاد نے اسے ایک پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو میں دیکھا۔ وہ سفید براق بستر پر لیٹی تھی۔ اس کے منہ پر آکسیجن ماسک تھا۔ جسم نالیوں کے حصار میں تھا۔ رنگ اتنا سفید تھا کہ وہ بستر کا حصہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ فاخرہ اور شہزاد بس چند سیکنڈ کے لیے اس کے پاس کھڑے ہوئے۔ ایک دو لمحے کے لیے نجمہ کی نگاہیں اس کی نگاہوں سے ملیں۔ وہ موت کے گھیرے میں تھی تاہم اس کی ہمیشہ مسکرانے اور بولنے والی آنکھیں آج بھی بولتی محسوس ہوئیں۔ ان آنکھوں نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ''ہم ہار گئے شہزاد، لیکن ہماری محبت نہیں ہاری۔ یہ محبت زندہ رہے گی۔ اس کو زندہ رہنا ہے۔ میں روپ بدل کر آپ سے ملوں گی۔ موسموں میں اور ہواؤں میں اور نئے کھلنے والے پھولوں میں اور سورج کی روپہلی کرنوں میں......''

اور وہ مر گئی۔ سفید براق بستر پر ایک زرد مائل سفید تصویر کی طرح پڑی رہ گئی۔ اس کی ہمیشہ بولتی ہوئی آنکھوں پر سدا کے لیے پلکوں کا سایہ ہوگیا۔

☆☆☆

اب شہزاد کو ملک چھوڑنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جس کی وجہ سے ملک چھوڑنا چاہتا تھا وہ خود ہی دنیا چھوڑ گئی

تھی۔ اس کی ''الجھنوں کے راستے'' صاف کر گئی تھی۔ اس کی موت کا غم ایک مہیب دھچکے کی طرح تھا۔ شہزاد قریباً دو سال تک اس دھچکے کے شدید ارتعاش کو محسوس کرتا رہا۔ پھر اس نے خود کو اور اپنی ساری سوچوں کو اپنے کام میں غرق کر دیا۔ اس نے خود کو اتنا مصروف کر لیا کہ اس کے پاس غم زدہ ہونے کا وقت ہی نہیں رہا۔

وہ لاہور سے اور اپنے خاندان سے تقریباً کٹ کر رہ گیا تھا اور یہ دوری اس کے لیے مفید ہی تھی۔ وہ یادوں کی شدید مار سے بچا ہوا تھا۔ اس کی کم آمیزی کو بعض رشتے دار اس کے گھمنڈ سے بھی تعبیر کرتے تھے۔ خاص طور سے بڑے ماموں اور منجھلے ماموں کی فیملیاں، بہرحال شہزاد کو ان باتوں کی اب کوئی پروا نہیں تھی۔

درس و تدریس کے علاوہ شہزاد نے ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں بھی تیزی سے ترقی کی۔ پہلے وہ ایک بڑی کمپنی کا منیجر بنا پھر دو تین سال میں اس نے اپنی فرم کی بنیاد رکھ دی۔ ٹاپ کلاس کمرشل ایڈ بنانے میں شہزاد کو کمال حاصل تھا۔ اس کی بنائی ہوئی دو تین اشتہاری فلموں کو بخشش ایوارڈ بھی ملے۔ اسٹل فوٹو گرافی میں بھی وہ بے مثال تھا۔ اس کی اتاری ہوئی تصویریں بین الاقوامی جرائد میں شائع ہوئی تھیں۔

جس روز شہزاد کی ذاتی فرم کو کاسمیٹکس بنانے والی ایک بڑی کمپنی کا کنٹریکٹ ملا، اسی روز شہزاد کی 36 ویں سالگرہ بھی تھی۔ اس روز شام کو فاخرہ نے کہا۔ ''آج آپ کے لیے تین خوشیاں اکٹھی ہوگئی ہیں جناب۔''

''تین کون کون سی۔''

''آپ کو کنٹریکٹ ملا...... آپ کی سالگرہ ہے...... اور میں اسپتال گئی تھی۔''

''اسپتال گئی تھیں؟ کیا مطلب؟''

فاخرہ کے چہرے پر رنگ سا لہرایا۔ ایک دم شہزاد کی رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ اسے اپنے ارد گرد کی ہر شے مسکراتی محسوس ہوئی۔ وہ غیر یقینی نظروں سے فاخرہ کو دیکھتا چلا گیا۔ فاخرہ ایک بڑی اچھی لیڈی ڈاکٹر کے زیر علاج تھی اور پچھلے دو تین مہینوں سے ایک امید سی ان کے اندر پروان چڑھ رہی تھی۔ ''تمہارا مطلب ہے...... تمہارا مطلب ہے......''

شہزاد کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہیں کر سکا۔

فاخرہ نے ایک بار پھر شرما کر اثبات میں سر ہلایا۔

''او...... سوئم...... او سوئم...... یو آر گریٹ۔'' شہزاد نے اسے بانہوں میں اٹھا لیا۔

شادی کے تقریباً گیارہ سال بعد قدرت نے ان کی سن لی تھی۔

چند ماہ بعد شہزاد کے آنگن میں بچے کی چہکار گونجی۔ اپنے پہلے بیٹے کا نام انہوں نے عمیر رکھا۔ خوشی کے اس موقع پر ایک غم کی آمیزش یہ تھی کہ شہزاد کے والدین میں سے کوئی بھی پوتے کی صورت دیکھنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ صرف ایک سال پہلے اس کے خاموش طبع والد بھی ابدی خاموشی اختیار کر چکے تھے۔ عمیر کی پیدائش کے قریباً دو سال بعد احسن دنیا میں آیا۔ شہزاد نے زندگی میں اپنی محرومیوں کا مداوا اپنے بچوں کی محبت میں ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ بچے اور کام، بس یہی اس کی دو بنیادی دلچسپیاں تھیں۔ فاخرہ کی محبت اور توجہ کا زیادہ تر مرکز بھی اب بچے ہی تھے۔ ویسے بھی اب وہ کچھ بیمار رہنے لگی تھی۔ شہزاد کی ایک اور بچے کی خواہش بھی اسی وجہ سے پوری نہ ہوسکی۔ اس کی کمر میں درد رہتا تھا اور کبھی کبھی یہ درد اس کی ٹانگوں تک بھی چلا جاتا تھا۔ خاص طور سے ٹھنڈے موسم میں وہ زیادہ تکلیف محسوس کرتی تھی۔ شہزاد اس کے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہا تھا۔ کسی وقت وہ زیادہ بیمار ہوتی تو وہ اپنی مصروفیات ترک کر دیتا اور اس کی دیکھ بھال میں لگ جاتا۔ فاخرہ کا مسئلہ آرتھوپیڈک تھا۔ کسی حد تک رگ پٹھے بھی اس میں involve تھے۔ اس صورت حال کا تعلق اسی پرانی چوٹ سے تھا۔ کراچی کے بہترین اسپیشلسٹس سے شہزاد کا رابطہ تھا۔

اس بیماری میں اکثر وقفہ بھی آ جاتا تھا اور وہ کئی کئی ماہ ٹانگوں کے درد سے محفوظ رہتی تھی تاہم اس دوران میں بھی دواؤں کا استعمال جاری رہتا تھا۔ ایک دو بار شہزاد نے اشاروں کنایوں میں اس سے کہا تھا کہ اگر وہ اپنے چہرے کے مجروح حصے کی پلاسٹک سرجری کروانا چاہے تو وہ کسی بڑے اچھے ڈاکٹر سے رابطہ کر سکتا ہے لیکن اس معاملے میں وہ بہت حساس تھی اور بالکل مختلف سوچ رکھتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے چہرے کو مصنوعی بنانا نہیں چاہتی۔ وہ جیسی ہے ٹھیک ہے۔ چند سال پہلے جب دسمبر کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات میں دونوں بچے اپنے کمرے میں سو رہے تھے اور شہزاد فاخرہ کے ساتھ کمبل اوڑھے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ فاخرہ نے ہولے سے اپنا ہاتھ شہزاد کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا اور کمزور آواز میں بولی تھی۔ ''شہزاد...... میں نے آپ سے زندگی میں کسی بات پر اصرار نہیں کیا لیکن ایک بات پر اصرار کرنا چاہتی ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ آپ میری وہ بات مان لیں۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو۔'' شہزاد نے چونک کر کہا۔

وہ چند سیکنڈ تک کھانستی رہی پھر اس نے شہزاد کی طرف

دیکھے بغیر کہا۔ ''شہزاد! آپ شادی کرلیں۔''

شہزاد نے گھور کراسے دیکھا۔ پھراس کا سرد ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''فخرہ، اگر پھر بھی ایسی بات کی تو۔''

''کیوں شہزاد کیوں نہ کروں۔'' وہ لی وی آف کرتے ہوئے بولی۔ ''میں بہت عرصے سے سوچ رہی ہوں۔ آپ کو بیوی کی ضرورت ہے، ایسی بیوی جو آپ کے قدم سے قدم ملا کر چل سکے۔ آپ کی خدمت کر سکے، آپ کو خوشی دے سکے۔ میں دل کی گہرائی سے یہ بات کہہ رہی ہوں شہزاد۔ آپ نے اب تک مجھ پر بڑے احسان کیے ہیں شہزاد، اب ایک احسان اور کردیں۔ میری بات مان لیں۔''

''یہ نہیں ہوسکتا اور نہ کبھی ہونا ہے۔ میں بالکل خوش اور مطمئن ہوں...... ہاں اگر تم اس طرح کی باتیں کرتی رہو گی تو پھر میرا ذہنی سکون ضرور برباد ہو جائے گا۔''

اس رات دیر تک اس موضوع پر بات ہوئی۔ شہزاد نے فاخرہ کی ہر دلیل کو رد کردیا۔ درحقیقت اس کی زندگی میں اب ایک ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ اسے اب ایک پرجوش شریک حیات کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ سیر و تفریح کا شوق اسے ویسے ہی کم تھا۔ کالج سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنی فرم کے آفس پہنچ جاتا تھا۔ وہاں رات گئے تک اتنی مصروفیت رہتی تھی کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب اس کا کام ہی اس کی تفریح بن گیا ہے۔

وہ ایک چلتی پھولتی اشتہاری فرم کا منیجنگ ڈائریکٹر تھا۔ اس کے اردگرد خوش رنگ تتلیوں کی بھیڑ رہتی تھی۔ کئی نامور حسین ماڈلز سے اس کا واسطہ پڑتا تھا تاہم اس کا پروفیشنلزم ایسے درجے پر تھا جہاں ایسی چیزوں کی زیادہ اہمیت نہیں رہتی۔ ویسے بھی...... سچی بات یہ تھی کہ نجمہ سے جدائی کے بعد اس کی زندگی میں عشق و محبت والا دروازہ مستقل طور پر بند ہوگیا تھا۔ بس کبھی کسی رات میں ایسا ہوتا تھا جب فاخرہ اور بچے سو جاتے تھے، وہ خاموشی کے ساتھ اٹھ کر ایک کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ اس کھڑکی کا رخ شمال کی طرف تھا، شمال...... جہاں لاہور تھا، جہاں اس کا ماضی تمام خوبصورت یادوں کے ساتھ دفن تھا۔ اسی شہر کے ایک حسین باغ میں بہار کی وہ خوشبودار شام بھی آئی تھی جب کسی نے اس کی کمر پر اپنی انگلی سے اس کا نام لکھا تھا اور شرما کر بھاگ گیا تھا۔ کہاں گیا تھا وہ؟ اور کہاں گئے تھے باقی سب لوگ؟

شہزاد پروفیسر بنا۔ فائن آرٹ کے سبجیکٹ پر اس کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں اور ان کو قبولیت عامہ حاصل ہوئی۔

ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں بھی اب اس کا نام تھا۔ وہ ایک معروف اور ہر دلعزیز شخص تھا۔ ٹی وی پر اس کے انٹرویوز آتے تھے اور اخباروں میں بڑی بڑی تصویریں شائع ہوتی تھیں۔ بے شک اس نے ماموں جہانگیر اور ماموں جمیل کی فیملیز پر یہ ثابت کردیا تھا کہ گاؤں سے اٹھ کر آنے والا شخص بھی اپنی محنت اور لگن کے بل بوتے پر اونچا مقام حاصل کرسکتا ہے۔ اب وہ مالی اعتبار سے ان فیملیز کا ہم پلہ تھا اور اگر اس کی شہرت اور ناموری کو بھی اس کے پلڑے میں رکھ دیا جاتا تو یہ پلڑا کافی بھاری ہو جاتا تھا۔ شہزاد کے چھوٹے ماموں انور عارضۂ قلب کے سبب فوت ہو چکے تھے۔ چھوٹی ممانی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ کراچی میں ''شفٹ'' ہو گئی تھیں...... ماں اور بھائی کے قریب آنے سے فاخرہ کو بھی راحت ملی تھی۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ یہ ہوا تھا کہ لاہور سے اور لاہور کے رشتے داروں سے شہزاد کا رابطہ بالکل منقطع ہوگیا تھا۔

اور اب اپنی شادی کے تقریباً 24 سال بعد وہ پہلی بار اپنی بیوی اور دونوں بچوں کے ساتھ بیرون ملک آیا تھا۔ فائن آرٹ کے ایک فرنچ انسٹی ٹیوشن نے بڑی چاہت کے ساتھ اسے یہاں پیرس میں مدعو کیا تھا۔ یہ پیرس میں اس کی پہلی شام تھی اور اس پہلی شام میں ہی ماموں جہانگیر کی بڑی بیٹی فرزانہ (یعنی نجمہ کی بہن) اور اس کے بچوں سے غیر متوقع طور پر اسے آ دبوچا تھا۔ اب وہ سب لوگ اس کے اردگرد بیٹھے گلا پھاڑ رہے تھے اور وہ ان کے قریب بیٹھا بیٹھا تصورات کی کھڑکی کھول کر ماضی کے دھندلکے میں اتر گیا تھا۔ پورا ایک دور بس دو چار منٹ کے اندر ترتیب وار مناظر کی شکل میں اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

''ہاں جی، اب آپ واقعی پروفیسر لگ رہے ہیں۔'' ایک چلبلی آواز نے اسے طویل خیالوں سے چونکایا۔ فرزانہ کی وہی سترہ اٹھارہ سالہ بیٹی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کیمرا تھا۔ فلیش چمکی اور شہزاد کی تصویر اتر گئی۔ عینا نے کیمرے کی چوکور اسکرین پر یہ تازہ تصویر دیکھی اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''کیا ہوا؟ بری آئی ہے؟'' شہزاد نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں، بہت اچھی۔ آپ تو بالکل مائی لارڈ لگ رہے ہیں۔'' وہ تصویر کو دیکھتے ہوئے شہزاد کی طرف بڑھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا، وہ کمال بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ گئی اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل پاس لا کر اسے تصویر دکھانے لگی۔ اس کے لمبے بال ایک دم ہی شہزاد کی جھولی میں آن گرے تھے۔

شہزاد ذرا سا جھجک کر پیچھے ہٹا۔ تصویر میں شہزاد واقعی

خیالوں میں کھویا نظر آیا۔ وہ سگریٹ پینے کے لیے کھڑکی کے پاس آن بیٹھا تھا۔ تصویر میں وہ کش لیتے ہوئے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا اور اس کے سرمئی بالوں کی دو لٹیں اس کی پیشانی پر جھول رہی تھیں۔ یہ سب کچھ تصویر میں محفوظ ہوگیا تھا۔

فرزانہ بھی تصویر دیکھنے کے لیے شہزاد کی طرف جھک آئی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''شہزاد بھائی اب تم پیرس میں آ گئے ہو تو دو چیزوں سے خاص طور پر بچ کر رہنا ہے۔ پہلی چیز ہے غلط موڑ کاٹنا۔ یہاں کی بڑی سڑکیں اس طرح کی ہیں کہ اگر آپ جناب نے کہیں غلط موڑ کاٹ لیا تو پھر دوبارہ سے صحیح موڑ پر پہنچنے کے لیے آپ کو تیس چالیس کلومیٹر تک کا سفر طے کرنا پڑ سکتا ہے۔''

''اور دوسری چیز؟''

''دوسری چیز یہ لڑکی۔ اس سے بھی بچ کر رہنا ہے، بندے کی مت مار دیتی ہے۔''

''اور اگر خدانخواستہ آپ نے اس سے شاعری سنانے کی فرمائش کردی تو پھر آپ کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس سے بھول کر بھی شاعری کی ''فرمائش'' نہ کیجیے گا۔'' عینا سے بڑی زارا نے لقمہ دیا۔ عینا یعنی عینی نے پہلے زارا کو گھورا پھر بے پروائی سے بولی۔ ''اچھے کام فرمائش کے بغیر بھی کیے جا سکتے ہیں۔''

شہزاد نے ماموں زاد فرزانہ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''کیا واقعی یہاں غلط موڑ......''

''غلط موڑ اور صحیح موڑ کا یہاں کوئی سوال نہیں ہے مائی لارڈ۔'' عینی نے تیزی سے شہزاد کی بات کاٹی۔ ''غلط یا صحیح موڑ تو آپ تب کاٹیں گے جب ہم آپ کو گاڑی چلانے دیں گے، آپ کو...... جہاں جانا ہوگا، ہم آپ کو خود لے کر جائیں گے، اپنی نگرانی میں۔''

''اپنی نگرانی میں کیوں؟'' شہزاد کی بیوی فاخرہ ہنسی۔

''آپ بھی بڑی سیدھی ہیں آنٹی، آپ کے ہسبینڈ ایک مشہور و معروف بندے ہیں، یعنی ''سلیبرٹی'' ہیں اور یہاں کی لڑکیاں تو ایک دم طوفان ہیں......''

''ہاں وہ تو ہم دیکھ رہے ہیں۔'' فاخرہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

''اس کی کسی بات کا برا نہیں ماننا۔'' فرزانہ نے کہا۔

''بس، بات بری لگے تو اسے پیٹ دینا ہے۔'' زارا نے پھر لقمہ دیا۔ سب ہنسنے لگے۔

رات کو شہزاد دیر تک فرزانہ اور اس کی فیملی کے بارے میں سوچتا رہا۔ عرصے بعد ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی اور بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ فرزانہ کی چھوٹی بیٹی، عینی کی شکل بھی بار بار شہزاد کی نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ خاص طور سے عینی کی آنکھیں، یہ ہو بہو نجمہ کی آنکھیں تھیں، ویسی ہی بناوٹ، ویسا ہی رنگ، وہی گہرائی اور وہی بولتی ہوئی خاموشی۔

ان آنکھوں نے شہزاد کو بے طرح چونکا دیا تھا۔

صبح سویرے ہی ہوٹل کے کمرے میں فرزانہ کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا۔ ''عینی آج کل اپنے فائنل ایگزیمز سے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی چھٹیاں ہیں، اس نے اور زارا نے پروگرام بنایا ہے کہ وہ تمہاری طرف آ رہی ہیں، تمہیں ساتھ لے کر ''نوٹرے ڈیم'' جائیں گی۔''

''فرزانہ، آپ لوگ خوامخواہ تکلف کر رہے ہیں، ویسے بھی میں ابھی ایک آدھ دن آرام کرنا چاہتا تھا۔'' شہزاد نے کہا۔

''تم آرام کرنا چاہتے ہوگے لیکن تمہارے بچو گڑے تو ایک دم بے قرار ہو رہے ہیں، بچوں کا دل نہیں توڑنا چاہیے اور دوسری بات یہ کہ تم نے ہمیں ''آپ لوگ'' کیوں کہا۔ کیا اب ہم واقعی لوگ ہو گئے ہیں؟''

''نہیں نہیں فرزانہ! میں تو بڑا متاثر ہوا ہوں، آپ لوگوں کی گرمجوشی سے۔''

''واہ...... پھر آپ لوگوں۔ لگتا ہے کہ تم پرانی باتیں بھولنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہو۔ بھئی اب ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ اب ہمیں کم از کم اپنی آنے والی نسل کے لیے تو ایک اچھا ماحول چھوڑ کر جانا چاہیے۔''

شہزاد نے گہری سانس لی۔ ''یہ ایک بڑا وسیع ٹاپک ہے فرزانہ۔ اس پر پھر کبھی آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، آپ سب تیار ہو جائیں۔ زارا اور عینی تقریباً ایک گھنٹے تک تمہارے پاس پہنچ رہی ہیں اور بچے وہ ساتھ لے کر آئیں گی...... انکار کی گنجائش نہیں۔''

ٹھیک ایک گھنٹے بعد کال بیل بجی۔ فاخرہ نے کہا۔ ''سنا تھا کہ یہاں ٹائم کی بہت پابندی کی جاتی ہے۔ غالباً ٹھیک ہی سنا تھا۔''

''اوہ، تم نے تو ابھی تک پٹی بھی نہیں لپیٹی۔'' شہزاد نے کہا اور دراز میں سے دو طویل لچک دار پٹیاں نکال لیں۔ فاخرہ کرسی پر بیٹھی تھی، وہ پاؤں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کی بیمار ٹانگوں پر لچک دار پٹی لپیٹنے لگا۔ اس پٹی کی وجہ سے فاخرہ کو چلنے پھرنے میں قدرے آسانی رہتی تھی۔

عینی اور زارا ایک سرخ Peugeot کار میں آئی تھیں۔ عینی نے جینز پہن رکھی تھی، جبکہ زارا اسکرٹ میں تھی۔ عینی نے دھوپ کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ اس کا چشمہ دیکھ کر نجانے کیوں شہزاد کو اطمینان سا محسوس ہوا۔ اس اطمینان کی وجہ عینی کی آنکھوں کا اوجھل ہو جانا تھا۔ شہزاد نے ان آنکھوں کو جتنی بار دیکھا تھا، اسے ایک شاک سا لگا تھا۔ وہ حسب سابق بڑے خوشگوار موڈ میں تھی۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر دور نیچے دریائے سین کو دیکھا اور چہک کر بولی۔ ''دیکھو بھئی سسٹر! کل والے دونوں اولڈ مین پھر وہیں پہ بیٹھے ہیں۔''

زارا کے ساتھ شہزاد نے بھی کھڑکی سے جھانکا۔ سڑک سے سیڑھیاں اتر کر دریا کے کنارے تک جاتی تھیں۔ وہاں کنارے پر شاہ بلوط کے درخت تھے اور صبح کی خوشگوار دھوپ تھی۔ پتھر کے ایک بنچ پر تقریباً اسی اسی برس کے دو فرانسیسی بابے خاموش بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے۔

عینی نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بوڑھے یقیناً اپنے گزرے دنوں کی باتیں کر رہے ہوں گے اور یہ روز یہاں آتے ہوں گے۔ جوانی کے دنوں میں ان کی گرل فرینڈز ہوں گی۔ وہ ان کے ساتھ دریا پہ کی چلاتے ہوں گے، جاگنگ کرتے ہوں گے اور درختوں میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوں گے، یہیں کہیں کنارے پہ دستر خوان بچھا کر انہوں نے اپنے سہانے دنوں میں بے شمار لنچ کیے ہوں گے اور وائلن کی دھن پہ رقص کیا ہو گا۔ اب اس کنارے پہ بیٹھ کر ماضی کے سارے منظر ان کی نگاہوں کے سامنے آجاتے ہوں گے، بالکل جیسے کتابوں کے ورق الٹنے سے گئے موسموں کے پھول ملتے ہیں۔''

شہزاد نے تعجب سے اسے دیکھا، پھر زارا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بھئی! یہ تمہاری بہن تو واقعی شاعرہ ہے۔ دیکھو اس نے کھڑے کھڑے نظم کہہ دی۔''

''نظم تو بہت اونچی شے ہوتی ہے مائی لارڈ۔ یہ تو ایک معمولی سا تخیل ہے۔'' وہ کھلکھلائی۔

وہ کمرے میں آ کر دھوپ کا چشمہ اتارنا بھول گئی تھی اور اس کی یہ بھول شہزاد کے لیے اطمینان بخش تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے اور نوٹرے ڈیم کلیسا کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ دریا کے پل کے اوپر سے گزرے۔ دونوں ہم عمر بوڑھے اسی طرح مراقبے کی حالت میں بیٹھے تھے۔

وہ ایک نسبتاً سنسان راستے سے ہوتے ہوئے اچانک ہی پیرس کے وسط سے نمودار ہو گئے یوں لگا جیسے وہ کسی طویل سرنگ سے گزر کر اچانک ہی ''سٹی سینٹر'' میں آ گئے ہیں۔ پیرس اپنی تمام تر خوبصورتی اور گہما گہمی کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوا۔ دلکش عمارتیں، چمکیلے بازار، سیاحوں کی ٹولیاں، زرق برق لباس اور روشن دمکتے چہرے، سائیکل سواروں کے گروپس، لش پش کرتی کاریں، صاف ستھری بسیں اور ٹرینیں، ہر طرف ایک خوبصورت حرکت نظر آئی۔ وہ سب ان مناظر میں محو ہو کر رہ گئے اور پھر اچانک ہی نوٹرے ڈیم کا گرجا اپنی پوری آن بان کے ساتھ ان کے سامنے جلوہ گر ہو گیا۔ بلند و بالا قدیم عبادت گاہ کے سامنے مختلف رنگ و نسل کے سیاحوں کا ہجوم تھا اور ان کے درمیان نوٹرے ڈیم کلیسا بڑی تمکنت سے کھڑا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو...... ہاں میں ہی ہوں جس کو تم نے بارہا تصویروں، فلموں اور تحریروں میں دیکھا ہے۔ میں پیرس کی پہچان ہوں اور اس وقت تمہارے سامنے ہوں۔''

پرشکوہ عمارت کو باہر سے ملاحظہ کرنے کے بعد اب وہ اندر جانا چاہ رہے تھے۔ اندر جانے والوں کی ایک طویل قطار تھی۔ فاخرہ تو اس قطار کو دیکھتے ہی گھاس پہ بیٹھ گئی۔

''میں یہیں ٹھیک رہوں گی۔'' اس نے ایک دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا اور اپنی ایلومینیم کی بیساکھیاں اپنے سامنے رکھ لیں۔

''چلیں ٹھیک ہے، میں بھی آنٹی کے پاس ہی بیٹھتی ہوں۔'' زارا بولی۔

شہزاد بچوں کو لے کر قطار میں کھڑا ہو گیا۔ عینی بھی ساتھ تھی بلکہ وہ سب سے آگے تھی۔ ایک طرف انگلی اٹھا کر بولی۔ ''وہ دیکھیں جی، میں ٹھیک کہہ رہی تھی ناں کہ ٹکٹ نہیں ہو گا۔ وہ لکھا ہوا ہے، انٹرینس فری۔''

شہزاد نے گہری سانس لی۔ ''بھئی، انٹرینس تو فری ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ایگزٹ فری نہ ہو۔ وہ باہر نکلنے کے ڈھیر سارے پیسے مانگ لیں۔''

وہ زور سے ہنسی اور اس کے بال چہرے پر بکھر گئے۔ عمیر بھی ہنسنے لگا۔ وہ بولی۔ ''تو آپ مذاق بھی کر لیتے ہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ آپ...... آپ بالکل ہی انڈین دیوداس کی طرح ہوں گے۔''

''دیوداس۔ وہ کیوں؟''

''آپ کے ساتھ بھی تو ٹریجڈی ہوئی ہے ناں۔ مجھے سب پتا ہے پچھلی باتوں کا۔'' وہ عجیب لہجے میں گویا ہوئی۔

باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

شہرِ محبت

طاہر جاوید مغل

دوسرا حصہ

چاہت کے سپنے بڑے سُندر اور نازک آبگینوں کے مانند ہوتے ہیں جنہیں بہت سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے بھی کرچی کرچی ہوجاتے ہیں مگر...... یہاں تو حسد ورقابت کی اتنی تیز آندھیاں تھیں کہ کوئی زندگی ہی ہار گیا اور کوئی جیت کر بھی زندگی کا لطف نہ اٹھا سکا۔ حسد ورقابت کے جذبات سے جانے کتنی ہی کہانیوں نے جنم لیا۔ جہاں اپنی مقصد برآری کے لیے لوگ کیا کیا گُر اپنا لیتے ہیں اور کسی کو ذلّت کے گڑھے میں دھکیلنے کے لیے کیسے کیسے ہنر آزماتے ہیں لیکن...... قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی...... اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ محبت کے جو لمحات اس کے ہاتھوں سے ریت کے مانند پھسل چکے ہیں یوں اتنے دلکش سراپا میں ڈھل کر اس کے سامنے آکھڑے ہوں گے...... مگر جانے کیوں اس بار اس کی آنکھیں شہرِ محبت کا یہ خواب دیکھنے کے لیے راضی نہ ہوسکیں...... خوشبوئوں کی سرزمین پیرس کی حسین رہ گزاروں میں سفر کرتی ایک گنگناتی خوبصورت داستان۔ محبوب مصنّف طاہر جاوید مغل کے قلم کی دلکش روانی۔

جذبات کے تلاطم سے جنم لینے والی ایک سنسنی خیز داستان عشق

”میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔“

”اچھا چلیں چھوڑیں۔ کوئی اور بات کریں۔“ وہ بچوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

ایک دم شہزاد کو اندازہ ہوا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ شاید اپنی خالہ نجمہ کا ذکر کرنے والی تھی۔ شہزاد کو یہ سب کچھ ناگوار محسوس ہوا۔ بہرحال اسی دوران میں وہ کلیسا کے اندر داخل ہوچکے تھے۔ یہی وقت تھا جب کلیسا کی گھنٹیاں زور شور سے بجنے لگیں۔ اندر سیاحوں کا ہجوم تھا۔ کھوے سے کھوا چھل

رہا تھا۔ نیم تاریک ماحول میں لوگوں کی سرگوشیاں، شمع کے جھلملاتے شعلے، خوبصورت کام والی طویل کھڑکیاں اور مرصع دیواریں، یہ سب کچھ قابل دید تھا۔ کیمروں کی فلیش گنز چمک رہی تھیں۔ وڈیو کیمرے بھی حرکت میں تھے۔ بلند و بالا چھت سے نیچے ایک آرچ میں سے گزرتے ہوئے عینی نے کہا۔ ”آپ کو ہالی وڈ کی مشہور فلم، ہنچ بیک آف دی نوٹرے ڈیم تو ضرور یاد آ گئی ہوگی؟“

”میں نے سنا تو ہے لیکن فلم دیکھی نہیں۔“ شہزاد نے سادگی سے کہا۔

”عمیر! تم نے بھی نہیں دیکھی؟“ عینی نے عمیر سے پوچھا۔

اس نے بھی نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ”آپ اور آپ کے ابو، دونوں بڑے نکمے ہیں یہ بھی کوئی نہ دیکھنے والی فلم تھی۔ اوہ مائی گاڈ، ایسا کام کیا ہے انتھونی کوئین نے کہ بس حد کر دی ہے اور ساتھ میں ہے جینا لولو بریجڈا۔ اتنی پیاری لگتی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیں اور پھر ان دونوں کا دھیما دھیما پیار۔ بائی گاڈ مزہ آ جاتا ہے۔ یہ دیکھیں...... یہ جو رنگین پھول بوٹوں والی دو کھڑکیاں ہیں ناں، ان کے بالکل سامنے فائٹ ہوئی تھی انتھونی کوئین اور گارڈز کے درمیان۔ بڑی دھواں دھار فائٹ۔ ڈشوں ڈشوں دھڑام اور یہ اوپر جو گیلریاں نظر آ رہی ہیں ناں آپ کو، یہیں پر ”ہنچ بیک“ رہتا تھا۔ اسے یہاں قید کر دیا گیا تھا۔ بے چارہ کھڑکیوں اور روشن دانوں میں سے پیرس کی گہما گہمی دیکھتا تھا اور آزادی کے لیے تڑپتا تھا...... اور ہاں مجھے یاد آیا فلم کا اصل نام نوٹرے ڈیم ڈی پیرس تھا۔“ وہ فلم کی پوری اسٹوری سنانے پر تلی ہوئی تھی۔ شہزاد نے کہا۔

”اچھا آہستہ بولو، لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں۔“

”وہ تو میں نہ بھی بولوں گی تو دیکھتے رہیں گے۔“ وہ بے باکی سے بولی اور خود ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔

”تم کافی بگڑی ہوئی بچی ہو۔“ شہزاد نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

”آپ کی دونوں باتیں غلط ہیں مائی لارڈ۔ میں بگڑی ہوئی نہیں ہوں اور بچی بھی نہیں ہوں۔ آئی ایم اے ینگ گرل۔“ اس نے تن کر دکھایا اور ایڑیاں بھی اونچی کر لیں۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے، تماشا نہ بناؤ۔“ شہزاد نے گھبرا کر کہا۔

”چلیں آپ کے بارے میں میرا ایک اندازہ تو درست ثابت ہوا۔“ وہ بولی۔

”کیسا اندازہ؟“

”میں جب بھی آپ کے بارے میں سوچتی تھی مجھے لگتا تھا کہ آپ کافی محتاط ...... بلکہ ...... بلکہ ڈرپوک واقع ہوئے ہوں گے۔“

”پتا نہیں، کیا بولتی چلی جا رہی ہو۔“ شہزاد نے زچ ہو کر کہا اور شیشے کے شوکیس میں نوٹرے ڈیم کلیسا کا ماڈل دیکھنے لگا۔

”عمیر کہاں ہے؟“ اچانک عینی نے چونک کر پوچھا۔

انہوں نے اردگرد دیکھا وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ ”عمیر“ شہزاد نے دو تین بار پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ اسے ڈھونڈنے لگے۔ لاتعداد ستونوں، محرابوں اور سیاحوں کے اندر، آخر وہ دکھائی دے گیا۔ وہ ایک کمپیوٹرائزڈ مشین کے سامنے کھڑا تھا۔ عینی نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور سرزنش کی۔

”کیا کر رہے تھے یہاں؟“ شہزاد نے پوچھا۔

”آٹومیٹک موم بتیاں نکال رہا تھا۔“

”اوئے یہ آٹومیٹک موم بتیاں کیا ہوتی ہیں؟“ عینی نے پوچھا۔

”یہ دیکھیں، اس مشین میں پانچ یورو ڈالیں تو موم بتیوں کا بنڈل خود بخود باہر نکل آتا ہے۔“

”تو الو بائے! یہ کہو ناں کہ آٹومیٹک مشین سے موم بتیاں نکال رہا تھا۔“ عینی نے کہا۔

پھر شہزاد کو دکھانے کے لیے اس نے اپنی جینز کی پاکٹ میں سے پانچ یورو نکالے اور موم بتیوں کا بنڈل نکال کر دکھایا۔

لوگ بنڈل نکال نکال کر مختلف جگہوں پر شمعیں روشن کر رہے تھے۔ اگر گرجے کی لائٹس بجھا دی جاتیں تو ان شمعوں کی روشنی سے بھی گزارا ہو سکتا تھا۔

قدیم تصویروں، محرابوں اور راہداریوں میں قریباً ایک گھنٹا گھومنے کے بعد وہ باہر نکلے اور گرجے کو باہر سے دیکھنے کے لیے اس کے پہلو میں ایک چوبی بنچ پر جا بیٹھے۔ یہاں کبوتروں کی بھرمار تھی۔ عمیر اور احسن بسکٹ توڑ توڑ کر کبوتروں کو کھلانے لگے۔ کبوتروں کا جمگھٹا ہو گیا۔ شہزاد ان مناظر کی تصاویر اتارنے لگا۔ عینی اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”آپ تصویریں بہت اچھی بناتے ہیں۔ آخر پروفیشن ہے ناں آپ کا۔ آپ کے بنائے ہوئے کئی کمرشل بھی میں نے پاکستان کے ٹی وی چینلز پر دیکھے ہیں، دو تین تو کمال کے ہیں۔ خاص طور سے وہ بیوٹی سوپ والا اور پھر اس لڑکی والا جو بسکٹ والے کے پیچھے بھاگتی ہے۔ آپ کے بنائے ہوئے

اشتہارات میں اسٹل فوٹوگرافی کمال کی ہوتی ہے، لگتا ہے کہ یہ شوق آپ کو بہت پہلے سے ہے۔“

”بہت پہلے سے کیا مطلب؟“ شہزاد نے عمیر کو کبوتروں کے درمیان فوکس کرتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب کہ نوجوانی سے۔ آپ کا بنایا ہوا ایک بڑا شاندار اسٹل فوٹوگراف میرے پاس موجود ہے، کسی دن دکھاؤں گی آپ کو۔“

”کس کا ہے؟“

”انہی کا۔“ وہ زیرلب مسکراتی ہوئی بولی۔ شہزاد نے کیمرے سے نظر ہٹائی اور چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

اس کی بولتی آنکھوں میں شوخی ابھری۔ پیرس کی چمک دار خوشگوار دھوپ میں یہ شوخی آبگینوں کی طرح چمکی۔ وہ ہولے سے بولی۔ ”خالہ نجمہ کا۔“

شہزاد نے گہری سانس لے کر کیمرا ایک طرف رکھ دیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم کیا جانتی ہو خالہ نجمہ کے بارے میں؟“

وہ سب کچھ جو باقی سارے جانتے ہیں اور شاید اس کے علاوہ بھی کئی باتیں۔ دراصل خاندان میں اس بارے میں اتنا کچھ کہا اور سنا جاتا رہا ہے کہ اس حوالے سے پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔“

”دیکھو، بڑوں سے اس طرح کی باتیں نہیں کرتے۔“ شہزاد نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔

”اس طرح کی باتوں سے آپ کا کیا مطلب؟“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”کیا یہ کوئی بری باتیں ہیں، یہ تو ایک سیدھی سادی محبت کی کہانی ہے۔ آپ نے اور نجمہ خالہ نے ایک دوسرے سے محبت کی۔ پورے خلوص کے ساتھ برسوں تک ایک دوسرے کو چاہا اور حاصل کرنا چاہا۔ آپ کے ریلیشن میں کسی طرح کا عیب نہیں تھا لیکن حالات آپ کے آڑے آ گئے، نانی کلثوم، خالہ نجمہ کا رشتہ ہر صورت اپنے لے پالک بیٹے سے کرنا چاہتی تھیں اور اس کے لیے انہوں نے ہر الٹی سیدھی چال چلی۔ یہاں تک کہ خالہ نجمہ اور آپ کی امی کو بہنیں ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد نانا جی کا رویہ بھی ایک دم سخت ہو گیا۔ آپ کو اور نجمہ خالہ کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے دور کر دیا گیا۔ آپ دونوں اپنی طرف پل پل بڑھتی ہوئی جدائی کو دیکھتے رہے لیکن کچھ کر نہ سکے۔ نجمہ خالہ کی شادی ہو گئی۔ اس قربانی کے بعد آپ نے ایک اور بے مثال قربانی دی۔ آپ نے اس لڑکی سے شادی کی جو خاندان میں سب سے بے کس اور محروم سمجھی جاتی تھی۔ آپ نے آنٹی فاخرہ کو شریکِ حیات بنایا اور انہیں زندگی میں کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔“

شہزاد پھر سرزنش کے انداز میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ اتنی روانی اور اعتماد سے بول رہی تھی کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

”تم تو واقعی کتاب لکھ سکتی ہو۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

”اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت لکھ بھی دوں مائی لارڈ......

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں پوئٹری لکھتی ہوں اور پوئٹری ہی پڑھتی ہوں۔ نثر سے مجھے کچھ زیادہ لگاؤ نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں پوئٹری میں ہی لکھ ماروں، دیکھیے مائی لارڈ! بات کہاں سے کہاں نکل گئی اور میں نے عدالت کا وقت ضائع کرنا شروع کر دیا۔ دراصل میں بات کر رہی تھی آپ کی شاندار فوٹوگرافی کی۔ نجمہ خالہ کی وہ تصویر شاید کسی تہوار وغیرہ پر اتاری گئی ہے۔ وہ نانا کے گھر کی چھت پر کھڑی ہیں۔ انہوں نے بند گلے کا سویٹر پہن رکھا ہے اور ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا ہے۔ دھوپ ان کی ایک سائڈ سے آ رہی ہے۔ دونوں بازو سینے پر باندھے وہ کچھ سکڑی سمٹی سی ہیں۔ بڑی شاندار تصویر ہے۔ امی نے بتایا تھا کہ یہ آپ ہی نے اتاری تھی اور شاید آپ ہی کے ہاتھ سے تصویر کی پشت پر لکھا ہوا ہے۔ ”اف یہ دسمبر۔“

شہزاد کو تصویر کے بارے میں یاد آ گیا لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

”آپ کو پتا ہے کہ یہ تصویر آپ نے کب اور کہاں اتاری تھی؟“

ایک بڑی کمپنی میں افسران کے اجلاس میں کمپنی کے مالک نے ایک افسر کو ڈانٹتے ہوئے اس کی کارکردگی کی خامیاں گنوانی شروع کر دیں۔ جواب میں افسر نے کمپنی کے مالک کے اقدامات پر تنقید شروع کر دی۔

”اس پر مالک خفا ہو کر غصے سے چلائے“ اس کمپنی کا مالک میں ہوں یا تم......“

”آپ ہیں۔“ افسر نے تسلیم کیا۔

”تو پھر تم کیوں گدھوں کی طرح بولے چلے جا رہے ہو؟“ مالک اور بھی زور سے چلائے۔

"یہ پوچھ کر کیا کرنا ہے تم نے؟"

"جن چیزوں سے بندے کو دلچسپی ہوتی ہے وہ انہیں کھوجنا چاہتا ہے مائی لارڈ۔ ان کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ انہیں ایک کھلی کتاب کی طرح پڑھنے کی خواہش رکھتا ہے۔"

"لگتا ہے کہ پوئٹری نے تمہارا کچھ زیادہ ہی بیڑا غرق کیا ہوا ہے۔ پڑھائی میں تمہارے گریڈز کیا آتے ہیں؟"

"میں وہاں بھی فرسٹ کلاس فرسٹ ہوں۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو یا پھر تمہارے اسکول کا معیار ایویں ہے، چلو اٹھو اب وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" شہزاد کھڑا ہوگیا۔

"آپ جینٹلمین مائی لارڈ۔ تصویر والی بات آپ نے پھر گول کر دی ہے۔"

شہزاد ان سنی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

عینی اور زارا لنچ ساتھ ہی لے کر آئی ہوئی تھیں۔ بیف کے شاندار کباب تھے۔ ساتھ ہی ڈھیر ساری سلاد اور مایونیز، ایک بڑی ڈبل روٹی تھی جس کے ساتھ مزیدار سینڈوچ بنائے جا سکتے تھے۔ عینی شہزاد اور بچوں کے آنے تک زارا اور فاخرہ باتوں میں مصروف رہی تھیں۔ انہوں نے ایک جگہ دری بچھائی اور سامان خورونوش رکھ لیا۔ بچے دری پر قلابازیاں کھانے لگے۔ شہزاد نے ایک بیف کباب چکھا۔ بہت مزیدار تھا۔ "بڑا اسپیشل ٹیسٹ ہے۔" شہزاد نے بے ساختہ کہا۔

"آپ کی اس فین نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں جی۔" زارا بولی۔ "ویسے بڑے خوش قسمت ہیں آپ کہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیز کھائیں گے۔ ورنہ یہ مہارانی تو کچن میں گھس کر نہیں دیتی۔"

"دیکھو بگ سسٹر اب اس بات پر لڑائی ہو جائے گی۔ آپ کا مطلب ہے کہ میں کام نہیں کرتی۔"

"نہیں کام تو کرتی ہے جی۔ ابھی پچھلے سے پچھلے مہینے اس نے ایک دن ناشتے کے لیے انڈے فرائی کیے تھے۔" زارا نے پکا منہ بنا کر کہا۔

"بگ سسٹر!" وہ مکا تان کر اس کی طرف بڑھی۔ شہزاد نے راستے میں ہی اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

"نہیں بھئی نہیں، لڑائی نہیں۔" فاخرہ بولی۔ "عینی نے کباب واقعی اچھے بنائے ہیں اور مجھے پتا چلا ہے کہ یہ مایونیز بھی گھر کی بنی ہوئی ہے اور عینی نے ہی بنائی ہے۔"

اب زارا بھی سنجیدہ ہوگئی۔ اثبات میں سر ہلا کر کہنے لگی۔ "مذاق کی بات نہیں ہے انکل، حقیقت میں یہ عینی ہی ہے جس کی وجہ سے ہم سب کی ملاقات ہو سکی ہے۔ ماما نے بتایا تھا ناں آپ کو کہ آپ کے یہاں آنے کی ساری مسٹری عینی نے ہی solve کی ہے۔ وہ بڑے دنوں سے اس چکر میں پڑی ہوئی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو آپ نے کہاں ہاتھ آنا تھا ہمارے۔"

"یہ بھی پتا نہیں کہ شہر میں گھومتے ہوئے کہیں ہمارے پاس سے گزر جاتے اور دیکھ کر بھی نہ دیکھتے۔" عینی شکوہ کناں انداز میں بولی۔

"خیر ایسی بھی بات نہیں۔" شہزاد نے کہا۔

"ایسی بات کیوں نہیں۔ جس چیز کے بارے میں علم نہ ہو اسے بندہ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس نوٹرے ڈیم کے گرجا کو ہی لے لیں جس کو اس کی تاریخ جغرافیے کا پتا نہیں ہوگا وہ پیرس دیکھتا دیکھتا اس بے چارے کے پاس سے گزر جائے گا..... شوں کر کے۔"

"مثالیں واقعی خوب دیتی ہے۔" شہزاد بولا۔

"آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔" زارا نے کہا۔

فاخرہ اور عینی باتیں کرنے لگیں۔ فاخرہ ٹانگوں پر شال ڈالے نیم دراز تھی جبکہ عینی بے تکلفی سے اس کے کندھے سے لگی بیٹھی تھی۔ عینی کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ فنون لطیفہ خصوصاً پوئٹری اور فوٹوگرافی سے دلچسپی رکھتی ہے۔ حال ہی میں اس نے قریباً ڈھائی ہزار یورو میں Nikon کا کمرشل کیمرا اور لینسز وغیرہ خریدے تھے، پاکستانی کرنسی میں یہ قریباً پونے تین لاکھ روپیہ بنتا تھا۔ فوٹوگرافی میں عینی کی دلچسپی تب مزید بڑھ گئی تھی جب ڈھائی تین سال پہلے اس نے فوٹوگرافی پر ہی شہزاد کی لکھی ہوئی ایک کتاب پڑھی تھی۔ اب اس کی اسٹڈی کا رخ فائن آرٹ کی طرف تھا اور وہ شہزاد کی فیلڈ یعنی "پبلسٹی ڈیزائننگ" کی طرف جانا چاہتی تھی۔

باتیں کرتے کرتے عینی بے تکلفی سے پھیل کر دری پر لیٹ گئی۔ احسن نے اس کے سن گلاسز اتار لیے اور اپنی آنکھوں پر ٹکانے کی کوشش کرنے لگا۔ کل رات کی طرح شہزاد کی نگاہ ایک بار پھر اس کی آنکھوں پر پڑی اور پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی...... ان آنکھوں میں کوئی خاص بات تھی۔ شاید یہ عینی کی آنکھیں ہی نہیں تھیں، یہ کسی اور کی تھیں۔

احسن، عینی کے گلاسز شہزاد کی آنکھوں پر جمانے کی کوشش کرنے لگا۔ شہزاد نے پریشان لہجے میں کہا۔ "احسن،

عینی کو واپس دو عینک۔"

"آپ کا رعب سے بولنے کا انداز وہی ہے جو انگلش سیریل میں برٹش اداکار مائی لارڈ کا تھا۔" عینی ایک بار پھر کھلکھلائی۔ "اور شاید آپ کو غصہ بھی اسی کریکٹر کے انداز میں فوراً آ جاتا ہے، ذرا سی بات پر ڈانٹ دیا احسن کو۔"

اسی دوران میں احسن لپک کر گیا اور دری پر لیٹی عینی کو عینک واپس پہنانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں اس کا ہاتھ زور سے عینی کے چہرے پر لگا۔ عینک کی ایک ڈنڈی عینی کی آنکھ میں چبھ گئی۔ "اوہ گاڈ" وہ کراہی اور اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے آنکھ دبالی۔

اس کا رنگ زرد ہوگیا تھا۔ شہزاد جلدی سے عینی کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھوں کو کھینچ کر آنکھ سے علیحدہ کیا۔ آنکھ دیکھی۔ چند سیکنڈ میں ہی وہ سرخ ہوگئی تھی۔ عینک کی ڈنڈی سیدھی پتلی پر لگی تھی۔ ان لمحوں میں پتا نہیں کیوں شہزاد کو لگا کہ یہ عینی کی نہیں نجمہ کی آنکھ ہے۔ یہ چوٹ شاید نجمہ کو لگی ہے۔ اس کی سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا اس نے جیب سے تہ شدہ رومال نکالا اور دیسی طریقے کے مطابق اسے عینی کی آنکھ پر رکھ کر زور زور سے پھونکیں مارنے لگا۔

"ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں؟" زارا نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں ٹھیک ہو جائے گی۔" شہزاد نے کہا اور اپنی طبی امداد جاری رکھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے رومال ہٹایا۔ عینی نے آنکھیں جھپک جھپک کر اردگرد دیکھا۔ آنکھ کو ہولے سے ملا، پھر دوبارہ دیکھا۔

"ٹھیک ہو؟" شہزاد نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ناک میں پانی آ جانے کی وجہ سے اس نے سوں سوں کی آواز نکالی۔ شہزاد نے رومال دوبارہ اس کی آنکھ پر رکھا اور چند بار مزید اپنے سانس کی گرمی اس کی آنکھ تک پہنچائی۔ اس دفعہ رومال ہٹایا تو صورت حال قدرے بہتر تھی۔ عینی نے براہ راست شہزاد کی آنکھوں میں دیکھا۔ دیکھنے کا یہ خاص انداز بھی عینی نے شاید...... اپنی خالہ نجمہ سے مستعار لیا تھا۔ شہزاد جلدی سے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

دس سالہ احسن گھبرایا ہوا سا کھڑا تھا۔ شہزاد نے اس کی طرف دیکھا تو اسے غصہ آ گیا۔ وہ اسے چپت رسید کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھا لیکن عینی نے لپک کر احسن کو اپنی

"یہ ہمارے سیلز منیجر صاحب ہیں۔ یہ کمپنی کی مصنوعات فروخت کرنے کے لیے سڑک کے راستے اپنے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔"

طرف کھینچ لیا اور اپنے ساتھ لپٹا کر رخ پھیر لیا۔ شہزاد احسن کے اردگرد گھوم کر رہ گیا۔

"نہیں جی نہیں۔ یہ تو ہمارا چھوٹا سا بچونگڑا ہے۔" وہ احسن کا دفاع کرتے ہوئے بولی۔

"میڈیکل اسٹور سے دوا وغیرہ کا پتا کر لو۔" فاخرہ نے کہا۔

"نہیں آنٹی، یہاں عام طور پر اسٹور سے دوا نہیں ملتی۔ ویسے بھی اب میں ٹھیک ہوں۔" عینی نے کہا۔

"دیکھ لو اگر تم بیمار ہوگئیں تو انکل اینڈ فیملی کو سیر کون کرائے گا۔" زارا نے مسکراتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا۔

"کیا مطلب؟ آپ لوگ ہمیں اس آفت کے حوالے کر دیں گے؟" شہزاد کا اشارہ عینی کی طرف تھا۔

"جی تو چاہتا تھا کہ میں اور ماما بھی آپ کے ساتھ ہوں لیکن قرعہ فال اسی کے نام نکلا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ فائنل ایگزیمز کے بعد دس پندرہ دن کے لیے آف ہے۔"

"بگ سسٹر! میں آف نہ بھی ہوتی تو انکل اور آنٹی کے لیے وقت ضرور نکالتی۔ آپ خوامخواہ مجھے ڈی گریڈ نہ کریں۔" زارا اور عینی میں نوک جھونک پھر شروع ہوگئی۔

پیرس کا وہ دن واقعی بہت چمکیلا اور خوبصورت تھا۔ سب نے لطف اٹھایا اور شام سے تھوڑی دیر پہلے ہوٹل واپس پہنچ گئے۔

رات کو فرزانہ کا فون آ گیا۔ اس نے شہزاد سے کہا۔ "جمیل آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آج کل وہ آب وہوا

کی تبدیلی کے لیے زیورخ گئے ہوئے ہیں۔ اپنے ایک ترک دوست کے پاس۔ تھوڑی دیر میں آپ کو ان کا فون آئے گا۔''

جمیل فرزانہ کے شوہر کا نام تھا۔

چار پانچ منٹ بعد جمیل صاحب کی کال آ ہی گئی۔ جمیل احمد صاحب کا تعلق سیالکوٹ کی ایک صنعت کار فیملی سے تھا۔ ذاتی طور پر اچھے اور نفیس آدمی تھے۔ وہ عمر میں شہزاد سے چھ سات سال بڑے تھے۔ اپنے ڈیل ڈول کے سبب بھی بڑے لگتے تھے۔ شہزاد انہیں بھائی جان کہتا تھا۔ جمیل صاحب خوش اخلاقی سے ملے اور شہزاد سے اصرار کیا کہ وہ ہوٹل چھوڑ کر ان کے گھر شفٹ ہو جائیں۔ شہزاد نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بہرحال یہ بات تو شہزاد کے ساتھ ساتھ جمیل صاحب بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ عملی طور پر ایسا ممکن نہیں۔ دونوں فیملیز میں عرصۂ دراز سے جو فاصلے موجود تھے وہ اس طرح کی قربت کی اجازت ہرگز نہیں دیتے تھے۔ اگر پاکستان میں فرزانہ کے گھر والوں کو بھنک بھی پڑ جاتی کہ شہزاد، فرزانہ کے گھر ٹھہرا ہوا ہے تو یقیناً وہ بہت سیخ پا ہوتے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی عینی گاڑی پر آ دھمکی۔ فاخرہ کی طبیعت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ موسم کی تبدیلی کے سبب ٹانگوں میں مسلسل درد ہو رہا تھا۔ آج وہ کہیں جانا نہیں چاہتی تھی مگر عینی کے سامنے اس کی کوئی پس و پیش نہیں چلی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح فاخرہ کو آمادہ کر ہی لیا۔ اس کے لیے اس نے بڑی ہوشیاری سے عمیر اور بچونگڑے یعنی احسن کی مدد بھی حاصل کی۔ آج پروگرام تھا پیرس کا مشہور و معروف عجائب گھر لوور دیکھنے کا۔

کل کی طرح آج بھی عینی لنچ کا انتظام گھر سے کر کے لائی تھی۔ سرخ رنگ کی چمکدار ''پی جو'' گاڑی میں دو ٹفن، منرل واٹر اور کوک کی دو بڑی بوتلیں رکھی تھیں۔ بچے آگے عینی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ شہزاد اور فاخرہ عقبی سیٹ پر تھے۔ کل والے دونوں بوڑھے آج بھی دریائے سین کے کنارے خاموش بیٹھے تھے۔ جلد ہی ان کی گاڑی پیرس کی صاف ستھری سڑکوں پر رواں تھی۔ پیرس کی کئی سڑکیں ہموار تارکول کی بجائے پتھروں کی تھیں۔ گاڑی ایسی سڑکوں پر ذرا تھرتھراتی ہوئی چلتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس معمولی تھرتھراہٹ سے بچنے کے لیے فرانسیسی اپنی قدیم روایات کو ملیا میٹ کرنا نہیں چاہتے۔ ایسی ہی ایک شاندار سڑک سے گزرتے ہوئے عینی نے بتایا۔ ''یہ شانزالیزے ہے۔ اسے پیرس کا ہارٹ کہنا چاہیے۔ اس کے کناروں پر دنیا کے بہترین ریسٹورنٹ اور شاپنگ سینٹر موجود ہیں۔ اسے ہم بعد میں اطمینان سے دیکھیں گے۔''

''اطمینان سے کیوں دیکھیں گے؟'' احسن نے معصومیت سے پوچھا۔

''بھئی یہ پیرس کا ہارٹ جو ہوا اور ہارٹ کو بڑے اطمینان سے دیکھنا چاہیے۔ یہ بڑا نازک کام ہوتا ہے۔'' وہ حسب عادت کھلکھلا کر ہنسی۔

آج اس نے کریم کلر کی پینٹ پہن رکھی تھی جس کے پائنچے اڑسے گئے تھے، مردانہ اسٹائل کی...... کالر والی آف وائٹ شرٹ تھی جس پر سرخ دھاریاں تھیں، بال کھلے چھوڑ رکھے تھے جو گاڑی میں داخل ہونے والی ہوا کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ آج اس نے ٹیکنی کلر فریم والے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ تصدیق شدہ اطلاع کے مطابق وہ بیسویں سال میں داخل ہو رہی تھی، تاہم اپنی عمر سے ایک دو سال چھوٹی لگتی تھی۔ شہزاد نے اسے پروفیشنل نظروں سے دیکھا اور اسے لگا کہ یہ لڑکی ڈیڑھ دو سال کے اندر جب تھوڑی سی اور بھر جائے گی تو بہ آسانی ماڈلنگ میں آ سکتی ہے۔

لوور کا عجائب گھر ایک وسیع و عریض جگہ تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ حد نگاہ تک اس معروف میوزیم کی بیرونی دیوار نظر آتی تھی۔ پاکستان سے روانہ ہوتے وقت شہزاد کا خیال تھا کہ شاید لوور کا میوزیم پیرس سے باہر ہے اور درختوں سے گھری ہوئی کوئی جگہ ہے، لیکن یہ میوزیم ایک بارونق علاقے میں تھا۔ داخلے کا ٹکٹ نو یورو کا تھا یعنی پاکستانی کرنسی کے مطابق تقریباً 1035 روپے فی کس۔ شہزاد کی کوشش کے باوجود عینی نے اسے ٹکٹ نہیں خریدنے دیا۔ عینی ٹکٹ لے کر آئی اور پھر انہیں لے کر اس عظیم الشان میوزیم میں داخل ہو گئی۔

''یہاں موم کے بنے ہوئے مجسمے ہیں؟'' احسن نے معصوم لہجے میں پوچھا۔

عینی نے ''پیار سے دانت پیس کر'' اس کے سرخ گال پر زور سے چٹکی لی اور بولی۔ ''موم کے مجسمے یہاں نہیں لندن کے میوزیم میں ہیں بچونگڑے۔ یہاں اور بہت کچھ ہے اور سب سے بڑھ کر یہاں مونالیزا کی اصل پینٹنگ ہے۔ لوگ پوری دنیا سے اسے دیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔''

''مونالیزا! اس میں کوئی خاص بات ہے؟'' عمیر نے پوچھا۔

''مونالیزا بالکل میری طرح مسکراتی تھی۔ مجھ میں اور مونالیزا میں بس یہی ایک چیز ہے جو دیکھنے والوں کو پسند آتی ہے۔ یعنی ہماری مسکراہٹ۔''

''لیکن تمہاری مسکراہٹ تو کچھ خاص نہیں ہے۔'' شہزاد نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ میری اور مونالیزا کی مسکراہٹ ایک جیسی ہے۔ اب آپ دوسرے لوگوں کا کیا کر سکتے ہیں مائی لارڈ۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں مسکراہٹ پسند ہے تو بس پسند ہے۔ جن کو پسند نہیں وہ بھی خوردبین لگا لگا کر آنٹی مونالیزا کو دیکھتے ہیں اور پھر ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مغز ماری کے بعد انہیں بھی چار و ناچار ماننا پڑتا ہے کہ ہاں کچھ نہ کچھ ہے اس مسکراہٹ میں۔''

شہزاد نے اندازہ لگایا کہ اس وسیع و عریض بے مثال میوزیم کو دیکھنے کے لیے ایک دو روز تو قطعی ناکافی ہیں۔ اگر ایک دو ہفتے دیے جاتے تو شاید میوزیم کا تھوڑا بہت حق ادا ہو جاتا۔ میوزیم کی طویل طویل گیلریوں میں آرٹ کے نادر شاہکار دیکھتے دیکھتے وہ ذرا تھک گئے تو ایک نہایت خوبصورت گیلری میں رکھے ہوئے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ فاخرہ کچھ زیادہ ہی تھک گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں تو بس اس صوفے پر بیٹھی بیٹھی آس پاس کی تصویریں ہی دیکھوں گی۔ آپ لوگ گھوم پھر لیں۔''

احسن بھی ماں کے پاس ہی رہ گیا۔ عمیر کو مجسموں میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ شہزاد عینی اور عمیر گیلریوں میں گھومنے لگے۔ اکثر تصاویر پر نمبروں کا اندراج تھا۔ تصویر کے بارے میں تفصیل معلوم کرنا ہوتی تو انتظامیہ کے فراہم کردہ ریسیور پر مطلوبہ نمبر دبایا جاتا۔ انگلش میں اس تصویر یا مجسمے کی ساری ہسٹری سنائی دینے لگ جاتی تھی۔ یہ تفصیل مختلف زبانوں میں منتخب کی جا سکتی تھی۔

جوں جوں وہ مونالیزا کی طرف بڑھ رہے تھے ان کے اشتیاق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہاں مقیم ہونے کے باوجود عینی بھی یہ پینٹنگ پہلی بار ہی دیکھ رہی تھی۔ راستے میں ایک رومانٹک پینٹنگ نے شہزاد کے قدم روکے۔ یہ وکٹوریہ دور کی ایک بالکونی تھی جس میں ایک لڑکی کھڑی اشک بھری آنکھوں سے اپنے محبوب کو الوداع کہہ رہی تھی۔ بڑی کلاس کی منظر نگاری تھی۔ تصویر کوئی تین سو سال پہلے بنائی گئی تھی۔ عینی بھی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ حسب عادت بالکل اچانک بولی۔ ''جناب عالی آپ نے آخری ملاقات کب کی تھی نجمہ خالہ سے؟''

شہزاد گڑبڑا گیا۔ ''پپ تم ایک دم کوئی بے موقع سوال کیوں کر دیتی ہو؟'' وہ ذرا تلخی سے بولا۔

''ہائیں ہائیں، یہ بے موقع تو نہیں ہے۔ یہ سامنے والی پینٹنگ دو محبت کرنے والوں کی آخری ملاقات کا منظر پیش کر رہی ہے۔ آخر نجمہ خالہ سے آپ کی بھی ایک آخری ملاقات تو ہوئی ہوگی۔''

''ہاں، ہوئی تھی تو پھر؟''

''اس کی کچھ تفصیل بتایئے ناں۔'' وہ لاڈلے انداز میں بولی۔

''لیکن کیوں؟''

''سچی بتاؤں...... مجھے آپ کی اس ساری کہانی میں بڑی دلچسپی ہے۔''

''کیوں دلچسپی ہے؟''

''اس کا تو مجھے خود بھی پتا نہیں۔'' وہ عجیب لہجے میں بولتے ہوئے شہزاد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے دھوپ کا چشمہ اتار رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر شہزاد کو پھر نجمہ کی آنکھیں نظر آئیں۔ وہ بے طرح گڑبڑا گیا۔ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو عینی! میں تمہارا بڑا ہوں۔ گفتگو کرتے ہوئے تمہیں ذرا محتاط رہنا چاہیے۔''

وہ ایک دم دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ انداز احتجاج کرنے والا ہی تھا۔ ''ایک تو مجھے یہ پتا نہیں چلتا کہ ہم ہر معاملے میں چھوٹے اور بڑے کا ذکر کیوں کرنے لگتے ہیں۔ انسان بس انسان ہوتا ہے۔ وہ عمر سے چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ اسے چھوٹا یا بڑا کرنے کے کچھ اور Elements ہوتے ہیں۔''

''چلو جو کچھ بھی ہے لیکن رشتوں کے لحاظ سے ایک دوسرے کا کچھ احترام وغیرہ تو ہونا چاہیے۔''

''اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں آپ کا احترام نہیں کرتی تو یہ بالکل غلط ہے، میں آپ کا اتنا احترام کرتی ہوں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا لہجہ پھر عجیب سا ہو گیا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ ہم ہر شخص کے ساتھ ہر موضوع پر کھلم کھلا بات نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے کچھ حدیں ہوتی ہیں......''

''یہ حدیں وغیرہ سب ہماری ہی بنائی ہوئی ہیں مائی لارڈ اور ان میں سے زیادہ تر حدیں بالکل بے کار ہیں۔ ایک دم کچرا۔ میں تو یہ سمجھتی ہوں جی کہ جو بھی چیز بندے کی نیچر کے خلاف ہے وہ بالکل کچرا ہے۔ اسے کچرے میں ہی جانا ہے۔ آج نہیں تو کل چلی جائے گی کل نہیں تو پانچ سو سال بعد چلی جائے گی...... یا پھر پانچ ہزار سال بعد چلی جائے گی۔''

شہزاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے یقین

نہیں آیا کہ یہ کم عمر اوٹ پٹانگ سی لڑکی ایسی بھاری بھرکم باتیں بھی کر سکتی ہے۔ عمیر آگے جا کر ایک بڑے مجسمے کے گرد گھومنے لگا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا یہ خیال ہے مائی لارڈ! کہ ہم ہر موضوع پر بہ آسانی بات نہیں کر سکتے، میں تو ماما پاپا سے بھی ہر ''سبجیکٹ'' پر کھل کر بات کرتی ہوں۔ کلچر، آرٹ، عشق، محبت کی فیلنگز سب کے بارے میں، آپ بھی کر سکتے ہیں، مجھ سے بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں کہ میرا کوئی بوائے فرینڈ ہے یا نہیں۔ اسی طرح اپنے بارے میں بھی بتا سکتے ہیں۔'' اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

شہزاد کو اس لڑکی کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ شاید مونا لیزا کی مسکراہٹ کی طرح یہ بھی نا قابل فہم تھی۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اچھا بتاؤ، کوئی بوائے فرینڈ ہے تمہارا یا نہیں؟''

''ہے'' اس نے بلا تکلف کہا۔ ''ایک پاکستانی ہے۔ آپ کو ملواؤں گی اس سے۔ بلکہ اس کی تصویر بھی دکھاؤں گی، اس کی تصویر ہے میرے پاس۔'' شہزاد اثبات میں سر ہلا کر چپ رہا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہی پھر حسب عادت اچانک بولی۔ ''آپ کو پتا ہے کہ ارینج میرج اور لو میرج میں کیا فرق ہے۔''

''مجھے نہیں پتا۔'' شہزاد کے لہجے میں بے تعلقی تھی۔

''لو میرج'' آپ اپنی گرل فرینڈ سے کرتے ہیں اور ارینج میرج کسی دوسرے کی گرل فرینڈ سے۔'' اس نے کہا اور ہنس ہنس کر سرخ ہونے لگی۔ قریباً چار گھنٹے تک مسلسل گھومنے کے بعد وہ اس عظیم الشان میوزیم کا بس ایک مختصر حصہ ہی دیکھ سکے تھے۔ ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی تھا یہاں تک کہ مونا لیزا کی اصل پینٹنگ بھی۔ لہٰذا اگلے روز دوبارہ آنے کا پروگرام بنا۔

☆☆☆

اس روز فاخرہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔ ہاں عمیر اور احسن اپنے کیمروں سمیت ہمراہ تھے۔ کل کی طرح آج بھی عینی نے اسٹائلش ڈرائیونگ کی اور آدھ پون گھنٹے میں انہیں میوزیم پہنچا دیا۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ باہر نکلے۔ ایک دم عینی ٹھٹک گئی۔ ''اوہ آپ کو اپنے بوائے فرینڈ کی تصویر تو دکھائی ہی نہیں۔'' اس نے کہا اور پلٹ کر پھر کار کی طرف گئی، کار میں سے اس نے قریباً 12 انچ ضرب 9 انچ کا ایک کارڈ پیپر نکالا۔ اس پر ایک بلیک اینڈ وائٹ چہرہ تھا، یہ پین ورک سے بنایا گیا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ چہرے پر نقوش نہیں تھے۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' شہزاد نے کہا۔

''بس یہی ہے جی میرا بوائے فرینڈ۔ دیکھ لیں پاکستانی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''کپڑوں سے زیادہ ناک کان آنکھیں ضروری ہوتی ہیں اور وہ ہیں نہیں۔ لگتا ہے کہ تم نے بوائے فرینڈ کو پکنے نہیں دیا، کچا کچا ہی پیڑ سے اتار لیا ہے۔'' آج شہزاد بھی قدرے خوشگوار موڈ میں تھا۔

''آپ تو خود آرٹسٹ ہیں مائی لارڈ، آپ کو پتا ہونا چاہیے۔ مصور کے ذہن میں جتنی تصویر ہوتی ہے اتنی ہی کینوس پر یا کاغذ پر ٹرانسفر ہوتی ہے، باقی تو سب الٹی سیدھی لکیریں ہوتی ہیں۔''

پین ورک سے بنی ہوئی تصویر شہزاد کو دکھا کر اس نے دوبارہ گاڑی میں رکھ دی۔ وہ ایک بار پھر لوور میوزیم کے خزینوں میں غوطہ زن ہو گئے۔ مصری، یونانی، رومی، پتا نہیں کون کون سی تہذیبیں تھیں جن کے آثار بڑی خوبصورتی سے مختلف گیلریوں میں سجائے گئے تھے۔ بے شمار شاہکار دیکھنے کے قابل تھے لیکن زیادہ تر لوگوں کا رخ اس مقام کی طرف تھا جہاں مونا لیزا موجود تھی...... لوگ ایک دوسرے سے استفسار بھی کر رہے تھے کہ مونا لیزا کس جگہ ہے۔

آخر مختلف بھول بھلیوں سے گزرنے کے بعد وہ بھی مونا لیزا کے روبرو پہنچ گئے۔ یہاں دیکھنے والوں کا جمگھٹا تھا اور ایک پُرتقدس خاموشی تھی۔ اس جگہ کو ''اسٹیٹ روم'' کا نام دیا گیا تھا۔ شیشے کے پیچھے مونا لیزا خاص اہتمام سے رکھی گئی تھی۔ یہ تصویر دنیا کی مشہور و معروف اشیا میں سے ایک تھی اور ہر مشہور و معروف شے کی طرح اس کے اندر بھی ایک بارعب شناسائی کی کرنیں سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔ یہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھی۔ ''ہاں میں ہی مونا لیزا ہوں۔ میرے ہی ہونٹوں کو لیونارڈو کے برش نے لازوال و بے مثال مسکراہٹ بخشی ہے۔ مجھ پر ہی کتابیں لکھی گئی ہیں، کہانیاں تخلیق کی گئی ہیں، میں جو بھی ہوں، جیسی بھی ہوں لیکن مصوری کی دنیا میں یکتا ہوں۔''

ایک عجیب سے سحر نے شہزاد کو گرفت میں لے لیا لیکن غور کرنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شاید مونا لیزا کا سحر نہیں ہے اس کی شہرت کا سحر ہے۔

مونا لیزا سے رخصت ہو کر وہ آگے بڑھ گئے۔ اچانک ایک دروازے میں سے عینی کو کچھ نظر آیا۔ اس نے ایک دم شہزاد کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتی ہوئی میوزیم کے اندرونی احاطے کی طرف لپکی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں احسن کا ہاتھ تھا۔ عمیر کا ہاتھ تو شہزاد کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شہزاد

کو اسی طرح کھینچتی ہوئی ایک اہرام نما مقام کے قریب لے گئی۔ یہ اہرام شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اردگرد فوارے تھے۔ خوبصورت روشنی تھی اور پھول مہک رہے تھے۔ عینی نے شیشے کے قریباً چھ میٹر بلند اہرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسے پیرس کا سینٹر کہا جاتا ہے۔ یہاں تصویر اتروا کر لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔''

''تو پھر تو ہمیں بھی خوش ہونا چاہیے۔'' شہزاد نے کہا۔

''چلیں آپ کھڑے ہوجائیں عمیر اور بچونگڑے کے ساتھ ہوجائے ایک تصویر Paris Pyramios کے سامنے۔''

شہزاد نے عینی کو تصویر کھینچنے کے حوالے سے کچھ ہدایات دیں اور پھر دونوں بچوں کے ساتھ شیشے کی تکون کے پاس کھڑا ہوگیا۔ عینی نے دو تین تصویریں اتار دیں۔ اس کے بعد عینی بچوں کے ہمراہ کھڑی ہوئی اور شہزاد نے تصویریں اتاریں۔ وہ پروفیشنل تھا، اس کی اتاری ہوئی تصویریں کمال کی تھیں۔ عینی بولی۔

''ایک تصویر مجھ اکیلی کی اتاریں مائی لارڈ۔''

''وہ کیوں؟''

''بس میرا دل چاہتا ہے کہ ایک بڑا فنکار اپنے ہاتھوں سے مجھے ایکسپوز کرے۔ بعد میں، میں یہ تصویر دیکھا کروں گی اور اپنے دوستوں کو فخر سے بتایا کروں گی کہ یہ تصویر ایک عالمی شہرت یافتہ آرٹسٹ کی اتاری ہوئی ہے۔''

''زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال تصویر میں اتار دیتا ہوں۔''

دھوپ بائیں رخ سے آرہی تھی۔ شہزاد نے عینی کو خاص اینگل سے کھڑا کیا۔ اس کو کالر درست کرنے کو کہا پھر Nikon کے کیمرے کو ایڈجسٹ کرکے اس کی دو تصویریں کھینچ لیں۔ ایک تصویر واقعی بہت زبردست آئی۔ اس کی شارپ نس قابل دید تھی۔ عینی نہال ہوگئی۔

''یو آر گریٹ سر، ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں یونہی آپ کا نام نہیں ہے۔''

وہ چاروں تھک گئے تھے۔ دھوپ میں گھاس پر بیٹھ کر آئس کریم وغیرہ کھانے کا خیال انہیں اچھا لگا لیکن جس گراسی گراؤنڈ کی طرف وہ جانا چاہ رہے تھے وہاں کا ماحول کچھ ابتر نظر آیا، پودوں اور چھوٹے موٹے پیڑوں کی اوٹ میں کئی جوڑے حالت مستی میں بیٹھے ہوئے تھے یا نیم دراز تھے۔ وہ دوسری طرف نکل گئے اور چھوٹے سے باغیچے میں جا بیٹھے۔ باغیچے میں آئس کریم کھاتے ہوئے عینی نے ایک کاغذ شہزاد کی طرف بڑھایا۔ اس پر انگریزی میں کچھ لکھا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میری تازہ نظم اور اس کا موضوع ہے اجنبی پیرس۔''

شہزاد نے نظم پڑھنی شروع کی۔ اس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

پیرس اجنبی نہیں
جانا پہچانا ہے اور دیکھا بھالا ہے
اس کے سارے راستے، سارے درخت اور ساری دھوپ چھاؤں
اس کا سب کچھ مجھے ازبر ہے اور میرے دل کے قریب بھی
لیکن کل ایک ایسا عجیب مہمان میرے ساتھ تھا
جو پہلی بار ملا تھا، لیکن
اس کی وجہ سے سارا پیرس اجنبی لگا
دریائے سین کے دونوں کناروں پر موجود ہر شے
پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت نظر آئی۔

''اجنبی مہمان سے کیا مراد ہے؟'' شہزاد نے نظم پڑھ کر پوچھا۔

''آپ سب اور خاص طور سے آپ۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔

اس کے ساتھ وہ اٹھ کر ایک خوبصورت جرمن لڑکی کی طرف بھاگی، لڑکی کی عمر 25 سال کے قریب ہوگی۔ اس کی شرٹ پر سامنے کی طرف انگلش میں لکھا ہوا تھا۔ ''میں اکیلی ہوں۔''

ایسے فقروں والے پہناوے یہاں اکثر نظر آتے تھے۔ عینی اس قبول صورت لڑکی سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔ بات کرتے ہوئے وہ چند بار ہنس ہنس کر دہری ہوئی۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں شہزاد کی طرف بھی اشارہ کیا۔

جرمن لڑکی بھی ہنس رہی تھی پھر وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر اپنے راستے پر بڑھ گئی۔ عینی بھی واپس آگئی۔ ''کیا گپ شپ ہورہی تھی؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''اگر بتایا تو آپ ماریں گے۔'' وہ سرخ چہرے کے ساتھ شوخ لہجے میں بولی۔

''اچھا بتاؤ، کچھ نہیں کہتا۔''

''وعدہ؟'' شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ عینی نے بڑی ادا سے شہزاد کی بند چھتری اس کے پاس سے اٹھا کر دور رکھ دی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ شہزاد چھتری سے ہی اسے مارنا شروع کردے گا۔

''چلو ایکٹنگ نہ کرو، بتاؤ۔'' شہزاد نے ذرا تحکم سے کہا۔

''نہیں آپ ماریں گے۔'' وہ پھر ٹھٹکی۔

''بھئی، تم سے وعدہ کیا ہے ناں۔''

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد کھٹاک سے بولی۔ ''اس جرمن دوشیزہ سے آپ کی شادی کی بات کررہی تھی۔ بس ایک انچ کی کسر رہ گئی ورنہ ہوسکتا تھا کہ معاملہ فکس ہوہی جاتا۔''

''کیا الٹی سیدھی ہانک رہی ہو۔'' شہزاد کے چہرے پر سنجیدگی آگئی۔

''دیکھیں مائی لارڈ...... عدالت کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا۔ میں تو آنٹی فاخرہ کی خواہش پر عمل کررہی ہوں یا کہہ لیں کہ عمل کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔''

''آنٹی فاخرہ نے کیا کہا تھا؟''

''مختصر بتاؤں یا تفصیل سے؟'' اس نے مودب نظر آنے کی اداکاری کی۔

''تمہارا مختصر بھی بڑا تفصیلی ہوگا۔ اس لیے مختصر ہی بتاؤ۔''

''عمیر اور احسن کچھ فاصلے پر کشتی میں مصروف تھے۔ وہ آلتی پالتی مار کر بولی۔ ''آج صبح جب آپ واش روم میں تھے، میں آنٹی کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کررہی تھی۔ وہ انکار کرتی جارہی تھیں۔ میں نے کہا، آنٹی فاخرہ ان مردوں کا کوئی بھروسا شروسا نہیں ہوتا۔ آپ اگر ان کے ساتھ یہاں آئی ہیں تو پھر ساتھ ساتھ ہی رہیں۔ یہ نہ ہو کہ یہ یہاں کوئی گڑبڑ کردیں۔ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ یہ کوئی ایسا کام کریں بلکہ بڑے عرصے سے چاہ رہی ہوں۔ یہ خود ہی اس طرف نہیں آتے۔ میں نے کہا آنٹی اگر آپ واقعی اس معاملے میں سنجیدہ ہیں تو پھر اس کے لیے پیرس سے بہتر جگہ کوئی نہیں۔ یہاں آکر تو سو سال کے بوڑھوں میں بھی رومانس کی حس جاگ جاتی ہے اور وہ شادی کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ آنٹی میری باتوں پر ہنستی جارہی تھیں، کہنے لگیں، تم ان معاملوں میں کافی تیز لگتی ہو، اپنے انکل کے لیے کوئی اچھی سی میم ڈھونڈو۔ میری طرف سے تمہیں کھلی اجازت ہے۔ تو جناب! مائی لارڈ میں نے اسی سلسلے میں تھوڑی سی کوشش کی تھی۔''

''باتیں تو تم واقعی مار کھانے والی کررہی ہو لیکن......''

''لیکن میں وعدہ کرچکا ہوں اس لیے کیا ہوسکتا ہے۔''

اس نے شہزاد کا فقرہ جلدی سے مکمل کردیا اور ہنستی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔

شہزاد کو فاخرہ کی فکر لگی رہتی تھی۔ وہ سہ پہر ہوتے ہی واپس ہوٹل پہنچ گئے۔ ٹانگوں کے درد کے ساتھ ساتھ فاخرہ کو ہلکا سا بخار ہوچکا تھا۔ ٹانگوں کے درد اور بخار کا تعلق تھا اور اکثر ایسا ہوجایا کرتا تھا۔ تمام ضروری دوائیں شہزاد ساتھ لے کر آیا تھا۔ انجکشن وغیرہ بھی وہ خود لگالیتا تھا۔ لہٰذا وہ فاخرہ کی تیمارداری میں لگ گیا۔

اگلی صبح فرزانہ، اس کی دونوں بیٹیاں اور داماد ریحان فاخرہ کی تیمارداری کے لیے آئے تھے۔ وہ بہت سا پھل اور سامان خورونوش بھی ساتھ لائے تھے۔ فاخرہ کی تکلیف دیکھتے ہوئے فرزانہ نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ وہ لوگ ہوٹل چھوڑ دیں اور ان کے ساتھ گھر چلیں مگر شہزاد کے نزدیک یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کے قیام وطعام کا بیشتر خرچا اسے مدعو کرنے والا ادارہ اٹھا رہا تھا۔

فرزانہ نے شہزاد سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''اگر گھر نہیں جانا تو پھر عینی کو یہاں رکھو۔ یہ فاخرہ کی دیکھ بھال کرلے گی۔''

''میں اس سب کا عادی ہوں فرزانہ۔ میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

''لیکن یہ پردیس ہے۔ دیس اور پردیس میں فرق ہوتا ہے۔'' فرزانہ نے جواب دیا۔

باقی سب چلے گئے مگر عینی وہیں رہی اور اس کی وجہ سے واقعی کئی آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ فاخرہ کو جب یوں بخار ہوتا تو سات آٹھ دن ضرور چلتا تھا۔ ماں کی بیماری کی وجہ سے بچوں پر افسردگی چھا جایا کرتی تھی تاہم اس دفعہ عینی نے فاخرہ سمیت کسی کو افسردہ نہیں ہونے دیا۔ تین چار دن کے اندر وہ گھر کا ایک فرد ہی نظر آنے لگی۔ کبھی فاخرہ کو دوا کھلا رہی ہے، کبھی بچوں کے کپڑے بدل رہی ہے۔ کبھی رات گئے شہزاد کو الیکٹرک کیٹل میں چائے بنا کردے رہی ہے۔ رات گئے سے مراد دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ مقامی دستور کے مطابق شام سات آٹھ بجے تک ڈنر کرلیا جاتا تھا۔ کبھی دس بجے کے قریب شہزاد کھڑکی سے باہر جھانکتا تو لگتا کہ سارا پیرس سویا پڑا ہے۔ تمام بازار سرشام ہی بند ہوجاتے تھے، بس کہیں کہیں ہوٹل ...... وغیرہ کھلے رہ جاتے تھے یا پھر مخصوص جگہوں پر نائٹ لائف کی سرگرمی ہوتی تھی اور یہ صورت حال کوئی پیرس کے ساتھ ہی خاص طور پر نہیں تھی، قریباً پورا یورپ جلدی سونے اور جلدی جاگنے کے فارمولے پر عمل کرتا نظر آتا ہے۔ صرف

ویک اینڈز پر لوگ دیر تک جاگتے ہیں لیکن یہ دیر تک جاگنا بھی بس رات بارہ ایک بجے تک ہی ہوتا ہے۔ شہزاد کو تو خیر یہ باتیں پہلے سے معلوم تھیں لیکن فاخرہ اور بچے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ وہ غروب آفتاب کے وقت ہی لوگوں کو کینڈل ڈنر کرتے دیکھتے تو دانتوں میں انگلیاں داب لیتے۔ شروع میں تو عمیر کا خیال یہ تھا کہ یہ لوگ ڈنر نہیں بلکہ لیٹ لنچ کر رہے ہیں۔

ایک دن احسن نے فرمائش کی کہ وہ صبح ناشتے میں پائن ایپل کیک پیسٹری کھائے گا۔ یہ شام چھ ساڑھے چھ بجے کا وقت تھا لیکن عینی اسی وقت بیکری جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شہزاد نے کہا۔ ”بھئی ابھی تو ناشتے کا وقت ہونے میں تیرہ چودہ گھنٹے باقی ہیں۔ اتنی جلدی کیا ہے؟“

”ناشتے میں تیرہ چودہ گھنٹے ہیں لیکن دکانیں بند ہونے میں صرف آدھا گھنٹا باقی ہے۔ یہاں ناشتا اسی وقت خریدا جاتا ہے مائی لارڈ۔“

وہ جانے کے لیے تیار ہوئی تو شہزاد اور احسن بھی چل پڑے۔ ڈپارٹمنٹل اسٹور زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک ذیلی سڑک پر وہ ترک مسجد کے پاس ہی تھا۔ وہ ایک نہایت صاف شفاف، ہر لحاظ سے نیم آلودہ شام تھی، چمکیلی کاریں چمکیلی سڑکوں پر پھسلتی جا رہی تھیں۔ اکثر یورپی شہروں کی طرح پیرس میں بھی ٹریفک کا نظام بہترین ہے۔ چھوٹی چھوٹی اندرونی سڑکوں پر بھی سگنل اور زیبرا کراسنگ وغیرہ موجود ہیں۔ بیشتر زیبرا کراسنگ پر ٹریفک سگنل ہوتے ہیں پیدل چلنے والوں کے لیے لیکن کچھ پر نہیں بھی ہوتے۔ ایسے جونہی پیدل چلنے والے کا پاؤں زیبرا کراسنگ کو چھوتا ہے سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ خود کو روک لیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے والوں کو بھی گاڑیوں کے حقوق کا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ شہزاد نے نوٹ کیا تھا کہ اگر پیدل چلنے والے رولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سڑک کراس کرنے کی کوشش کریں تو گاڑی سواران کو قطعاً رعایت نہیں دیتے۔ وہ بڑے زناٹے کے ساتھ سامنے سے یا پیچھے سے گزر جاتے ہیں۔

اس دن بھی شہزاد سے ایسی ہی غلطی ہوئی۔ وہ پانچ چھ سال کی ایک نہایت ہی خوبصورت سائیکل سوار بچی کو دیکھ رہا تھا، اس لیے ٹریفک سگنل پر غور نہ کر سکا۔ اس نے زیبرا کراسنگ پر دو تین قدم ہی بڑھائے تھے کہ ایک کار کے پہیے چرچرائے اور وہ لہراتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر گئی۔ عین وقت پر شہزاد نے ایک جھٹکے سے اپنے قدم روکے اور خود کو پیچھے ہٹا لیا تھا۔

”اوہ گاڈ۔“ عینی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

عمیر بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔ ”آج تو آپ واقعی پروفیسر لگے۔“ عینی نے لرزتی آواز میں کہا۔

”پتا نہیں چلا۔“ شہزاد منمنایا۔ اس نے اپنی گردن عقب سے تھامی ہوئی تھی۔ ایک دم پیچھے ہٹنے کی کوشش میں اس کی گردن کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

وہ پیسٹریاں اور بسکٹ وغیرہ لے کر ہوٹل واپس پہنچے۔ شہزاد کی گردن میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا لیکن اس نے کسی کو بتایا نہیں۔ فاخرہ نے دوا کھائی تھی لہٰذا سر شام ہی سو گئی تھی۔ اس کی بوجھل سانسوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ شہزاد نے اس کے بیڈ روم کا دروازہ ہولے سے بند کر دیا تاکہ وہ ڈسٹرب نہ ہو۔

وہ چاروں کچھ دیر ٹی وی دیکھتے رہے پھر کارڈ کھیلنے لگے۔ اسی دوران میں عمیر نے اٹیچی کیس میں سے لوڈو نکال لی۔ شہزاد کا خیال تھا کہ عینی کو لوڈو کھیلنا نہیں آتا ہوگا مگر اسے آتا تھا۔ عمیر احسن اور وہ کھیلنے لگی پھر انہوں نے زبردستی شہزاد کو بھی شریک کر لیا۔ عمیر بڑا تیز تھا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے برتری حاصل کر لی۔ شہزاد کی باری آئی تو عینی نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی انگلی شہزاد کے گھٹنے پر چبھوئی اور اسے اشارتاً بتایا کہ وہ اپنی تیسری گوٹی کو محفوظ خانے میں لے جائے ورنہ عمیر اسے پیٹ دے گا۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ شہزاد نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ اچانک شہزاد کے ذہن میں پھلجھڑی سی چھٹ گئی۔ ایسا پہلے بھی تو ہوتا رہا تھا...... بالکل اسی انداز میں...... اسی ادا کے ساتھ...... کوئی اسی طرح...... کھیل میں بڑی ہمدردی سے اسے خاموش مشورے دیا کرتا تھا۔ مگر یہ بہت پہلے کی بات تھی۔

وہ چونک کر عینی کو دیکھنے لگا۔ وہ بڑی محویت سے اپنی باری لینے میں مصروف تھی۔ اچانک شہزاد اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”کیا ہوا ابو جی۔“ عمیر اور احسن ایک ساتھ بولے۔

”کچھ نہیں، تم کھیلو۔ میری گردن میں درد ہو رہا ہے۔ میں ذرا آرام کرتا ہوں۔“

عینی بولی۔ ”میں سمجھ گئی ہوں۔ یہ درد سڑک کو غلط طریقے سے پار کرنے کی وجہ سے ہے۔ میں اسی وقت سمجھ گئی تھی، چلیں آپ لیٹیں، میں پیچھے سے آپ کی گردن کے مسلز دباتی ہوں۔“

”نہیں، نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔ بس آرام کر لوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

وہ انہیں کھیلتا چھوڑ کر چھوٹے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ عینی اور نجمہ کی آنکھوں کی حیرت انگیز مشابہت اس کے ذہن میں چکرانے لگی اور اب بات صرف آنکھوں کی نہیں تھی۔ عینی کی کئی اداؤں میں اسے نجمہ کی جھلک نظر آتی تھی اور وہ گاہے بگاہے نہ چاہنے کے باوجود نجمہ کو یاد کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اب بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو شہزاد کو لگا تھا جیسے اس کے گھٹنے کو بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی انگلی سے چھونے والی عینی نہیں نجمہ تھی۔

وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا ورنہ جنموں وغیرہ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا۔ جنموں کی بات تو دور کی تھی، وہ کسی بھی فرسودہ خیال کو ذہن میں جگہ دینے والا بندہ نہیں تھا۔ ہاں یہ بات اسے ضرور تسلیم تھی کہ کچھ چیزیں انسان کے خون میں نسل در نسل سفر کرتی ہیں۔ کچھ جذبے، کچھ خیال ایک پود سے دوسری اور پھر تیسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ عینی عجیب انداز میں اس سے وابستگی کا اظہار کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ اگلی پیڑھی سے تھی۔ کیا یہ بھی ایک نسل سے دوسری نسل تک خون میں سفر کرنے والا کوئی ایسا ہی بے نام جذبہ تھا۔

وہ بستر پر لیٹا سوچتا رہا کہ پھر اسے نیند آ گئی۔ وہ قریباً ایک گھنٹا سویا۔ آنکھ کھلی تو وہ اوندھا لیٹا تھا۔ کوئی ہولے ہولے اس کی گردن کے عقبی حصے کو دبا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے مڑ کر دیکھا، یہ عینی تھا۔

”او ہو رہنے دو۔“ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

”آپ زیادہ باتکلف بننے کی کوشش نہ کریں۔“ وہ تحکم سے بولی۔ ”خاموشی سے لیٹے رہیں۔“ اس کے دبانے سے شہزاد کو واقعی سکون مل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سارے پٹھے کھنچ گئے ہیں۔ گردن اکڑی ہوئی لگتی تھی۔

”لگتا ہے کہ اب بڑھاپا حاوی ہو رہا ہے۔“ شہزاد نے ہولے سے کہا۔ ”معمولی سا جھٹکا تھا مگر لگتا ہے کہ دوسری منزل سے چھلانگ لگائی ہے۔“

”بڑھاپا نہیں ہے مائی لارڈ، تین چار ہفتے پہلے میرے ساتھ ایسا ہو گیا تھا۔ سائیکل پر سے گری حالانکہ بالکل سوفٹ جگہ تھی، گھاس اگی ہوئی تھی پھر بھی گردن کو ایسا جھٹکا لگا کہ تین چار دن کلاسز ہی نہیں لے سکی۔ امی نے صبح شام وکس ملی پھر کچھ بہتری آئی۔“

”تو گھر والے تمہیں سائیکل چلانے دیتے ہیں؟“

”سائیکل کیا، میں ہوائی جہاز چلانے کا کہہ دوں تو بھی انہیں ماننا پڑے گا۔ میری بات کوئی ٹال نہیں سکتا جی۔ بڑی ضدی قسم کی لڑکی ہوں۔ اس کے علاوہ میری ایک ویٹو پاور بھی ہے۔“

”ویٹو پاور...... وہ کیا؟“

”آپ خود اندازہ لگائیں۔“

”کیا مقامی قانون کے مطابق کوئی سہولت حاصل ہے؟“

وہ ہنسی۔ ”ایسی سہولتیں تو یہاں ہوتی ہی ہیں مائی لارڈ لیکن میں کوئی اور بات کر رہی ہوں۔“

”اچھا...... بتاؤ گی یا پہیلیاں بجھواؤ گی؟“

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہ کر بولی۔ ”اچھا رہنے دیں پھر کبھی بتاؤں گی......“

شہزاد نے بھی زیادہ استفسار نہیں کیا۔ وہ چونک کر بولی۔ ”اوہ...... آپ نے باتوں میں بات ہی بھلا دی۔ میں وکس کی بات کر رہی تھی۔ ادھر بھی ایک ایسی آئنٹمنٹ پڑی ہے۔ میں ابھی لاتی ہوں۔ تھوڑا سا ملوں گی تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“

شہزاد اسے منع کرتا رہ گیا۔ وہ جلدی سے گئی اور مرہم لے آئی۔ شہزاد اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ہلنے جلنے سے اسے پھر درد ہونے لگا تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ تھوڑا سا مرہم لگوا ہی لے۔ وہ پھر اوندھا لیٹ گیا۔ اس کی قمیص کو شانوں سے پیچھے ہٹا کر وہ بڑی مہارت اور نرمی سے گردن کا مساج کرنے لگی۔ اس کے بال آگے کو جھول کر بار بار شہزاد کے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ شہزاد کو اس سے بیزاری ہو رہی تھی۔ ایک دو منٹ بعد شہزاد بولا۔

”اب بس کرو، تھک جاؤ گی۔“

”آپ کا کام کرتے ہوئے میں کبھی نہیں تھک سکتی، مائی لارڈ۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

شہزاد کو الجھن ہونے لگی۔ وہ ایسے لہجے میں کیوں بات کرتی تھی اس سے؟ قبل اس کے کہ شہزاد کچھ کہتا، اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ اس کے کندھوں پر مالش کرتے ہوئے بولی۔

”جناب عالی، جب آپ تصویر اتار رہے ہوتے ہیں ناں، میں آپ کو دیکھتی رہتی ہوں۔ آپ کے کھڑے ہونے کا انداز، آپ کی انگلیاں، آپ کا چہرہ...... اور پتا ہے مجھے کیا لگتا ہے؟ مجھے لگتا ہے کہ میں کسی لیجنڈ کو لائیو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے انٹرنیشنل میگزینز میں پرنٹ ہونے والے آپ کے معروف فوٹو گرافرز یاد آ جاتے ہیں۔“

''ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بڑا بڑا اچھا کام کرنے والوں سے دنیا بھری ہوئی ہے۔ ہم کسی شمار قطار میں نہیں ہیں۔''

''یہ تو آپ کی انکساری ہے۔''

''اچھا چلو چھوڑو اب۔ کافی ہوگیا۔'' شہزاد نے ایک بار پھر اٹھنے کا ارادہ کیا۔

وہ بولی۔ ''بس دو منٹ اور..... گھڑی دیکھ کر۔''

وہ مرہم گردن کے مساموں میں جذب کر رہی تھی اور اسے درد میں افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسی کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''اچھا، اگر میں آپ ہی کی طرح بننا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''سنجیدہ ہونا ہوگا، باتیں کم کرنی ہوں گی، پڑھائی کی طرف خیال رکھنا ہوگا اور..... محنت۔''

''ٹھیک ہے مائی لارڈ۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی پھر جیسے ایک دم اس کے ذہن میں نیا خیال آیا اور وہ چہکی۔ ''کیا یہ نہیں ہوسکتا مائی لارڈ کہ آپ مجھے اپنا شاگرد بنالیں۔ پکا پکا شاگرد۔''

''یہ پکا پکا شاگرد کیا ہوتا ہے؟''

''مطلب یہ کہ میں ہر وقت آپ کے ساتھ رہوں۔ آپ کو ہر لحاظ سے پورا پورا فالو کروں۔ آپ سے ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سیکھوں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ہاں واقعی، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' وہ قدرے اداسی سے بولی۔

پھر ایک دم نہ جانے کیا ہوا، اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ ایک مرتبہ ہنسنا شروع ہوئی تو پھر ہنستی چلی گئی۔ وہ ہنسی روکنے کی کوشش میں دہری ہوئی جا رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہوگیا اور بال آگے کو بکھر گئے۔

''کیا ہوا؟'' شہزاد نے اپنے سینے کو کہنیوں کے بل تھوڑا سا اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے بہ مشکل کہا۔ ''بس یونہی ایک خیال ذہن میں آ گیا تھا۔''

''کیسا خیال؟''

''بس یونہی۔'' اور اس پر ایک بار پھر ہنسی کا اٹیک ہوگیا۔ ساتھ ساتھ وہ گردن کی مالش بھی کرتی جا رہی تھی۔

شہزاد اس سے ہنسی کی وجہ..... پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اسی دوران میں دروازے پر کال بیل ہوگئی۔ نو بج چکے تھے۔ شہزاد نے خیال کیا کہ بیرا ہوگا۔ ساتھ والے کمرے میں عمیر اور احسن ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ شہزاد نے آواز دی۔

''عمیر، دروازے پر دیکھو۔''

''بھائی تو سو گیا۔'' احسن نے بتایا۔

''تو تم دیکھ لو بچونگڑے۔'' عینی نے کہا۔ اب وہ اپنی ہنسی کو بریک لگانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ احسن دروازے پر گیا۔ چند لمحوں بعد شہزاد کو محسوس ہوا کہ کوئی اندر آ گیا ہے۔ ایک دم عینی چہکی۔

''اوہ ماموں جان...... آپ؟''

شہزاد نے جلدی سے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اس وقت یہاں اس کمرے میں شارق کو دیکھے گا۔ اس کی معلومات کے مطابق تو شارق آج کل انگلینڈ میں تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور قمیص کے بٹن بند کرنے لگا۔ وہ آج شارق کو قریباً آٹھ نو سال بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے موٹا ہوگیا تھا۔ جبڑوں کے نیچے کافی گوشت آ گیا تھا، کنپٹیاں سفید ہو چکی تھیں۔ ایک تہائی سر بالوں سے خالی ہوگیا تھا۔ بال اتر جانے سے سر پر لگی ہوئی ایک چوٹ بھی نمایاں ہوگئی تھی۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ اس نے چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ سجانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''ہیلو پروفیسر صاحب۔''

شہزاد بغلگیر ہونا چاہ رہا تھا مگر شارق کا انداز دیکھتے ہوئے اس نے بھی مصافحے پر اکتفا کیا۔ فاخرہ کی کھانسی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی جاگ گئی ہے۔ عینی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''آنٹی، دیکھیں کون آیا ہے۔'' کچھ دیر بعد وہ سب فاخرہ کے بیڈ کے اردگرد بیٹھے تھے۔

شارق نے بتایا کہ وہ آج صبح ہی یہاں پہنچا ہے۔ یہاں قریب ہی دو مقامی دوستوں نے ایک اوپن ایئر ریستوران میں پارٹی دے رکھی تھی۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ ادھر آ گیا ہے کیونکہ فرزانہ نے بتایا تھا کہ ہم یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

وہ سب وہاں بیٹھ کر وہی باتیں کرتے رہے جو آٹھ نو سال بعد ملنے والے قریبی رشتے دار آپس میں کرسکتے ہیں۔ فلاں کراچی میں کیا کر رہا ہے، فلاں کے بیٹے کی شادی کس کی بیٹی کے ساتھ ہونے والی ہے۔ فلاں کا کاروبار کیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔ شہزاد واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ شارق کے لہجے میں سرد مہری ہے۔ وہ صرف خانہ پوری کے لیے گفتگو جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس نے کچھ چبھتی ہوئی سی باتیں بھی کیں۔

شہزاد اس سے ایسی ہی توقع رکھ سکتا تھا۔ شارق کا یہ کہنا بھی غلط تھا کہ وہ خاص ان سے ملنے کے لیے یہاں آیا ہے۔ وہ غالباً عینی کو لے جانے کے لیے آیا تھا۔

جلد ہی مدعا اس کی زبان پر آ گیا۔ وہ عینی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''چلو بھئی پھر چلیں، تمہاری ماما نے کہا تھا کہ آتے ہوئے اسے ساتھ ہی لے آنا۔ تمہارے پاپا کا بھی فون آیا تھا۔''

احسن بولا۔ ''نہیں نہیں انکل، ہم نہیں جانے دیں گے باجی کو۔ ہم نے تو صبح کیک پیسٹریوں کا بریک فاسٹ کرنا ہے اور دریا میں کشتی بھی چلانی ہے۔''

''ٹھیک ہے ماموں میں کل آ جاؤں گی۔'' عینی نے کہا۔

''بھئی تمہاری ماما نے تاکید کی تھی۔'' شارق کے چہرے پر ہلکی سی سرخی لہرا گئی۔

''ماما سے میں خود بات کرلیتی ہوں ماموں۔'' وہ ٹھنکی۔

''چلیں رہنے دیں شارق بھائی۔'' فاخرہ نے بھی سفارش کی۔

شارق جز بز نظر آ رہا تھا۔ شہزاد کا دل بھی یہی چاہ رہا تھا کہ وہ چلی جائے لیکن وہ اڑ گئی۔ آخر شارق اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے کل شام تک آ جانا یا ہوسکتا ہے کہ میں خود ہی لینے آ جاؤں۔''

''میں فون کر دوں گی۔''

شارق کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ اسے فون والی بات پسند نہیں آئی تھی۔ اس میں امکان نظر آتا تھا کہ شاید وہ کل بھی نہیں آئے گی۔ بہرحال وہ کچھ بولا نہیں اور سنی ان سنی کرتا ہوا رخصت ہوگیا۔

شارق کی اس اچانک آمد نے شہزاد کے ذہن میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ کئی پرانے زخم تازہ ہوگئے تھے۔ اسے لگا جیسے ابھی کل ہی کی بات ہے، جب نجمہ زندہ تھی۔ وقت کی تیز ہوا چل رہی تھی مگر ان کے دلوں میں آس امید کے چراغ بھی روشن تھے پھر ان چراغوں کو بجھانے کے لیے شارق پھنکارتا ہوا آگے بڑھا تھا۔ اس کی ساری ستم ظریفیاں شہزاد کو یاد آ گئیں اور وہ منظر بھی یاد آیا جب نجمہ سے ملنے کی پاداش میں شارق نے اسے ایک ویران جگہ پر گھیر لیا تھا۔ اس کا ایک غنڈہ دوست راجا بھی اس کے ساتھ تھا۔ انہوں نے شہزاد کو دہشت زدہ کرنا چاہا تھا اور شاید وہ ہو بھی جاتا لیکن جب شارق نے اسے باپ کی گالی دی تو شہزاد سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ ان تینوں کے درمیان زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی کی یادگار ایک زخم ابھی تک شہزاد کی کلائی پر ایک کٹ کی صورت میں موجود تھا۔ درست کہتے ہیں کہ ہاتھ سے لگائے گئے زخم ٹھیک ہو جاتے ہیں لیکن زبان کے لگائے گئے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں۔

کچھ دن پہلے جب پیرس یاترا شروع ہوتے ہی فرزانہ شہزاد اور اس کے بچوں کے پاس آ دھمکی تھی تو شہزاد کو کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی جو آج سامنے آئی تھی۔ شہزاد جانتا تھا کہ بے شک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے لیکن نفرت اور عداوت کی سیاہ چٹانیں ایک زمانہ گزر جانے کے بعد بھی اپنی جگہ موجود ہیں اور آج یہاں شارق کی آمد اور اس کے رویے سے اس کا ثبوت مل بھی گیا تھا۔ شہزاد کو یاد آیا کہ جب شارق اندر آیا تو عینی بے تکلفی کے ساتھ اس کے کندھوں کی مالش کرنے میں مصروف تھی۔ شاید شارق نے یہ منظر بھی دیکھا تھا اور اسی منظر نے اس کے رویے کو مزید خشک کر دیا تھا۔

بے شک شہزاد بڑا نام کما چکا تھا۔ بڑی کامیابیاں حاصل کر چکا تھا۔ اس نے فاخرہ کو شریک حیات بنا کر ایثار کی ایک اعلیٰ مثال بھی قائم کی تھی لیکن شارق اور اس کے ہم خیالوں کے نزدیک تو وہ اب بھی گھٹیا...... پینڈو...... اور جنگلی ہی تھا۔ ایک ایسا گھٹیا، کمتر بندہ، عینی سے اپنی خدمت کرا رہا تھا یقیناً یہ صورت حال شارق جیسے بندے کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی۔

عینی ابھی جانا نہیں چاہتی تھی لیکن شہزاد نے اسے آمادہ کرلیا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کسی طرح کا کوئی تناؤ پیدا ہو۔ ویسے بھی عینی کی یہاں موجودگی اسے خوامخواہ الجھن میں مبتلا کرتی تھی۔ شام کو شارق کے ساتھ فرزانہ اور عینی کی بڑی بہن زارا بھی چلی آئیں۔ وہ فاخرہ کی عیادت کرنے آئی تھیں۔ شہزاد نے صاف محسوس کیا کہ شارق کی موجودگی میں فرزانہ اور زارا وغیرہ زیادہ بے تکلفی سے بات نہیں کر رہی تھیں۔ شہزاد نے روم سروس والوں کو کال کر کے کافی اور اسنیکس وغیرہ منگوائے۔ اسی دوران میں فاخرہ اٹھ کر فریج سے کولڈ ڈرنک کی بوتل نکالنے لگی۔ پتا نہیں کہ اس کا پاؤں رپٹا یا ویسے ہی چکر آیا، وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ شہزاد اور عینی اضطراری حرکت کے ساتھ اس کی طرف لپکے۔ عینی نے اسے پشت کی طرف سے تھامنے کی کوشش کی اگر وہ ایسا نہ کرتی تو فاخرہ کا سر بڑے زور سے تپائی کے ساتھ ٹکراتا پھر بھی اپنا وزن سہارنے کی کوشش میں فاخرہ کا سارا بوجھ اس کے دائیں ہاتھ پر

آ گیا۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔

انہوں نے اسے سنبھال کر دوبارہ بیڈ پر لٹایا۔ شہزاد اسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

''کتنی دفعہ کہا ہے سونم، خود نہ اٹھا کرو۔ کوئی مجبوری ہو تو پھر بھی الگ بات ہے۔ مجھے کہنا تھا میں نکال دیتا بوتل۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ شہزاد نے ہاتھ کو ہلا جلا کر دیکھا۔ ہڈی بچ گئی تھی تاہم کلائی مڑنے کی وجہ سے پورا بازو لرز رہا تھا۔ کچھ دیر بعد تھوڑی سی سوزش بھی ہوگئی۔ عینی نے کل والی آئنٹمنٹ لگا کر تھوڑی سی مالش کی۔ شہزاد نے اس پر لچک دار پٹی باندھ دی۔

عینی واپس جانے کے لیے آمادہ ہو چکی تھی لیکن اس نئے واقعے کے بعد وہ تذبذب میں نظر آئی۔ اس نے فرزانہ سے کہا۔

''ماما! اگر آپ کہیں تو میں کل کا دن اور نہ رہ لوں؟''

فرزانہ نے چند لمحے سوچ کر کہا۔ ''یا پھر میں رہ لیتی ہوں۔''

''لیکن آپ نے تو کل ڈینٹسٹ سے ٹائم لیا ہوا ہے۔'' زارا نے یاد دلایا۔

''ویسے کوئی ایسا مسئلہ تو نہیں ہے۔'' شارق جلدی سے بولا۔ ''پٹھے میں تھوڑا سا کھنچاؤ آیا ہے، صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔''

شہزاد اور فاخرہ بھی کہنے لگے کہ ایسی کوئی بات نہیں، وہ لوگ تسلی سے جائیں لیکن عینی نے کہا کہ نہیں وہ کم از کم کل کا دن یہاں رکے گی۔ اس نے فرزانہ کو بھی نیم رضا مند کر لیا۔ فرزانہ نے بھی کہہ دیا کہ ٹھیک ہے کل دوپہر تک آ جانا۔

شارق اس دوران میں خاموش بیٹھا رہا لیکن اس کے چہرے کی سرخی اس کے اندر کی اتھل پتھل کا موہوم سا سراغ دے رہی تھی پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ گرج کر بولا۔

''اٹھو عینی! یہاں کوئی ایسا سیریس مسئلہ نہیں ہے۔ زیادہ پریشانی ہے تو کل آفٹرنون میں پھر چکر لگا لینا۔'' اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

یہ تحکمانہ لب ولہجہ کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ خاص طور سے عینی کو تو بالکل بھی نہیں۔ اس نے پہلے ذرا تعجب سے ماموں کی طرف دیکھا پھر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ماموں کے ایک دم بھڑک اٹھنے پر حیران تھی۔ وہ ماضی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی پھر بھی کم جانتی تھی۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ماموں، آپ کیوں بگڑ رہے ہیں۔ میں نے کہا ہے ناں کل شام تک آ جاؤں گی۔''

''نہیں، ابھی چلو۔ کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں یہاں رہنے کی۔'' شارق کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

''ضرورت ہے ماموں۔'' عینی نے بھی فیصلہ کن لہجہ اختیار کر لیا۔

اس سے پہلے کہ شہزاد مداخلت کرتا۔ شارق بالکل آگ بگولا ہو گیا۔ وہ جنونی انداز میں بولا۔

''نہیں ہے ضرورت...... نہیں ہے...... تم کل کی بچی ہو۔ تم کچھ نہیں جانتی ہو۔ تمہیں کچھ پتا نہیں ہے ان لوگوں کا۔ کچھ پتا نہیں ہے۔''

''ماموں۔'' عینی کے لہجے میں احتجاج تھا اور حیرت تھی۔

''چپ رہو۔ تم کیا جانتی ہو اس بندے کے بارے میں۔'' وہ دھاڑا اور انگلی سے سیدھا شہزاد کی طرف اشارہ کیا پھر وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''تم کچھ نہیں جانتی ہو۔ یہ بندہ کیا ہے۔ مجھے پتا ہے...... مجھے پتا ہے۔'' اس نے زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ بارود کا کوئی ڈھیر تھا جو ایک دم ہی اس کے اندر پھٹ گیا تھا۔

''شارق، تم ہوش سے بات کرو۔'' شہزاد کہے بغیر نہ رہ سکا۔ سب سناٹے میں تھے۔

''ہاں میں ہوش میں ہوں اور بڑے عرصے سے ہوش میں ہوں تمہیں...... شرم آنی چاہیے اپنے آپ پر۔ تم بدنیت ہو...... گندے ہو...... ہمیشہ کے ایسے ہو۔'' جو کچھ منہ میں آیا وہ جنونی انداز میں کہتا چلا جا رہا تھا۔

''شارق، منہ سنبھال بات کر۔'' شہزاد پھر پھنکارا۔

''کس کو کہہ رہا ہے گندا؟''

''اسی کو کہہ رہا ہوں جس کا ذہن گندا ہے، جس کا خون گندا ہے۔ جس نے ہمیشہ خاندان کی عزت اچھالی ہے۔''

شہزاد سے برداشت نہیں ہوا۔ اس نے شارق کا گریبان پکڑ لیا۔ فاخرہ، فرزانہ اور عینی چلائیں۔ بچے بھی دہشت زدہ ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بات اتنی بڑھ جائے گی کسی کے خیال میں نہیں تھا۔ اپنے گریبان پر شہزاد کے ہاتھ پڑتے ہی شارق نے فون سیٹ اٹھا کر شہزاد کے چہرے پر دے مارا۔ شہزاد پشت کے بل ٹیبل لیمپ پر جا گرا۔ ٹیبل لیمپ کا بلب چٹاخ کے ساتھ پھٹا اور لکڑی کا لیمپ دو ٹکڑے ہو گیا۔ فرزانہ چلاتی ہوئی دونوں کے درمیان آ گئی۔

''خدا کے لیے نہیں...... خدا کے لیے نہیں۔''

اسی دوران میں شارق کے ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے لیمپ کا قریباً تین فٹ لمبا چوبی ٹکڑا آ گیا۔ اس نے اس وزنی ٹکڑے سے بے دریغ شہزاد کے سر پر ضرب لگائی۔ پہلی ضرب پھر دوسری پھر تیسری۔ وہ اس وقت شاید جنون کی حالت میں تھا۔ مدتوں سے اس کے اندر اکٹھا ہونے والا زہر ایک زبردست اُبال کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔ شہزاد تیورا کر گر پڑا۔ ساری عورتیں چلاتی ہوئی ان دونوں کے درمیان آ گئیں۔ اسی دوران میں باہر سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ وہ ہوٹل کے ملازمین تھے جو فرانسیسی میں پکارتے ہوئے آ رہے تھے......

شہزاد تقریباً نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہوٹل ملازمین اندر گھس آئے اور بپھرے ہوئے شارق کو شہزاد کے پاس سے ہٹا کر دور لے گئے۔ شارق اب بھی دھاڑ رہا تھا۔ ''میں تیرے ہاتھ پاؤں توڑ دوں گا، جان سے مار دوں گا تجھے۔ اپنی عمر دیکھ اپنے کرتوت دیکھ۔ ہاں تیرا خون گندا ہے، گندی نسل ہے تیری......''

روم سروس کا انچارج بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ شہزاد کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ فرزانہ نے اپنی شال سے شہزاد کے سر کے زخموں کو دبا رکھا تھا۔ جو قالین پر نیم دراز تھا۔ روم سروس والے نے شہزاد کی حالت دیکھتے ہوئے فوراً اسپتال کی موبائل گاڑی کو فون کر دیا۔ فقط دو تین منٹ بعد ایمبولینس کا ہوٹر سنائی دینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں دو باوردی افراد موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے شہزاد کا پاسپورٹ طلب کیا۔ فاخرہ نے لرزتے ہاتھوں سے اپنا اور شہزاد کا پاسپورٹ اہلکاروں کو دکھایا۔ انہوں نے شہزاد کے زخموں کا سرسری معائنہ کیا۔ اس کے بعد اسے اسٹریچر پر باہر کھڑی گاڑی تک لے گئے۔ شارق اتنی دیر میں نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔

اہلکار صرف شہزاد کو لے جانا چاہتے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ قواعد کے مطابق وہ صرف مریض کو لے جا سکتے ہیں۔ لواحقین کو آنا ہو تو وہ اپنی گاڑی پر آئیں۔ بہر طور فرزانہ بحث کر کے کسی نہ کسی طور ایمبولینس میں سوار ہو گئی۔ شہزاد کی آنکھوں میں خون بھر گیا تھا۔ اسے اردگرد کی ہر شے سرخی مائل نظر آ رہی تھی۔ تاہم ایمبولینس میں آنے کے بعد اس کے دماغ میں چھایا ہوا اندھیرا تھوڑا سا چھٹ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں فاخرہ اور بچوں کو تسلی دی۔ ''میں ٹھیک ہوں...... خطرے کی بات نہیں۔'' اس نے کہا۔

''تم کوئی فکر نہ کرو فاخرہ۔'' فرزانہ نے بھی فاخرہ کو تسلی دی۔ پھر اس نے زارا اور عینی سے کہا کہ وہ یہاں فاخرہ کے پاس ہی رہیں۔

شہزاد کو تیز رفتاری سے ایک قریبی اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے زخموں سے بہنے والا لہو راستے میں ہی بند کر دیا گیا تھا۔ اہلکاروں نے اسے ایک وہیل چیئر پر بٹھا کر ایمرجنسی وارڈ میں انتظار کے لیے بٹھا دیا۔ فرزانہ اس کے پاس تھی اور عملے کے ارکان سے گاہے اور بگاہے ٹوٹی پھوٹی فرنچ میں بات کر رہی تھی۔ ایمرجنسی میں پہلے سے آٹھ دس مریض موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر عمر رسیدہ تھے جو باتھ روم میں یا سیڑھیوں وغیرہ سے گرے تھے۔

اسپتال کے ایک اہلکار نے آ کر انگلش میں شہزاد سے پوچھا۔ ''کیا یہ میڈیکولیگل کیس ہے؟''

فرزانہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن شہزاد نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے روک دیا۔ وہ اہلکار سے بولا۔ ''جی نہیں، مجھے خود سے چوٹیں آئی ہیں، میں گر گیا تھا۔''

اہلکار نے سر کے زخموں کو دیکھا۔ یقیناً وہ شہزاد کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ بہر حال وہ چلا گیا۔

شہزاد کے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی جو کچھ ہوا بالکل غیر متوقع تھا۔ کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ شارق اتنی سرعت سے بات کو اس قدر بڑھا دے گا۔ وہ جیسے اندر سے طیش کا آتش فشاں بنا ہوا تھا اور ایک معمولی تحریک سے پھٹ پڑا تھا۔ فرزانہ بار بار معذرت کے الفاظ ادا کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ اس کی ہی وجہ سے ہوا ہے۔ شہزاد نے اسے تسلی تشفی دی۔

پیرس کا یہ اسپتال جدید اور صاف ستھرا تو تھا مگر یہاں کی سروس کے بارے میں اس کی جو توقع تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ مریض بڑی سست روی سے اندر جا رہے تھے۔ ایمبولینس میں دی جانے والی ابتدائی طبی امداد کے بعد اسے ابھی تک کسی نے دیکھا نہیں تھا۔

فرزانہ کے موبائل پر بار بار اس کی بڑی بیٹی زارا کا فون آ رہا تھا اور وہ شہزاد کا حال پوچھ رہی تھی۔ فرزانہ کے کہنے پر شہزاد نے فاخرہ اور دونوں بچوں سے بھی بات کی۔ ہاں عینی سے بات نہیں ہوئی۔ ''عینی کہاں ہے؟'' شہزاد نے فاخرہ سے پوچھا۔

''وہ چلی گئی ہے۔''

''کس کے ساتھ؟''

''پتا نہیں، شاید وہی لے کر گیا ہے اسے۔'' فاخرہ نے کہا۔ ''وہی'' سے اس کی مراد شارق تھا۔

ایمرجنسی میں قریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ ان کی باری آکر نہیں دے رہی تھی۔ فرزانہ سخت پریشان تھی۔ اسے شارق پر بھی بہت غصہ تھا۔ یہ غصہ اس کی آنکھوں کے علاوہ اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ شہزاد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''فرزانہ! میں اسی لیے تم سے کہتا تھا کہ ہمارا ایک دوسرے سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ سوچو، اب تو ہم ہوٹل میں ہیں اگر ہم تمہارے گھر ٹھہرے ہوتے تو کیا قیامت آتی۔ ہمارے گھرانوں میں نفرت کی جڑیں کافی اندر تک جا چکی ہیں، یہ آسانی سے باہر نہیں نکلیں گی۔''

''مجھے شارق پر اتنا افسوس ہوا ہے شہزاد کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ وہ مجھ سے ایک سال بڑا ہے لیکن اگر اس وقت وہ میرے سامنے ہوتا ناں تو میں نے...... اس کا منہ نوچ لینا تھا۔'' فرزانہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''اس سے کیا ہو جاتا، معاملہ اور سنگین ہو جانے کے علاوہ؟''

''معاملہ اور کیوں سنگین ہو جانا تھا۔ میں لاہور میں ابا جی کو فون کروں گی۔ انہیں بتاؤں گی کہ شارق نے یہاں کیا چاند چڑھایا ہے...... ابا جی اب بڑے بدل چکے ہیں شہزاد۔ وہ ہر معاملے میں بڑے نرم ہو گئے ہیں...... تم تو کافی عرصے سے ان سے ملے نہیں ہو ناں۔''

شہزاد کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ ہولے سے بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ بہت کچھ بدل چکا ہو لیکن...... فرزانہ...... مجھے پتا ہے میرے لیے کہیں کچھ بھی نہیں بدلا ہوگا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماموں جہانگیر بھی جب بھی میرے سامنے آئیں گے ان کی آنکھوں میں ایسے ہی خون اتر آئے گا۔''

''کیوں اتر آئے گا؟ کیا کیا ہے تم نے؟ تم نے بڑوں کی مرضی کے سامنے سر جھکایا تھا۔ ٹھیک ہے کہ اس وقت ماحول کی گرما گرمی میں دونوں طرف سے کچھ باتیں ہوئی تھیں لیکن اب تو اس برے وقت کو گزرے ایک عرصہ گزر چکا ہے......''

''کچھ بھی ہو فرزانہ! میں نہیں چاہتا کہ ہم ایک سوئی ہوئی آفت کو پھر سے جگانا شروع کر دیں۔ تم نے اور تمہارے بچوں نے ہمارے لیے جو کچھ کیا میں اس کے لیے تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ ہم تمہاری اس میزبانی کو ہمیشہ یاد رکھیں گے...... لیکن...... اب میری خواہش ہے کہ ہم جتنے دن یہاں رہیں ہمارے درمیان کسی طرح کا کوئی رابطہ نہ ہو۔ اگر یہ رابطہ رہا تو مجھے یقین ہے کہ پھر کچھ بھی ٹھیک نہیں رہے گا۔''

''لیکن شہزاد بھائی تم......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں فرزانہ...... شارق تمہارا سگا بھائی ہے تو میرا بھی ماموں زاد ہے، میں اس کے مزاج کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ غصے میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آج مجھے چوٹیں آئی ہیں اور میں نے سہہ لی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کل میں نہ سہہ سکوں یا پھر جتنی چوٹیں مجھے آئی ہیں اتنی ہی اس کو بھی آجائیں۔ پلیز فرزانہ...... اس سلسلے کو آج سے ختم کر دو۔ زندگی رہی اور حالات اچھے رہے تو ہم پھر رابطہ کریں گے۔''

''لیکن میں اس سلسلے کو ایسے ہی ختم نہیں کر سکتی۔'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ''شارق کو تم سے معافی مانگنی ہوگی۔ تم میری میزبانی میں تھے، اس نے تم پر نہیں مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔''

''دیکھو، یہ سارے معاملے کو بڑھانے والی باتیں ہیں اور میں اسے بڑھانا نہیں چاہتا۔'' شہزاد کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

اسی دوران میں بالآخر شہزاد کی باری آگئی اور وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے سر کا ایکسرے کیا گیا۔ دو زخموں کی اسٹیچنگ ہوئی اور قریباً ایک گھنٹے بعد وہ اسپتال سے فارغ ہو کر واپس ہوٹل لوٹ آیا۔ واپسی پر فرزانہ نے ٹیکسی کا انتظام کیا تھا۔

اس رات فرزانہ ہوٹل میں ہی فاخرہ اور شہزاد کے پاس رہی۔ تاہم اگلے روز شہزاد کے پرزور اصرار پر گھر واپس چلی گئی۔ شہزاد کی حالت اب کافی اچھی تھی۔ دوپہر کے وقت اس کے اصل میزبانوں میں سے کچھ لوگ اس سے ملنے پہنچ گئے۔ یہ اسی انسٹی ٹیوٹ کے افراد تھے جن کی دعوت پر وہ یہاں پیرس آیا تھا۔ یہ چار خواتین و حضرات تھے۔ شہزاد کی چوٹیں دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے۔ ان لوگوں سے کچھ چھپانا فضول تھا کیونکہ بعد میں انہیں ہوٹل کی انتظامیہ سے معلوم ہو ہی جانا تھا۔ شہزاد نے مناسب الفاظ میں انہیں بتا دیا کہ یہ فیملی کے دو افراد کے درمیان ہونے والا ایک اتفاقیہ جھگڑا تھا۔ یہ لوگ چار بجے کی چائے تک شہزاد کے ساتھ رہے۔ انہوں نے شہزاد کو بتایا کہ یہاں پیرس میں بہت سے لوگ اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔

درد میں افاقے کے لیے شہزاد مسلسل پین کلر کھا رہا تھا۔ اسے تکلیف تو تھی مگر وہ بیوی بچوں پر زیادہ ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ خاص طور سے عمیرا اور احسن کے سامنے وہ بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت شہزاد اور فاخرہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب شام سات بجے کے قریب عینی پھر ہوٹل آ پہنچی۔ اس کے ساتھ چھوٹا سا بیگ بھی تھا وہ گڈ ایوننگ ایوری

باڈی۔‘‘ وہ بے تکلفی سے بولی۔

فاخرہ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’یہ کیا ہے؟‘‘

’’میرے کپڑے ہیں اور تولیا...... ٹوتھ پیسٹ، برش وغیرہ۔‘‘

’’کس لیے؟‘‘ شہزاد نے ٹھٹک کر پوچھا۔

’’میں دو چار دن یہیں رہوں گی آپ کے پاس۔ آپ دونوں کو میری ضرورت ہے۔‘‘ وہ ٹھسے سے بولی۔

’’کیا مطلب ہے تمہارا؟‘‘ شہزاد نے تیوری چڑھائی۔

’’آپ پریشان نہ ہوں۔ میں جو کر رہی ہوں سوچ سمجھ کر ہی کر رہی ہوں۔‘‘ وہ بڑے اطمینان اور عزم سے گویا ہوئی۔

شہزاد کو اس کے لہجے میں عجیب سا باغیانہ پن محسوس ہوا۔ وہ اندر تک لرز گیا۔ فاخرہ نے دبے لہجے میں کہا۔ ’’عینی! تمہیں پتا ہی ہے تمہارے ماموں نے کتنا غصہ کیا ہے، اگر......‘‘

’’ماموں اگر ہوش میں نہیں ہیں تو کیا ہم بھی ہوش میں نہ رہیں۔‘‘ اس نے تیزی سے فاخرہ کی بات کاٹی۔ ’’ایک غلط بات کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ بھی اس غلطی میں شریک ہیں۔‘‘

عینی کی آمد سے دونوں بچے ایک دم خوش ہو گئے تھے۔ وہ اس سے لپٹ گئے اور اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار کرنے لگے۔

شہزاد نے عینی سے پوچھا۔ ’’تمہاری ماما نے کیا کہا ہے اس بارے میں؟‘‘

’’وہ بھی آپ کی طرح ڈر رہی تھیں...... کہہ رہی تھیں کہ تمہارے جانے سے تمہارا ماموں بہت بگڑے گا۔ میں نے غصے سے کہا کہ ماموں کو بیچ میں سے نکال دیں۔ مجھے صرف یہ بتائیں کہ اس سچویشن میں ہم میں سے کسی کو ہوٹل میں موجود ہونا چاہیے یا نہیں؟ وہ خاموش ہو گئیں۔‘‘

’’عینی! یہ ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ شہزاد منمنایا۔

’’کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں، یہ بحث بعد میں کر لیں گے، اب مجھے یہ بتائیں کہ صبح ناشتے میں آپ نے یا بچوں نے کوئی خاص چیز لینی ہے؟ اگر لینی ہے تو میں ابھی اسٹور سے لے آتی ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی دوائیں بھی دیکھ لیں۔ اگر کوئی دوا لانی ہے تو مجھے بتا دیں۔‘‘

’’نہیں، ابھی تو کوئی ضرورت نہیں۔‘‘ فاخرہ نے کہا۔

اس نے کمرے کا فریج کھولا۔ وہاں موجود اشیا کا جائزہ لیا اور پھر جلدی سے باہر نکل گئی۔

دس پندرہ منٹ بعد وہ لدی پھندی واپس آئی بسکٹ، چاکلیٹس، جوسز، ٹن پیک فوڈ...... پتا نہیں کیا کچھ اٹھا رکھا تھا اس نے۔ شہزاد اور فاخرہ احتجاج کرتے ہی رہ گئے۔ اس نے سب کچھ فریج میں ٹھونس دیا۔

اسی دوران میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی اور باتیں کرنے لگی۔ چند سیکنڈ میں ہی شہزاد کو اندازہ ہو گیا کہ فون پر دوسری طرف کون ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ شہزاد کی طرح فاخرہ نے بھی بھانپ لیا تھا اور اس کا رنگ زرد نظر آنے لگا تھا۔ وہ شارق سے بات کر رہی تھی۔

اس نے بڑی بے خوفی سے شارق کو بتایا کہ وہ ہوٹل میں فاخرہ، شہزاد اور بچوں کے پاس ہے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے دو چار دن یہیں رہنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دوسری طرف سے شارق نے گرجنا برسنا شروع کر دیا ہوگا۔ عینی کے تاثرات میں کسی طرح کی کمزوری نظر نہیں آئی، بلکہ ایک طرح کی طیش آمیز تمتماہٹ نے اس کے نقوش کو ڈھانپ لیا۔ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ’’ماموں! میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں کہ آپ مجھے یہاں سے اٹھا کر لے جائیں گے۔ میں اپنے نفع نقصان کی خود ذمے دار ہوں اور مجھے آپ کی کسی ایڈوائس کی ضرورت بھی نہیں ہے، آپ اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں تو بہتر ہے۔‘‘

دوسری جانب شارق بہت زور سے بولا۔ موبائل کی اسپیکر سے اس کی آواز نکل کر قریب بیٹھے شہزاد کے کانوں تک پہنچی۔ ’’عینی! میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔ جانتی ہو کہ تم کس سے بات کر رہی ہو۔ جانتی ہو تم؟‘‘

’’میں اچھی طرح جانتی ہوں لیکن آپ نہیں جانتے کہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں اور کہاں کر رہے ہیں۔ یہ لاہور نہیں پیرس ہے اور میں ایک بالغ لڑکی ہوں، میں اپنی مرضی سے یہاں موجود ہوں اور جب تک مناسب سمجھوں گی یہاں رہوں گی۔ میرے ساتھ زبردستی نہیں کی جا سکتی۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں تم کیسے رہتی ہو یہاں۔ میں آ رہا ہوں۔‘‘ شارق کی نہایت دھمکی آمیز آواز سنائی دی۔

’’یہ غلطی نہ کرنا ماموں۔ بات بہت بڑھ جائے گی۔‘‘ عینی نے کھٹاک سے جواب دیا۔ ’’میں پولیس کو فون کر رہی ہوں۔ آپ کے تشریف لانے سے پہلے یہاں پولیس موجود ہوگی۔‘‘

’’اچھا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے، تم ہتھکڑیاں لگواؤ گی مجھے؟ ہتھکڑیاں لگواؤ گی؟‘‘

’’اگر آپ باز نہیں آئیں گے تو یہ بھی ہوگا۔ یہاں قانون سب کے لیے ایک جیسا ہے۔‘‘ عینی کا لہجہ اٹل تھا۔

شہزاد نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر اسے روکنا چاہا لیکن وہ بپھرے ہوئے رواں دواں لہجے میں بولتی چلی گئی۔

اندازہ ہوا کہ دوسری طرف شارق قدرے ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ وہ بہت شعلہ مزاج تھا۔ خاندان میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی مگر آج اس کو ٹکر کے جواب ملے تھے۔ وہ قہر بار لہجے میں بولا۔ ’’ٹھیک ہے عینی! میں پہلے تیرے باپ سے بات کر لوں، پھر دیکھ لیتا ہوں تجھے......‘‘ اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔

’’عینی یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ شہزاد نے کراہ کر کہا۔ ’’یہ نہ ہو کہ شارق کوئی ایسا ویسا قدم اٹھا لے۔‘‘

وہ بڑے سکون سے بولی۔ ’’کچھ نہیں ہوگا مائی لارڈ۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ یہ فرانس ہے۔ یہاں کسی کے بنیادی حقوق سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا مطلب سیدھی سیدھی جیل ہے۔‘‘

’’لیکن ہمیں یہیں تو نہیں بیٹھے رہنا، پاکستان بھی تو جانا ہے اور شارق کو... بھی وہیں ہونا ہے۔ وہاں آ کر تمہاری یہ فرانسیسی گورنمنٹ ہمارا کیا سنوار لے گی۔ بہتر ہے کہ ہم اس معاملے کو اور زیادہ خراب نہ کریں۔‘‘ شہزاد کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

’’دیکھیں، میں ہوں ناں۔ میرے ہوتے آپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے، میں ابھی پاپا سے بھی بات کر لیتی ہوں، آپ بالکل ’’ریلیکس‘‘ ہو جائیں۔‘‘

ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ عینی کا موبائل پھر جاگ اٹھا۔ اس مرتبہ اس کے پاپا یعنی جمیل صاحب کا ہی فون تھا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے ’’ہائے پاپا جانی‘‘ کہا اور ان سے بات کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ بات کرتے کرتے باہر کوریڈور میں ٹہلنے لگی۔ کچھ دیر بعد شہزاد نے کھڑکی سے دیکھا۔ عینی کی آواز تو شہزاد کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی تاہم اس کے انداز اور ہاتھوں کی حرکات وغیرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بڑے اعتماد سے بات کر رہی ہے۔

پانچ چھ منٹ بعد وہ بات ختم کر کے واپس سویٹ میں آ گئی۔ اس کے گال ہلکے گلابی ہو رہے تھے اور بولتی آنکھوں میں اطمینان کی چمک تھی۔ ’’کیا بات ہوئی؟‘‘ فاخرہ نے پوچھا۔

’’بس ہو گئی ناں آنٹی...... میں نے ان کو سمجھا دیا ہے۔ پاپا میری کوئی بات نہیں ٹال سکتے۔ ہی از اے ویری ویری نائس گائے۔‘‘

شہزاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، بہر حال عینی کا اعتماد دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ غالباً فوری طور پر کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔

رات کو جب بچے ٹی وی دیکھ رہے تھے اور فاخرہ ساتھ والے کمرے میں سوئی پڑی تھی، عینی نے خود ہی شہزاد کے سر کی پٹیاں بدلیں۔ بینڈیج کا یہ سامان ڈاکٹری نسخے کے مطابق وہ شام کو ہی میڈیکل اسٹور سے لے آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے اور زارا نے فرسٹ ایڈ کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہوئی ہے۔ اس حوالے سے ان دونوں کے پاس کئی سرٹیفکیٹس بھی ہیں۔

جب وہ پٹی بدل رہی تھی۔ شہزاد نے پوچھا۔ ’’پاپا سے کیا بات ہوئی تمہاری؟‘‘

’’کوئی خاص نہیں، بس میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں یہاں آپ لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، کیونکہ آپ کو میری ضرورت ہے۔‘‘

’’اور انہوں نے مان لیا؟ حالانکہ وہ جانتے بھی ہوں گے کہ شارق نے کیا ہنگامہ مچایا ہے۔‘‘

’’میں نے کہا ہے ناں کہ وہ میری کوئی بات نہیں ٹال سکتے۔‘‘ پھر ایکدم ہنستے ہوئے بولی۔ ’’میں تو یہ بھی کہہ دوں ناں کہ آنٹی میری گرل فرینڈ اور آپ میرے فرینڈ ہیں تو، انہیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔‘‘

شہزاد سٹپٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ قد آدم ٹیبل لیمپ کی دودھیا روشنی اس کے بائیں رخ کو روشن کر رہی تھی۔ لمبے گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ماں باپ دونوں پاکستانی تھے لیکن وہ یہیں کی پیدائش تھی۔ اس کی رگوں میں تو فرنچ خون شامل نہیں تھا لیکن اس کے خدوخال اور انداز میں ’’فرانسیسیت‘‘ سرایت کر چکی تھی۔ اس کی اردو زبان میں بھی فرانسیسی آہنگ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ شہزاد اس کی اوٹ پٹانگ بات کے بارے میں کچھ کہتا وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ’’اس دن میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ میرے پاس ایک ویٹو پاور ہے۔ اس پاور کے سامنے ماما...... بگ سسٹر...... برادران لا وغیرہ کوئی نہیں ٹھہر

سکتا۔ یہ پاور پاپا جانی کی ہے۔ وہ میری ہر بات کھلے دل دماغ کے ساتھ سنتے ہیں اور مانتے ہیں۔ وہ بس ایک ہی بات کہتے ہیں...... تم جیسی سچی لڑکی کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتی۔ وہ مجھ پر بے حد ''کانفی ڈینس'' رکھتے ہیں۔

''تمہارا اپنا کیا خیال ہے، تم ایک سچی لڑکی ہو؟''

''سچی کا تو پتا نہیں لیکن اسٹریٹ فارورڈ ضرور ہوں، کوشش کرتی ہوں کہ جو کچھ میرے دل دماغ میں ہے وہی کچھ میری زبان پر ہو اور وہی کچھ میرے عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہو۔ میں نے اس خیال کو ایک جگہ نظم بھی کیا ہے۔ سناؤں آپ کو؟''

شہزاد نے دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ اسے زارا کی سخت وارننگ یاد آگئی تھی کہ عینی سے کچھ سنانے کی فرمائش نہ کیجیے گا ورنہ یہ گھنٹوں آپ کا دماغ چاٹے گی۔ وہ بھی بھانپ گئی اور بات کا رخ پھر اپنے پاپا جانی کی طرف پھیر لیا۔ ''میں نے اپنی ویٹو پاور کئی جگہ استعمال کی ہے اور ہر بار پوری طرح کامیاب ہوئی ہوں۔ آخری دفعہ تو اس پریکٹس نے زبردست مزہ دیا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا تھا؟'' شہزاد نے مجبوراً پوچھ لیا۔

وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ''ایک لڑکا تھا نجیب واحدی نام کا۔ باپ پاکستانی تھا ماں فرنچ تھی۔ یہ لوگ کراچی کے قریب کاٹھیاواڑ میں چمڑے کا کاروبار کرتے تھے...... کاٹھیاواڑ ہی نام ہے ناں......؟'' اس نے اپنی ہی قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہاں "Auxerre" میں بھی یہ لوگ بیس پچیس سال سے ''لیدر گارمنٹس'' کا کام ہی کر رہے ہیں۔ پکے کاروباری ہیں۔ لڑکا بھی باپ کے ساتھ بزنس میں شریک ہے۔ برادران لاؤ (ریحان) سے ان کی جان پہچان تھی۔ بس وہ میرے گلے ڈالنے کے لیے اس لڑکے کو یہاں پیرس میں لے آئے۔ برادران لاؤ یعنی ریحان بھائی نے ماما اور بگ سسٹر کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ لڑکا مستقبل میں میرے لیے اچھا شوہر ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ یہ میری زندگی کا معاملہ ہے، اس کے بارے میں میں خود فیصلہ کروں گی۔ پہلے اس لڑکے کے ساتھ دوستی کروں گی، اس کے ساتھ گھوموں پھروں گی، پھر کسی رزلٹ پر پہنچوں گی۔ دیکھنے میں تو وہ اچھا لگتا تھا۔ ایک سال یونیورسٹی میں بھی گیا تھا...... مگر جب میں نے اس سے میل جول شروع کیا تو مجھے پتا چلا کہ بھائی صاحب خالص بزنس مائنڈ رکھتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی کیا ہوتی، انہیں ٹھیک سے پتا ہی نہیں تھا کہ فنونِ لطیفہ کیا ہوتے ہیں۔ میری انگلش پوئٹری پر بغیر سمجھے واہ واہ کرتا رہتا تھا۔ کیٹس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ شاید وہ کوئی فٹ بال کا کھلاڑی ہے، شیکسپیئر کو اسٹیج ایکٹر سمجھتا تھا، شیلے اس کے نزدیک کسی آسٹریلین پھل کا نام تھا۔ اب بتائیں جی، میں کسی ایسے ڈفر کے ساتھ اپنی لائف تباہ کر سکتی تھی۔ بے شک اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں لیکن اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ وہ میرے حساب سے باذوق نہیں تھا۔ پوری فیملی نے انگیج منٹ کے لیے بڑا زور لگایا۔ مجھے منانے کے لیے پاکستان سے نانا جہانگیر کی خدمات بھی حاصل کی گئیں لیکن میں نے بالکل کورا سا جواب دے دیا۔ اس کے دیے ہوئے تحفے وغیرہ واپس کر دیے اور جو دو چار میں نے دیے تھے ان کی واپسی کا بھرپور مطالبہ کر دیا۔ معاملے نے کچھ طول کھینچا لیکن آخر جیت میری ہی ہوئی۔ پتا ہے کیسے؟''

''کیسے؟''

''پاپا کے ویٹو سے۔ پاپا کو جب میری بات سمجھ میں آگئی تو انہوں نے اس معاملے کو یکسر ختم کر دیا۔ وہ سمجھ گئے کہ میں اس چرم فروش کے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گی۔''

''تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم میں لاابالی پن بہت ہے۔''

''آپ کی طرح آرٹسٹ جو ہوں۔ کیا آپ میں لاابالی پن نہیں؟''

''مجھ میں کیا ہے؟''

''آپ نے اسٹل فوٹوگرافی پر جو کتاب لکھی ہے اس کے دیباچے میں کیا لکھا ہے آپ نے...... شروع میں آپ کو کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا کریں۔ جب آپ بہاولپور کے قریب ایک چھوٹے قصبے میں رہتے تھے تو آپ نے دو تین سال میں مستقبل کے درجنوں منصوبے بنائے اور بگاڑے۔ ایک دفعہ آپ نے وحید مراد سے متاثر ہو کر فلمی اداکار بننے کا فیصلہ کر لیا اور ایک مرتبہ آپ کی ساری توجہ جدید انداز میں کاشتکاری کی طرف چلی گئی۔ اب دیکھیں کہاں اداکاری، کہاں ٹریکٹر چلانا اور کہاں ایڈورٹائزنگ......''

''اچھا بھئی! میں ہارا۔ تم سے باتوں میں مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔''

''ہار جیت کی بات نہیں ہے مائی لارڈ! میں تو یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ فن کار میں تھوڑی سی متلون مزاجی تو ہوتی ہی ہے۔''

''یعنی تم خود کو آرٹسٹ ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہو۔''

''نہیں مائی لارڈ۔ عدالت غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہے۔

میں خود کو آرٹسٹ کلیم نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو آرٹسٹ بننا چاہتی ہوں۔ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ آپ مجھے اپنا شاگرد بنائیں...... بلکہ پکا پکا شاگرد۔''

پکا پکا شاگرد کہنے کے بعد ایک دم اس کا چہرہ سرخ ہوا اور پھر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکنے کی کوشش کی۔ پھر یہی کوشش کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

شہزاد کو ہنسی کے اس حملے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی اور یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ایک دن پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ ڈیڑھ دو منٹ تک ہنس ہنس کر دہری ہوتی رہی تھی۔ عجیب معما سی لڑکی تھی اور بے حد بولڈ بھی۔ شہزاد کو اس سے خوف آنے لگا تھا۔

اگلے اڑتالیس گھنٹے میں عینی ان سب کو گھر کا ایک فرد ہی محسوس ہونے لگی۔ وہ فاخرہ کا اتنا خیال رکھ رہی تھی کہ شہزاد اس کی طرف سے تقریباً بے فکر ہی ہو گیا تھا۔ وہ خود ہی بازار سے ایک خاص قسم کی چپکنے والی میڈیکل پٹی لے کر آئی تھی۔ یہ پٹی اس نے بڑی چابکدستی سے فاخرہ کی مڑی ہوئی کلائی کے گرد لپیٹ دی تھی۔ اس سے فاخرہ کو کافی افاقہ ہوا تھا۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ بے حد مانوس ہو گئے تھے۔

تیسرے روز شام کو عینی کے پاپا جمیل احمد صاحب کا فون ہوٹل کی لینڈ لائن پر آگیا۔ شہزاد نے ان سے بات کی۔ جمیل احمد صاحب نے کہا کہ انہیں ہوٹل والے واقعے کا بڑا افسوس ہوا ہے۔ انہوں نے شارق کو بے حد غیر ذمے دار اور احمق قرار دیا۔ انہوں نے کہا۔ ''عینی نے اس کے ساتھ جس طرح سے بات کی ہے اسے ایسی ہی کرنی چاہیے تھی۔ وہ اسی لائق ہے۔ اچھا ہے کہ جلدی دفع ہو گیا یہاں سے...... ورنہ اس پر مار پیٹ کا کیس بن سکتا تھا۔''

''کہاں گیا ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''سنا ہے واپس لندن چلا گیا ہے۔ وہاں سات آٹھ روز رہ کر پاکستان پہنچ جائے گا۔ اپنی بہن سے بھی تلخ کلامی کر کے گیا ہے۔ اس کی فطرت ہی ایسی ہے۔ خود خوش ہو سکتا ہے نہ کسی کو دیکھ سکتا ہے۔''

شہزاد نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ڈرنک بھی کافی کرتا ہے، میرے ساتھ جھگڑے کے وقت بھی وہ نشے میں تھا۔''

''یہ تو تمہاری مہربانی ہے کہ تم نے اسپتال میں اس کا نام نہیں لیا ورنہ یہاں تو ایک وزیر بھی پچھلے دنوں بالکل اسی طرح کے واقعے میں جیل پہنچا ہے۔ یہاں رو رعایت کسی کے لیے نہیں ہے۔ وزیر صاحب بھی عام قیدیوں کے ساتھ جیل میں پڑے ہیں۔''

''ہاں...... پچھلے دنوں میں نے یہ نیوز دیکھی تھی اور حیران بھی ہوا تھا۔''

''تمہیں بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ عینی نے مشکل وقت میں تم لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑا۔ ہوٹل کے کمرے کا جو تھوڑا بہت نقصان ہوا تھا اس کی ادائی میں نے اپنے اکاؤنٹ سے بذریعہ نیٹ کر دی ہے۔ یہ معاملہ ''سیٹل'' ہو گیا ہے اگر طبیعت اب بہتر ہے تو بے فکری سے گھومو پھرو اور انجوائے کرو، پیرس جیسے شہر میں آکر کمرے میں بند ہو جانا بڑی زیادتی ہے۔ ذرا عینی کو فون دو۔ میں اسے بتا دیتا ہوں کہ آپ کو کہاں کہاں جانا چاہیے۔''

اس سے پہلے کہ شہزاد کوئی جواز پیش کرتا، عینی نے خود ہی ریسیور شہزاد کے ہاتھ سے لے لیا...... اور پاپا جانی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔

اگلے روز صبح سویرے عینی نے بچوں کو اکسایا اور انہوں نے ایک قریبی تفریحی پارک میں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ ایسے معاملوں میں بڑی چابک دست تھی، اسے معلوم تھا کہ بچوں کا پروگرام بن جائے گا تو پھر فاخرہ اور شہزاد کو بھی تیار کرنا آسان ہوگا، اس نے ایک گھنٹے کے اندر اندر اس تفریحی پارک کے ان گنت فضائل بیان کر دیے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شانزالیزے روڈ یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور وہ بہ آسانی واک کرتے ہوئے وہاں پہنچ سکتے تھے۔ فاخرہ نے حسب معمول جانے سے انکار کیا لیکن اس مرتبہ عینی بھی اڑ گئی۔ اس نے کہا کہ اگر آنٹی فاخرہ نہیں جائیں گی تو پھر یہ پروگرام کینسل۔

پارک کے جو فضائل عینی نے بیان کیے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پروگرام کینسل ہونے کے آثار دیکھ کر بچوں نے ٹھنکنا اور منہ بسورنا شروع کر دیا۔ وہ بھی غالباً یہی چاہتی تھی۔ مجبوراً فاخرہ کو کمر ہمت باندھنی پڑی۔ عینی نے دو چار منٹ کے اندر فاخرہ کے لیے ہوٹل سے ہی وہیل چیئر کا انتظام کر لیا۔ استقبالیہ والوں نے کال کر کے ٹیکسی منگوا لی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بذریعہ لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچے اور پھر شاندار ٹیکسی کار میں سوار ہو گئے۔ پاکستان میں شہزاد جب کبھی سنتا تھا کہ فلاں پاکستانی اٹلی، جرمنی، فرانس یا یورپ کے کسی اور ملک میں ٹیکسی چلاتا ہے تو ذہن میں ایک غریب مسکین ٹیکسی ڈرائیور کا تصور ابھرتا تھا مگر یہاں آکر یہ تصور کافی حد تک دھندلا گیا۔ اول تو ''ٹیکسیاں'' جدید آلات سے لیس نہایت لگژری قسم کی گاڑیاں تھیں۔ دوسرے ڈرائیور خواتین و حضرات بھی ٹھاٹ

بات والے تھے۔ مسافر سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ مسافر کے سامان کو بار کرنا تو دور کی بات ہے اسے ہاتھ لگانا بھی وہ شاید توہین سمجھتے تھے۔ ٹیکسی کاروں کے بیش بہا کرائے بھی ٹیکسی ڈرائیوروں کی شان میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔

وہ لوگ ٹیکسی میں سوار ہو کر آٹھ دس منٹ کے اندر تفریحی پارک پہنچ گئے۔ اس آٹھ دس منٹ کے سفر کے عوض انہیں قریباً تین ہزار پاکستانی روپے ڈرائیور صاحب کی نذر کرنا پڑے۔ ایک مرتبہ پھر عینی نے شہزاد کی کوئی پیش نہیں چلنے دی اور کرایہ خود ادا کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فاخرہ اور شہزاد سے عہد بھی لیا کہ وہ ایک مہمان کی حیثیت سے اپنی حدود کا خیال رکھیں گے اور جب کبھی اس کے ساتھ کہیں جائیں گے تو اپنی جیب سے کچھ خرچ نہیں کریں گے۔

یہ زیادہ بڑا تفریحی پارک نہیں تھا۔ بڑے تفریحی پارک ڈزنی لینڈ اور پارک ایس ٹیرکس وغیرہ شہر سے کافی باہر تھے۔ بہر حال یہاں بھی بچوں کے کھیل تماشے کا کافی سامان موجود تھا۔ پارک کا ٹکٹ ایک ہی دفعہ وصول کر لیا جاتا تھا، اندر داخل ہونے کے بعد ساری تفریحات اور جھولے وغیرہ فری تھے۔ فاخرہ اور شہزاد تو ایک جگہ چمکیلی گھاس پر MAT بچھا کر بیٹھ گئے۔ عینی بھاگ بھاگ کر بچوں کو مختلف جھولوں پر سوار کرانے اور اتارنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی اور آواز میں چہکار تھی۔ بچے بھی اس کی کمپنی میں بے حد انجوائے کر رہے تھے۔ وہ شہزاد اور فاخرہ کو جیسے بھول ہی گئے تھے۔

یہ بھی پیرس کا ایک نہایت چمک دار اور خوشگوار دن تھا۔ پارک میں قریباً دو گھنٹے گزارنے کے بعد وہ باہر آ گئے...... اور پیدل ہی شانزالیزے روڈ کی طرف چل دیے۔ یہ ویک اینڈ تھا اس لیے ہر طرف رونق تھی۔ سیاحوں کی ٹولیاں گلی کوچوں میں چکرا رہی تھیں۔ اپنے سر کے زخم چھپانے کے لیے شہزاد نے ایک پی کیپ پہن رکھی تھی۔ عینی ہلکے پھلکے انداز میں اس پی کیپ کو مسلسل تنقید کا نشانہ بنا رہی تھی۔

''آخر یہ تمہیں کیا تکلیف دے رہی ہے؟'' شہزاد نے کہا۔

''مجھے اس پر دو اعتراضات ہیں مائی لارڈ۔ پہلی بات تو یہ کہ بندہ جیسا ہے اسے ویسا ہی نظر آنا چاہیے۔ آپ کے سر پر ایک دو چوٹیں لگی ہوئی ہیں اور آپ اس کیپ کے ذریعے انہیں چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یعنی آپ جیسے ہیں ویسے نظر آنا نہیں چاہ رہے۔ میرے خیال میں تو یہ فیئر نہیں ہے۔''

''اور دوسری بات؟''

''دوسری بات یہ کہ آپ مائی لارڈ ہیں اور مائی لارڈ نے اس ٹی وی سیریل میں کہیں بھی اس طرح کی ٹوپی نہیں پہنی۔ اس ٹوپی کی وجہ سے میرا تصور درہم برہم ہو رہا ہے۔''

''دیکھو بھئی، یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ اس ٹی وی سیریل میں کسی شخص نے مائی لارڈ کے سر پر ٹوٹے ہوئے لیمپ سے حملہ نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ ممکن ہے کہ وہ بھی ٹوپی پہن لیتے اور میری ہی طرح نظر آتے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ بچے بھی ہنسنے لگے۔

اس کے یوں ہنسنے سے شہزاد کو پھر اس کی ترسوں رات والی رواں دواں ہنسی یاد آ گئی...... اس پر دو دفعہ ہنسی کا ایسا حملہ ہوا تھا اور دونوں مواقع وہ تھے جب اس نے شہزاد کی شاگرد بننے کی بات کی تھی۔ یہ گتھی ابھی تک سلجھی نہیں تھی۔

وہ پیرس کی مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے معروف مشہور روڈ شانزالیزے پر پہنچے تو انہیں یوں لگا جیسے وہ چھوٹے چھوٹے آبی راستوں پر سفر کرتے کرتے اچانک ایک بہت بڑے لہریں مارتے دریا میں پہنچ گئے ہیں۔ اس سڑک کی وسعت، رونق اور خوبصورتی سب سے جدا نظر آئی...... بہت سی دیگر شاہراہوں کی طرح یہ بھی پتھر کے ہموار ٹکڑوں سے بنی ہوئی تھی۔ بسیں کاریں اور دیگر گاڑیاں اس پر سے کچھ تھرتھراتی ہوئی گزرتی تھیں۔ ریستورانوں میں اور فٹ پاتھوں پر دوپہر کا کھانا کھانے والوں کا اژدھام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس میں پانی کم اور شراب زیادہ پی جاتی ہے۔ پتا نہیں کہ یہ موازنہ کس طرح کیا جاتا ہے کیونکہ شہزاد کو تو کہیں پانی نظر ہی نہیں آیا۔

فاخرہ وہیل چیئر پر تھی اور وہیل چیئر مسلسل عینی نے ہی تھامی ہوئی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ فاخرہ کو مختلف مقامات کے بارے میں بتا بھی رہی تھی۔ فلاں رومانی ناول کی اطالوی ہیروئن اس ریستوران میں آ کر بیٹھتی تھی۔ ہالی وڈ کی فلاں مشہور فلم کی شوٹنگ اس چوراہے پر ہوئی تھی وغیرہ وغیرہ۔ پیرس جدید اور قدیم کا حسین امتزاج ہے اور اس وقت یہ امتزاج اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ ان کے سامنے تھا۔ بلند و بالا ماڈرن عمارتوں کے ساتھ ساتھ روم کی طرز کے آثار قدیمہ بھی جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔

وہ اس شہر کی اور خاص طور سے شانزالیزے کی دلکشی کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اب انہیں کچھ فاصلے پر ایک نہایت بلند و بالا دروازہ نظر آنے لگا تھا۔ عینی نے بتایا کہ یہی آزادی کی محراب ہے۔

ایک گراسی گراؤنڈ میں دھوپ بہت کھل کر برس رہی تھی۔ پھولوں کی رنگ برنگی کیاریاں اس جگہ کی خوبصورتی کو بڑھا رہی تھیں۔ اپنے تھکے ہوئے قدموں کو کچھ دیر آرام دینے کے لیے انہیں یہ جگہ بڑی مناسب لگی اور لوگ بھی یہاں وہاں ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے تھے۔ ایک میوزیکل گروپ کے سیاہ فام ارکان موسیقی بکھیر رہے تھے اور لوگ ان کے سامنے رکھی ٹوپیوں میں سکے ڈال رہے تھے۔ شہزاد اور عینی نے بھی ایک جگہ چٹائی بچھائی اور ڈیرہ جما لیا۔ احسن ہینڈی کیم سے مووی بنانے لگا۔ عمیر نے فوٹو گرافی شروع کر دی۔

اسی دوران میں عمیر کی نگاہ چوراہے کی طرف گئی۔ وہاں لب سڑک ہجوم تھا اور کوئی کھیل تماشا ہو رہا تھا۔ دونوں بچے تماشا دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ عینی اور فاخرہ وہیں بیٹھی رہیں اور شہزاد بچوں کو لے کر ہجوم والی جگہ کی طرف چلا گیا۔ یہ جگہ آزادی کی محراب کے بالکل سامنے تھی۔ یہاں میلے کا سا سماں تھا۔ تین سیاہ فام لڑکے بریک ڈانس کر رہے تھے۔ درجنوں لوگ ان کے اردگرد کھڑے تالیاں بجا رہے تھے۔ دوسری طرف کچھ نوجوان رقص آمیز بازی گری میں مصروف تھے۔ ان میں دو خواتین بھی تھیں۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے انجوائے کر رہے تھے اور اپنا نذرانہ عقیدت سامنے رکھی ٹوپیوں میں ڈالتے جا رہے تھے۔ پھر تماشائیوں میں سے کچھ حوصلہ مند بچے بھی بریک ڈانس میں شریک ہو گئے۔ تماشائیوں کی دلچسپی بڑھ گئی۔ شانزالیزے کے اس نہایت وسیع اور پرشکوہ چوراہے میں یہ کھیل کود بے حد روایتی اور دلکش تھے۔ شہزاد ان میں کھو گیا...... اور ان لمحوں میں اس سنگین معاملے کو تقریباً تقریباً بھول گیا جو صرف پانچ چھ دن پہلے اس کے اور شارق کے درمیان پیش آیا تھا اور جس کی ایک نشانی ''پی کیپ'' کی صورت میں اس کے سر پر موجود تھی۔

تماشے کے دوران وہ فاخرہ اور عینی کی طرف بھی گاہے بگاہے نگاہ دوڑا لیتا تھا۔ وہ قریباً ڈیڑھ سو میٹر دور سبز گھاس کے اوپر بچھی سرخ چٹائی پر بیٹھی تھیں۔ عینی بڑی محبت سے فاخرہ کی پنڈلیاں دبا رہی تھی، ساتھ ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہی تھی۔ عینی کو دیکھ کر یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ برسوں سے ان کے ساتھ رہ رہی ہے۔

قریباً آدھ پون گھنٹے بعد وہ فاخرہ اور عینی کے پاس واپس لوٹے، تو عینی بڑی بے تکلفی سے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

''کیا کوئی جوک سنایا گیا ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''جوک نہیں جی، بہت سنجیدہ بات ہے۔'' عینی چہکی۔ ''میں نے اور آنٹی فاخرہ نے آج ایک فیصلہ کر لیا ہے......''

''کہ آج ہمیں کھانے کو کچھ نہیں دیں گی اور ایسے ہی باتیں بناتی رہیں گی۔'' عمیر نے اس کی بات اچکی۔

''الو بائے! تمہیں کھانے کے سوا اور کوئی بات نہیں آتی۔ ہم ایک اہم مسئلے پر بات کر رہے ہیں۔ تم ذرا گراؤنڈ میں تھوڑی سی بھاگ دوڑ کرو تاکہ بھوک اور اچھی طرح لگ جائے، پھر تمہیں بڑے شاندار سینڈوچ کھلاتے ہیں۔''

بچے واقعی بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ عینی کھلکھلاتے لہجے میں بولی۔ ''تو مائی لارڈ ہم نے طے کیا ہے کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی پاکستان جاؤں گی۔ وہاں ہم سب اکٹھے رہیں گے، میں دن رات آنٹی کی خدمت کروں گی اور بدلے میں آنٹی مجھے اپنی محبت بھری باتوں سے خوش کریں گی۔ سچی خوشی وہ چیز ہے جو یہاں ہمارے یورپ میں ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں افراتفری کے سوا اور کچھ نہیں ہے می لارڈ! یوں لگتا ہے کہ ہم سب مشینیں ہیں اور ویک اینڈز کی تھوڑی سی فراغت کے لالچ میں دھڑا دھڑ چل رہی ہیں۔ بس ویک اینڈز...... اور کچھ نہیں۔ میں اب ذرا اور طرح سے جینا چاہ رہی ہوں می لارڈ......'' اس نے کسی مقرر کی طرح ہاتھ لہرایا۔

''اور اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' شہزاد بھی زیرِ لب مسکرایا۔

''آپ کو کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ ہم نے سب طے کر لیا ہے۔ بس آپ کو زیادہ سے زیادہ دو لفظ بولنے ہوں گے...... تین دفعہ۔''

''تین دفعہ؟ کیسے لفظ؟''

''قبول ہے...... قبول ہے۔''

''کس کے لیے؟'' شہزاد نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میرے لیے اور کس کے لیے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''ہم دونوں کی میرج ہو جائے گی اور بس سارے راستے سیدھے ہو جائیں گے، ہم تینوں، دونوں بچونگڑوں کو ساتھ لے کر سنڈے کے سنڈے کلفٹن پر پکنک منانے جایا کریں گے...... اور قیمے والے پراٹھے کھایا کریں گے۔ قیمہ اچھا لگتا ہے نا آپ کو؟''

شہزاد چکرا کر رہ گیا۔ ''یہ کیا الٹی سیدھی ہانک رہی ہو۔'' وہ بے حد حیرت سے بولا۔ فاخرہ زیرِ لب مسکرائے جا رہی تھی۔

''الٹی سیدھی نہیں...... سیدھی سیدھی ہانک رہی ہوں می لارڈ...... کیا آپ کو قیمہ اچھا نہیں لگتا۔ آپ کو میرے سر کی قسم...... سچ سچ بتائیں۔''

''مجھے تمہارے سر کی قسم، میں سچ سچ بتا رہا ہوں۔ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔'' شہزاد نے اسٹیل کا وزنی ٹفن اٹھایا تو وہ ''نونو'' کا شور مچاتی الٹے پاؤں پیچھے کو دوڑی اور بچوں کے پاس پہنچ گئی۔

''بڑی شرارتی ہے۔'' فاخرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور بے ہودہ بھی۔ یہ یہاں کے رہن سہن کا اثر ہے۔'' شہزاد نے برا سامنہ بنایا۔

''ویسے ایک بات ہے شہزاد! آپ کی دل سے عزت کرتی ہے، بڑا مانتی ہے آپ کو اور آپ کے کام کو۔ آپ کی بنائی ہوئی بہت سی تصویروں کے پرنٹ اس کے پاس موجود ہیں...... انہیں بڑے فخر سے اپنے دوستوں، عزیزوں کو دکھاتی ہے۔ ابھی پتا ہے کیا کہہ رہی تھی؟'' شہزاد سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ فاخرہ بولی۔ ''ایک نیا نکتہ نکال رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ پچیس برس پہلے نانا جہانگیر نے اپنی مرضی کے لیے آپ کو نجمہ خالہ کا بھانجا بنا دیا تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اب آپ اس کے خالہ زاد بھائی ہیں اور خالہ زاد بھائی سے بے تکلف ہوا جا سکتا ہے۔''

وہ دونوں اس کی عجیب وغریب بے باک شخصیت کے بارے میں بات کرتے رہے۔ وہ بچوں کو لے کر وہیں اس جگہ پر پہنچ گئی تھی جہاں کھیل تماشے ہو رہے تھے اور میوزک کی دھنا دھن گونج رہی تھی۔ عظیم الشان محراب پر چڑھے ہوئے لوگ نیچے سے بونوں کی طرح نظر آتے تھے۔ یقیناً اوپر والوں کو نیچے والے بونے نظر آتے ہوں گے۔ شاید زیادہ پستی کی طرح زیادہ بلندی بھی انسان کے قد وقامت کو کم کر دیتی ہے۔

شہزاد نے کہا۔ ''مجھے اس سارے معاملے سے ڈر سا لگ رہا ہے سونم! یہ یہاں کے ماحول میں پرورش پائی ہوئی لڑکی ہے۔ اس کے اور ہمارے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم نے دیکھا ہی تھا اس دن وہ خبیث شارق کس طرح کی بکواس کر کے گیا تھا۔ اب اگر یہ ہمارے ساتھ رہے گی تو ان لوگوں کو مزید باتیں بنانے کا موقع ملے گا...... میں چاہتا ہوں کہ جس طرح بھی ہو آج شام تک یہ یہاں سے چلی جائے......''

''آج شام تو یہ کسی صورت نہیں جائے گی۔''

''وہ کیوں؟''

''اسے پتا ہے کہ آج احسن کی سالگرہ ہے۔ یہ اس کے لیے گفٹ وغیرہ بھی لے کر آئی ہوئی ہے۔''

''بہرحال، اسے کل تک چلے جانا چاہیے سونم۔'' شہزاد کا لہجہ حتمی تھا۔

شام کو ہوٹل کے سویٹ میں ہی احسن کی سالگرہ منائی گئی۔ عینی بضد تھی کہ ماما، بگ سسٹر زارا اور ریحان وغیرہ کو بھی بلائے گی لیکن شہزاد نے منع کر دیا۔ یہاں شارق کی وجہ سے جو بدمزگی پیدا ہو چکی تھی اس کے بعد کسی ایسی ''گیدرنگ'' کا کوئی جواز نہیں تھا۔ احسن کی دسویں سالگرہ کا چھوٹا سا کیک کاٹا گیا اور مزیدار ترکش ڈنر کیا گیا۔ عینی نے احسن کو ایک زبردست وڈیو گیم کا تحفہ دیا۔ اس کے علاوہ ایک آٹوگراف بک بھی تھی جو بہت قیمتی تھی۔ احسن اس کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ عینی نے کہا۔ ''اس بک پر سب سے پہلا آٹوگراف پتا ہے کس کا لینا ہے؟''

''کس کا؟'' احسن نے پوچھا۔

''اپنے ابوجان کا۔''

احسن ہنسا۔ ''لو ابوجان بھی کوئی مشہور کھلاڑی ہیں۔''

سب مسکرانے لگے۔ عینی بولی۔ ''لو جی اس کو کہتے ہیں گھر کی مرغی دال برابر۔ بچونگڑے آپ کے ابو کوئی ایویں شیویں بندے نہیں ہیں۔ ایک دنیا جانتی مانتی ہے ان کو۔ انہوں نے یادگار تصویریں کھینچی ہوئی ہیں۔ یہاں پیرس میں ہی زیادہ نہیں تو، ڈیڑھ دو ہزار بندے ان کے پرستار ضرور ہوں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم مجھے شدید قسم کی خوش فہمیوں کا شکار کر دو گی۔'' شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''خود کو ''اوور اسٹیمیٹ'' کرنے والا ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔''

''اور ''انڈر اسٹیمیٹ'' کرنے والا بھی۔'' اس نے برجستہ جواب دیا۔

کھانے کے بعد شہزاد اور فاخرہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ بچے اور عینی ٹی وی لاؤنج میں ہلا گلا کرتے رہے۔ میوزک آن تھا، پھر شہزاد کو اندازہ ہوا کہ وہ لوگ رقص کر رہے ہیں...... شہزاد نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا۔ وہ بچوں کے ساتھ بچہ بنی ہوئی تھی۔ وہ شارٹس پہنے ہوئے تھی، پنڈلیاں دو تہائی عریاں تھیں، بالائی جسم پر بھی ہلکی پھلکی شرٹ تھی۔ اس شرٹ کے کشادہ گریبان میں سے اس کا جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا تاہم وہ ایسی باتوں سے قطعی غافل رہتی تھی اور یہ کوئی صرف عینی کی بات ہی نہیں تھی۔ یہاں کا ماحول ہی ایسا تھا۔ شہزاد نے نوجوان لڑکیوں کو ایسی پتلونیں پہنے ہوئے

دیکھا تھا جو پیٹ کو انتہائی زیریں حد تک عریاں رکھتی تھیں، ان پتلونوں کے ساتھ جب انہیں جھکنا پڑتا تھا تو وہ عقب سے عریاں ہونے لگتی تھیں۔

پھر عینی نے رقص کرتے کرتے عمیر کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ وہ بھی الٹے سیدھے قدم اٹھانے لگا۔ رقص کی مشقت سے عینی کے گال شہابی ہونے لگے تھے۔ احسن تالیاں بجا رہا تھا۔ اس دوران میں عینی نے دیکھ لیا کہ شہزاد دروازے میں ہے۔ وہ شوخی سے بولی۔ ''آ جائیں ناں آپ بھی۔'' اس نے تھوڑی دیر کے لیے میوزک بند کر دیا تھا۔

''سوری مجھے ناچنا نہیں آتا۔'' شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا چلیں تالی ہی بجائیں۔''

''ابو بجائیں نا تالی...... پلیز بجائیں نا۔'' بچے ضد کرنے لگے۔

''مجھے تالی بجانی بھی نہیں آتی۔''

اس دوران میں فاخرہ بھی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی دروازے میں آ گئی۔ ''اچھا میں بجاتی ہوں تالی۔'' اس نے کہا۔

عینی نے میوزک پھر آن کیا۔ وہ ایک پاؤں کو ہولے ہولے حرکت دیتی رہی۔ جب میوزک میں مطلوبہ مقام آیا اور گٹار کے ساتھ ڈرم کی سنگت ہوئی اس نے رقص شروع کر دیا۔ اس کا انداز دلکش تھا...... گاہے بگاہے وہ عمیر کو بھی اپنے ساتھ شامل کر رہی تھی۔ احسن اور فاخرہ تالیاں بجا رہے تھے۔ ہوٹل ''لینونا'' کی چوتھی منزل کی کھڑکیوں سے باہر پیرس کی جگمگاتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں اور دریائے سین پر دھیرے دھیرے چلنے والی روشن کشتیوں کی حرکت بھی کمرے کے اندر سے ہی محسوس کی جا سکتی تھی۔ رقص کے دوران میں تیز حرکات کی وجہ سے اس کے بال جو ربن سے بندھے ہوئے تھے بکھر گئے اور وہ بھی جیسے اس کے ساتھ ہی شریک رقص ہو گئے۔

پھر وہ بڑے انداز سے فاخرہ کی طرف مڑی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ ایک خاص ردھم کے ساتھ فاخرہ کے بازوؤں کو حرکت دینے لگی۔ فاخرہ کرسی پر ہی بیٹھی رہی لیکن یوں لگا کہ وہ بھی اس کے ساتھ رقص میں شریک ہو گئی ہے۔ بچے بھی اس صورتِ حال پر خوش نظر آ رہے تھے۔ فاخرہ کی مضروب کلائی کو اس نے بڑی احتیاط سے کہنی کے پاس سے پکڑا ہوا تھا تاکہ اسے تکلیف نہ ہو۔ میوزک ختم ہوا تو رقص بھی ختم ہو گیا۔ عینی ہانپتی ہوئی ایک صوفے پر گر گئی۔

احسن اس کے اوپر چڑھ گیا اور شوخی میں اس کو گدگدانے لگا۔ وہ لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ اس کا لباس اور بھی بے ترتیب ہو گیا مگر وہ اس صورتحال سے قطعی لاعلم رہتی تھی۔ اسی دوران میں ایک ثانیے کے لیے اس کی نگاہ شہزاد کی نگاہ سے ملی۔ شہزاد کو وہی برقی جھٹکا محسوس ہوا جو اس سے پہلے بھی ہوا کرتا تھا۔ اسے عینی کی آنکھوں میں نجمہ کی آنکھیں دکھائی دیں۔ وہی رنگ، وہی گہرائی وہی معنی خیزی۔ وہ عموماً کوشش کرتا تھا کہ براہ راست عینی کی طرف نہ دیکھے لیکن کبھی کبھار ایسا ہو بھی جاتا تھا جیسے اب ہوا تھا۔ یہاں ایک اور بات بھی قابل غور تھی۔ عینی نے شروع میں دو چار بار شہزاد کو انکل کہا تھا، لیکن اب وہ اسے بڑے تواتر سے مائی لارڈ اور سر جی جیسے خطاب دیتی تھی مگر انکل نہیں کہتی تھی۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔

وہ ان لوگوں کو شور مچاتے چھوڑ کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور ایک کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ اسے پرسوں ایک مقامی لائبریری میں جانا تھا اور ایک فرنچ پروفیسر کے ساتھ مل کر کچھ اسٹوڈنٹس کو ایک لیکچر دینا تھا۔ وہ دیر تک کتاب میں سر کھپاتا رہا لیکن ایک دو نوٹس ہی تیار کر سکا۔ ذہن میں یکسوئی نہیں تھی۔ پردہ تصور پر بار بار وہ دو آنکھیں ابھر آتی تھیں جنہوں نے اٹھائیس تیس سال پہلے اس کے دل ودماغ پر حکمرانی کی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کی زندگی کے ابتدائی بیس پچیس سال انہی آنکھوں کے سنہری طلسم میں گزرے تھے۔ وہ مسکراتی تھیں تو وہ بھی مسکراتا تھا، وہ بھیگتی تھیں تو وہ بھی بھیگ جاتا تھا۔ وہ کچھ کہتی تھیں تو شہزاد چند لمحوں میں سمجھ جاتا تھا۔ ان آنکھوں نے شہزاد کی آنکھوں کے ساتھ مل کر گئے موسموں میں ان گنت سپنے دیکھے تھے...... لاتعداد امیدیں پالی تھیں...... اور پھر یہی آنکھیں تھیں جو دائمی ہجر کو اپنے روبرو دیکھ کر ٹوٹ کر برسی تھیں، خود جل تھل ہوئی تھیں اور شہزاد کو بھی کر گئی تھیں اور پھر یہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے شہزاد کی آنکھوں سے دور ہو گئی تھیں...... لیکن نہیں...... شاید بعد میں ایک اور موقع ایسا آیا تھا جب یہ آنکھیں شہزاد کی آنکھوں سے ملی تھیں اور انہوں نے کچھ کہا تھا...... ہاں ایسا ہوا تھا...... استری شدہ قمیص لے کر اپنے شوہر کے پیچھے لپکتی ہوئی نجمہ سیڑھیوں سے گری تھی اور بستر مرگ پر پہنچ گئی تھی۔ شہزاد نے اسے اسپتال کے سفید براق بستر پر ہی دیکھا تھا۔ کسی ستم گر کی گولی سے شکار ہونے والے سفید ہنس راج کی طرح وہ بے حرکت پڑی، سفید بستر کا حصہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ تب اس کی آنکھیں آخری بار شہزاد کی آنکھوں سے ملی تھیں۔ ان بولتی آنکھوں نے کہا تھا۔

''ہم ہار گئے شہزاد! لیکن ہماری محبت نہیں ہاری، یہ محبت زندہ رہے گی، میں روپ بدل کر آپ سے ملوں گی، نئے موسموں میں......نئی ہواؤں میں اور نئے کھلنے والے پھولوں میں اور سورج کی روپہلی کرنوں میں......

شہزاد نے کتاب ایک طرف پھینک دی اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرلیں، وہ کچھ دیر کے لیے غنودگی میں رہا پھر سوگیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس کے پہلو میں فاخرہ سو رہی تھی۔ اس کی بھاری سانسیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ بچے بھی ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو چکے تھے۔ دھیمی آواز میں کوئی کارٹون فلم اب بھی چل رہی تھی۔ شہزاد نوٹس تیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اٹھ کر ٹی وی آف کیا اور وہیں ایک صوفے پر نیم دراز ہوکر کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اس نے محسوس کیا کہ ساتھ والے کمرے میں عینی ابھی تک جاگ رہی ہے۔ اس نے درمیانی پردہ ہٹا کر دیکھا وہ ٹیبل لیمپ کے پاس قالین پر اوندھی لیٹی کچھ لکھ رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''پوئٹری۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

شہزاد پھر اپنی کتاب میں مگن ہوگیا......''موجودہ دور میں ایڈورٹائزنگ کا اہم کردار اور اس کے منافع بخش پہلو'' یہ اس کے لیکچر کا موضوع تھا۔ وہ اس موضوع سے Related مواد تلاش کرتا رہا۔

اچانک اس نے محسوس کیا کہ عینی اس کے سرہانے کھڑی ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیپر تھا۔ ''یہ دیکھیے مائی لارڈ، میری تازہ نظم۔''

شہزاد اس کے ہاتھ سے لے کر پڑھنے لگا۔ وہ دوبارہ وہیں جا کر ٹیبل لیمپ کے پاس بیٹھ گئی۔ انگلش میں لکھی ہوئی نظم کا ترجمہ کچھ اس طرح تھا۔

مذاق کیا ہے؟
جھوٹ ہی تو ہے
آج آزادی کی محراب کے سامنے شاہِ بلوط کے پیڑوں کے پاس
گھاس پر سنہری دھوپ کی چادر بچھی تھی
وہی طلسمی دھوپ جو زمین کے اندر
گُلِ لالہ کی کونپل کو باہر آنے کی طاقت دیتی ہے
اس دھوپ سے میرے دل میں بھی شرارت کی ایک کونپل پھوٹی
میں نے ایک مذاق کیا۔
اور مذاق کیا ہے؟ ایک جھوٹ ہی تو ہے
لیکن اب جبکہ رات آدھی گزر چکی ہے
پیرس کی روشن آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جارہی ہیں
میں سوچ رہی ہوں
پیرس کی طلسمی دھوپ سے تو صرف پھولوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں
خوشبو اور سچائی پھوٹتی ہے
اس دھوپ سے جھوٹ تو نہیں پھوٹ سکتا
وہ کچھ اور تھا......ہاں وہ کچھ اور تھا۔ شاید گُلِ لالہ کی کونپل تھی۔

نظم ختم کرتے کرتے شہزاد اس کے مفہوم تک پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے رگ وپے میں عجیب سی بے چینی پھیل گئی۔ غالباً عینی نے شاعری کا سہارا لے کر آج دوپہر والے واقعے کا ذکر کیا تھا۔ تب اس نے مذاق کے لہجے میں بڑی بے باکی سے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جسے سن کر فاخرہ بھی ٹھٹک گئی تھی لیکن اب اس نے ڈھٹائی سے اپنے الفاظ کے ذریعے اس مذاق کو سچ کا پہناوا پہنانے کی کوشش کی تھی یعنی یہ صورت حال دوپہر کی صورت حال سے بھی زیادہ سنگین تھی۔

شہزاد نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھا۔ وہ ٹیبل لیمپ کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ روشنی اور آدھا تاریکی میں تھا۔ وہ عجیب انداز سے شہزاد کی طرف دیکھ رہی تھی......اس نے ایک ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے ٹکایا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ یہ سویا سویا سا انداز بڑا انوکھا تھا۔

''ادھر آؤ عینی۔'' شہزاد نے تحکم سے کہا اور اس کے ساتھ ہی انگلی کی حرکت سے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی شہزاد کے سامنے آئی پھر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی......''یہ کیا ہے؟'' شہزاد نے بھنائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نظم ہے جی۔'' وہ سادگی سے بولی۔ اس نے ابھی تک وہی شارٹس اور کھلے گلے کی شرٹ پہن رکھی تھی۔

''یہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے کہ نظم ہے لیکن تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہو۔'' شہزاد کا پارہ چڑھتا جارہا تھا۔

''مائی لارڈ! شاعری میں کچھ ثابت تو نہیں کیا جاتا، ثابت تو سائنس میں کیا جاتا ہے۔ شاعری تو خود مانتی ہے کہ اسے کسی چیز کا پتا نہیں۔ وہ تو خود حیران ہوتی ہے، ورڈز ورتھ ایک جگہ لکھتا ہے کہ......''

''ورڈز ورتھ کو گولی مارو۔'' شہزاد نے چیخ کر کہا۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کیوں کررہی ہو، کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ میرا اور تمہارا رشتہ کیا ہے؟''

شہزاد کے تلخ تر لہجے کو اس نے بڑی آسانی سے جھیلا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہ کچھ سنجیدہ دکھائی دینے لگی۔

پہلے وہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی، پھر اس نے اپنے دونوں گھٹنے اٹھائے اور ان کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ سا قائم کرلیا۔ اس کی ٹھوڑی دائیں گھٹنے کے اوپر ٹک گئی۔ زیرلب مسکرا کر بولی۔ ''سچی سچی بتاؤں یا آپ کے ڈر سے گول مول بات کروں؟''

''مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔'' شہزاد کا انداز بدستور خشک تھا۔

''میں بھی آپ کے منہ سے یہی سننا چاہتی تھی۔ ویسے اگر آپ سچ نہ سننا چاہتے تو پھر میں نے آپ کو کچھ نہیں بتانا تھا کیونکہ جھوٹ بولنے سے تو خاموش رہنا بہتر ہوتا ہے۔''

''اچھا......کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟'' شہزاد نے دیوار سے ٹیک لگائی۔

''لیکن اس سے پہلے میری ایک چھوٹی سی شرط ہے می لارڈ۔'' وہ لجاجت سے بولی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ بہت غصے میں ہونے کے باوجود شہزاد نے کوئی سخت بات نہیں کہی۔

''کیا شرط ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ بس معمولی سی شرط......آپ کو اپنا آٹوگراف دینا ہوگا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' شہزاد کوشش کے باوجود اپنے لہجے کی بیزاری چھپا نہیں پا رہا تھا۔

عینی نے گہری سانس لے کر قالین پر سوئے پڑے عمیر اور احسن کی طرف دیکھا۔ احسن اس کے قریب تھا۔ اس نے احسن کی ٹانگوں پر کمبل درست کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مجھ میں بے شمار خامیاں ہوں گی جی......اور کچھ ایسی خامیاں ہیں جن کو میں خود بری طرح محسوس کرتی ہوں لیکن ایک بات میں پورے اعتماد سے کہہ سکتی ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بولتی اور کوشش کرتی ہوں کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی زبان پر بھی ہو اور وہی میرے کاموں سے بھی ظاہر ہو۔ اب مجھے نہیں پتا کہ جو کچھ میں آپ سے کہوں گی وہ آپ کو اچھا لگے گا یا برا لیکن یہ ہے سو فیصد سچ۔ آپ نے ابھی رشتے کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ میں اپنے اور آپ کے رشتے کو نہیں پہچانتی۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے میں واقعی نہیں پہچانتی۔ میں جس رشتے کو پہچانتی ہوں وہ کوئی اور ہے۔''

''عینی جو کہنا ہے کھل کر کہو۔ میں سن رہا ہوں۔'' شہزاد کی آواز سپاٹ تھی۔

''آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ آپ کا اٹھنا بیٹھنا، ہنسنا، بولنا، ہر چیز......اور اس سے بڑھ کر آپ کا کام۔ میں ان چند دنوں میں ہی آپ کو اپنے دل کے بے حد پاس محسوس کرنے لگی ہوں۔ مجھے زندگی میں کبھی غصہ نہیں آیا لیکن جب شارق ماموں نے آپ کو یہاں اس کمرے میں چوٹیں لگائیں تو مجھے اتنا غصہ آیا کہ اگر میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوتا تو شاید......شاید......'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوگئی۔

ٹشو پیپر سے آنکھوں کی نمی صاف کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''گھر جا کر میں کئی گھنٹے تک روتی رہی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ آپ کی اور آنٹی کی دیکھ بھال کروں، آپ کی ہمت بندھاؤں لیکن ماما کو شارق ماموں کا ڈر تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میرے یہاں آنے سے کوئی بڑا فساد کھڑا ہوجائے۔ میں نے اگلے روز شام تک تو برداشت کیا مگر پھر نہ کرسکی۔ میں نے سوچا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں یہاں آپ دونوں کے پاس چلی آئی۔''

شہزاد یکسر خاموش تھا۔ وہ بس عینی کے چہرے کی طرف دیکھتا چلا جارہا تھا۔

اس کے انداز کو محسوس کرکے وہ بولی۔ ''شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں ایک جذباتی لڑکی ہوں، جو چند دن کی میل ملاقات کے بعد ایسی باتیں کرنے لگ گئی ہوں، ایسی باتیں جو ریت پر لکھی عارضی تحریر کی طرح ہوتی ہیں۔ یہاں میں آپ سے اختلاف کروں گی۔ یہ سب کچھ عارضی نہیں ہے اور نہ ہی دو چار دن میں پروان چڑھا ہے۔ یہ سب کچھ کافی عرصے سے ہے، شاید تین چار سالوں سے۔ دراصل میرے اور آپ کے درمیان جو رشتہ ہے وہ فن کا رشتہ ہے اور ذہنی ہم آہنگی کا رشتہ ہے اور میرے نزدیک یہی رشتہ زیادہ اہم ہے۔''

اس نے جملہ ختم کرکے ایک بار پھر شہزاد کی طرف دیکھا۔ جیسے توقع کررہی ہو کہ وہ کچھ کہے گا مگر وہ خاموش رہا۔ نیند میں فاخرہ کی کھانسی کی آواز سنائی دی اور تب ایک بار پھر ہوٹل کے اس سویٹ میں گہری خاموشی چھا گئی۔ رات کے اس پہر پیرس کی جگمگاہٹیں قدرے ماند پڑ گئی تھیں۔ دور کئی کلومیٹر کے فاصلے پر ایفل ٹاور خاموش کھڑا تھا۔ وہ بھی جیسے شہر کے ساتھ ہی اونگھ رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''دیکھیں، میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ سچ کہوں گی اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔ میں اپنی عمر کے ساتھ ساتھ، عقل سمجھ بوجھ اور شاید ''کامن سینس''، میں بھی آپ سے بہت پیچھے ہوں، میں یہیں پلی بڑھی ہوں۔ پاکستان سے میرا ناتا بہت کم رہا ہے۔ وہاں کے بارے میں میری جو بھی انفارمیشن ہیں وہ مجھے ماما اور پاپا کے ذریعے ہی ملی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہاں اس طرح کے سچ بولے جاتے ہیں یا نہیں اور اگر بولے جاتے ہیں تو انہیں کیا سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال جو کچھ میرے دل میں ہے وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ میں آپ کو پسند کرتی ہوں، آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، آپ سے سیکھنا چاہتی ہوں اور...... اگر...... ہمارے مستقل طور پر ساتھ رہنے اور زندگی گزارنے کا کوئی رستہ نکلتا ہو تو میں اس پر بھی بخوشی قدم رکھنے کو تیار ہوں اور میں پھر کہوں گی، یہ محض جذباتی باتیں نہیں ہیں۔ آپ کے ساتھ میرے تعلق میں بڑی گہرائی ہے۔ یہ تو ایک اچھا اتفاق ہو گیا کہ آپ یہاں آ گئے اور مجھے آپ کے آنے کا پتا بھی چل گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اسی سال یا سال کے آخر میں، میں آپ سے ملنے پاکستان جاتی اور بہت دن تک آپ کی جان کھاتی۔ آپ کے بارے میں میری معلومات اتنی زیادہ ہیں کہ اگر میں آپ کو بتانے پر آ جاؤں تو آپ خود حیران رہ جائیں گے اور ہاں یاد آیا، میں آپ کو ایک مزے کی بات اور بتاؤں......'' ایک لمحہ توقف کر کے وہ دوبارہ بولی۔

''میں دو تین دفعہ پاکستان میں آپ سے فون پر بات بھی کر چکی ہوں۔ ایک مرتبہ کا تو ماما پاپا کو بھی پتا ہے لیکن میں نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ آپ کو بتائیں گے نہیں کہ میں کون ہوں۔ اسی وقت ماما پاپا نے بھی آپ سے تھوڑی ''ہیلو ہیلو'' کی تھی۔ وہ شاید عید کا دن تھا۔ آپ حیدرآباد میں کسی مشترکہ عزیز کے گھر آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دو دفعہ میں نے اکیلے میں آپ سے بات کی۔ بس آپ کی آواز سنی۔ آپ کی خیر خیریت پوچھی۔ آپ بس پوچھتے ہی رہ گئے کہ میں کون ہوں لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ شاید آپ یاد کریں تو آپ کو یاد آ جائے، یہ کوئی چار پانچ ماہ پہلے کی بات ہے۔''

اس کی بولتی آنکھوں میں شوخی تھی اور چہرے پر عجیب سی چمک۔ وہ بات ختم کر کے ایک بار پھر شہزاد کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بار بار توقع کر رہی تھی کہ شاید شہزاد کچھ بولے گا لیکن وہ پتھر کی طرح خاموش تھا۔

شہزاد کے اس انداز نے عینی کو گڑبڑا سا دیا۔ وہ کھسیانی ہو کر کوئی اور موضوع تلاش کرنے لگی۔ پھر ایک دم تیزی سے بولی۔ ''ارے ہاں...... اب آپ اپنی شرط تو پوری کیجیے ناں۔ میں نے تو سب کچھ بتا دیا۔''

شہزاد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''آپ جناب نے آٹوگراف دینا ہے۔'' وہ اٹھی اور اپنے شولڈر بیگ میں سے ایک خاص قسم کا سرخ مارکر اٹھا لائی۔ اسپیشل PERMANENT INK والے ایسے مارکرز عام طور پر جلد پر ٹیٹو وغیرہ بنانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

''لیجیے جناب!'' اس نے مارکر شہزاد کو تھما دیا۔ پھر شرٹ کا بالائی بٹن کھول کر اپنی شرٹ شانے پر سے نیچے کھسکا دی۔ ''یہ نیا فیشن ہے جی۔ کالربون (ہنسلی کی ہڈی) کے نیچے ٹیٹو بنانے کا۔ اسے ہم آج کل ''ہارٹ ٹاپ مارک'' کہتے ہیں۔ آپ ٹیٹو تو نہیں بنائیں گے آپ بس اپنے پیارے سے سائن کر دیجیے۔''

وہ خطرناک حد تک عریاں ہو رہی تھی اور اسے اس عریانی کی مطلق پروا نہیں تھی یا شاید...... وہ جان بوجھ کر پروا نہیں کر رہی تھی۔

شہزاد نے بہت درگزر کیا تھا۔

بہت تحمل کا ثبوت دیا تھا۔

لیکن اب یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس کی رگوں میں جیسے لہو کی جگہ چنگاریاں چھوڑتا طیش دوڑ گیا۔

اس نے مارکر ایک طرف رکھا اور پھر...... ایک زناٹے کا تھپڑ عینی کے گال پر مارا۔ چٹاخ کی آواز ابھری۔ عینی کے بال اچھل کر اس کے چہرے پر آئے اور وہ بیٹھی بیٹھی دو تین فٹ پیچھے لڑھک گئی۔ اس کے چہرے پر حیرت کا سمندر موجزن ہوا...... اور ہمیشہ بولتی آنکھیں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ اس کا کندھا ابھی تک عریاں تھا اور کمرے کی روشنی میں بالکل دودھیا نظر آ رہا تھا۔

''اٹھو یہاں سے اٹھو۔'' شہزاد نے دھیمے لیکن نہایت سخت لہجے میں کہا۔

وہ لرز کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سفید تھا۔ شہزاد اپنی جگہ سے اٹھا اور دھیمے قدموں سے چلتا اس کے پاس پہنچا۔ اس نے ایک نظر بیڈروم کے بند دروازے پر ڈالی۔ جیسے اندازہ لگانا چاہ رہا ہو کہ فاخرہ کہیں جاگ تو نہیں گئی۔ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ وہ عینی سے مخاطب ہو کر پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم انتہائی بے شرم ہو۔ تمہیں اپنی عزت کا پاس ہے نہ کسی اور کی عزت کا۔ تم جانتی ہو تم کس سے بات کر رہی ہو؟ میں تمہاری ماں کا پھوپی زاد ہوں۔ اپنی

عمر دیکھو، میری عمر دیکھو، خدا کا خوف نہیں تو کچھ دنیا کا خیال ہی کرو، میں حیران ہوں کہ تم نے کیا پڑھا ہے اور کیا تربیت حاصل کی ہے۔'' غصے کے سبب شہزاد کا سارا وجود لرز رہا تھا۔

وہ پلکیں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ تاہم اب اس کے چہرے کی سفیدی ہلکی سی سرخی میں بدل گئی تھی۔

اس دوران میں بیڈ روم سے فاخرہ کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔ ''شہزاد! کیا بات ہے، کیا ہوا ہے؟''

شہزاد نے عینی کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور اس سے مخاطب ہو کر دھیمی آواز میں بولا۔ ''صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جاؤ۔ میں دوبارہ تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔''

اس کے بعد اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور فاخرہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کچھ نہیں فاخرہ...... سو جاؤ تم۔''

مگر لگتا تھا کہ فاخرہ جاگ چکی ہے اور بیساکھیوں کے سہارے باہر آرہی ہے۔ عینی اپنے آنسو چھپاتی ہوئی جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فاخرہ باہر آئی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے تیزی سے ماحول کا جائزہ لیا اور اس کی نیند سے بوجھل آنکھوں میں اندیشے کچھ اور بڑھ گئے۔

''کیا بات ہے عینی؟ کیا ہوا ہے؟'' فاخرہ نے عینی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے۔'' شہزاد نہایت کرخت لہجے میں بولا۔ ''اس سے کہو کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جائے۔ نہیں تو میں چلا جاؤں گا۔''

وہ پاؤں پٹختا ہوا بیڈ روم میں آگیا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ گردن میں پھر شدید درد ہونے لگا تھا۔ اس نے دو پین کلر کھائیں ساتھ میں ایک سکون بخش ٹیبلیٹ بھی لے لی اور اپنے ذہن کو نارمل کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ فاخرہ دوسرے کمرے میں عینی کے پاس تھی۔ وہ بہت مدھم آواز میں بول رہی تھی۔ الفاظ شہزاد کی سماعت تک نہیں پہنچ رہے تھے۔

وہ اضطراب کے عالم میں کچھ دیر تک اونگھتا رہا۔ فاخرہ کمرے میں واپس نہیں آئی، کچھ دیر بعد شہزاد کو بھی نیند آگئی۔

وہ زیادہ دیر نہیں سویا۔ آنکھ کھلی تو اجالا ہو رہا تھا۔ المونیم کی عجیب وضع کھڑکی سے دھوپ کی پہلی کرنیں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ نیلے آسمان پر جہازوں کے چھوڑے ہوئے سفید دھوئیں کی آڑی ترچھی لکیریں دکھائی دے رہی تھیں۔ فاخرہ سامنے وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ اس کی بیمار آنکھوں میں گہری اداسی اور یاسیت کروٹیں لے رہی تھی۔

شہزاد کو اندازہ ہوا کہ عینی شاید بہت کچھ اسے بتا چکی ہے۔

''شہزاد! یہ کیا کیا آپ نے؟'' وہ نم ناک لہجے میں بولی۔

''جو کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔'' شہزاد کا لہجہ اٹل تھا۔ فاخرہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ ''اسے کہو سونم! کہ بس ایک آدھ گھنٹے کے اندر یہاں سے چلی جائے۔'' شہزاد نے حکمیہ انداز اختیار کیا۔

''وہ جا چکی ہے۔'' فاخرہ آزردہ لہجے میں بولی۔

''کب؟''

''دو گھنٹے ہو گئے ہیں، ابھی اندھیرا ہی تھا۔ میں روکتی رہی لیکن وہ نہیں رکی۔ بڑی دکھی ہو کر گئی ہے یہاں سے۔''

شہزاد خاموش رہا۔ اس کے ہونٹ مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔

''آپ نے اسے طمانچہ بھی مارا تھا؟'' فاخرہ نے پوچھا۔

''ہاں مارا تھا بلکہ اس وقت میرا دل چاہا تھا کہ اسے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔ وہ پرلے درجے کی احمق ہے...... وہ...... وہ فلرٹ کر رہی تھی مجھ سے...... اسے شرم نہیں آئی کہ میرا اور اس کا رشتہ کیا ہے۔ میں اس کے باپ کی عمر کا ہوں۔''

فاخرہ کچھ دیر خاموش رہی پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ''جو کچھ بھی ہے شہزاد...... آپ کو اس کے ساتھ ایسا رویہ تو اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ یہاں کے آزاد ماحول میں پلی بڑھی ہے۔ بندہ جس ماحول میں ہوتا ہے اسی میں ڈھل جاتا ہے...... اور یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔''

''تم نہ کرو اس کی وکالت۔'' شہزاد گرجا۔ ''اگر لوگ یہاں ننگے پھرتے ہیں تو کیا ہم بھی ننگا پھرنا شروع کر دیں۔ وہ حد سے بڑھ رہی تھی۔ میں نے اسے پہلے بھی ایک دو بار اشارے کنائے میں منع کیا تھا لیکن وہ ایک ضدی لڑکی ہے۔ یہاں کے رنگ میں پوری طرح رنگی ہوئی ہے۔ آج اسے جو سبق ملا ہے وہ کافی عرصے تک یاد رہے گا۔ آئندہ زندگی میں اس کے کام آئے گا۔'' شہزاد کا لہجہ جذبات کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ ''اور اب میں اس بارے میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔'' شہزاد نے کمبل پھر اوڑھ لیا۔

''اگر اس نے باجی فرزانہ کو اس بارے میں بتایا تو پھر؟''

''بتا دے، سب کو بتا دے۔'' شہزاد نے کمبل کے اندر سے ہی جواب دیا۔ ''آگے ان لوگوں کے ساتھ ہماری کون سی گاڑھی رشتے داریاں ہیں، جہاں دل آپس میں نہ ملتے ہوں وہاں ایک دوسرے سے دور ہی رہا جائے تو بہتر ہوتا ہے۔''

فاخرہ خاموش ہو گئی لیکن اس کے بیمار چہرے پر اندیشوں کے گہرے سائے صاف محسوس کیے جا سکتے تھے۔

بعد میں شہزاد بھی دیر تک سوچتا رہا۔ کم از کم اسے تھپڑ نہیں مارنا چاہیے تھا۔ یہ کام الٹا بھی پڑ سکتا تھا۔ وہ بھی طیش میں کوئی الٹا سیدھا کام کر سکتی تھی۔ کوئی بات کہہ کر اپنے گھر والوں کو بھڑکا سکتی تھی یا پھر پولیس کے پاس جا سکتی تھی۔ یہاں تو چھوٹا بچہ بھی اپنے ماں باپ کے خلاف مار پیٹ کی رپورٹ درج کرا سکتا تھا۔ یہ تو پھر جوان تھی اور وہ اس کا خونی رشتے دار بھی نہیں تھا۔

دو دن خاموشی سے گزرے۔ اس دوران میں شہزاد کے سر کی چوٹیں قدرے بہتر ہو گئیں...... گردن کے درد میں بھی اب افاقہ تھا۔ وہ پی کیپ پہن کر لیکچر میں شرکت کے لیے بھی گیا۔ تصویروں کی ایک نمائش بھی دیکھی۔ یہ دونوں مصروفیات اس کے ''پیرس شیڈول'' میں شامل تھیں۔ اس دوران میں صرف ایک بار فرزانہ کا فون آیا۔ اس نے فاخرہ سے حال چال پوچھا۔ عینی کے حوالے سے فرزانہ نے کوئی بات کی اور نہ عینی کی بڑی بہن زارا نے۔ یوں لگتا تھا کہ شاید عینی نے یہاں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں ان کو کچھ بتایا ہی نہیں۔

تیسرے دن کی بات ہے شہزاد، کمرے کی کھڑکی کھولے بیٹھا تھا اور دریا کا منظر دیکھ رہا تھا۔ حسب معمول دونوں فرانسیسی بوڑھے آج بھی کنارے پر موجود تھے اور اپنے خیالات میں غلطاں نظر آتے تھے۔ وہ آپس میں بھی شاید بہت کم ہی بات کرتے تھے۔ اچانک کال بیل ہوئی۔ عمیر نے دروازہ کھولا پھر اس کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''آ خا...... دیکھو امی کون آیا؟''

''گڈ ایوننگ'' کی مدھم آواز سنائی دی اور شہزاد کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ یہ عینی ہی تھی۔

عینی فاخرہ اور بچوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ شہزاد نے اٹھ کر بیڈ روم کا دروازہ بند کر لیا۔ اسے شدید الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اب کیا لینے آئی تھی یہاں؟

دس پندرہ منٹ گزر گئے، پھر ہولے سے دروازہ کھلا اور فاخرہ اندر آگئی۔ ''کیا بات ہے؟'' شہزاد کا لہجہ سخت تھا۔

فاخرہ نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ آپ سے معافی مانگنے آئی ہے۔ بہت شرمندہ ہے۔ رو بھی رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے معاف کیا میں نے۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، بس وہ یہ مہربانی فرمائے کہ اپنے گھر میں رہے۔''

''چلیں...... کوئی بات نہیں۔ آپ ایک بار مل لیں اس سے۔'' فاخرہ نے التجا کی۔

اس سے پہلے کہ شہزاد جواب میں کچھ کہتا، وہ خود ہی اشک بار آنکھوں کے ساتھ اندر آگئی۔ اس نے آتے کے ساتھ ہی ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں جی، میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ کو میری وجہ سے تکلیف پہنچی۔ اس کا مجھے بہت زیادہ افسوس ہے...... میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ...... بہت محتاط رہوں گی۔''

شہزاد خاموش رہا۔ ماتھے پر گہری شکنیں تھیں۔

''پلیز...... میں وعدہ کرتی ہوں۔ کوئی ایسی بات نہیں کروں گی جس سے آپ کی ناراضی کا پہلو نکلتا ہو۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ اپنے لباس کی طرف توجہ دو...... دیکھو اب بھی تم نے جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں وہ گھروں میں پہننے کے لائق نہیں ہیں۔ اپنی بول چال پر غور کرو۔ مختلف عمر کے لوگوں سے بات کرتے ہوئے مختلف لہجہ اپنانا پڑتا ہے۔ حفظ مراتب اسی کو کہتے ہیں تم بہت کچھ بننا چاہتی ہو لیکن پڑھائی کی طرف تمہاری توجہ کتنی ہے؟ پچھلے آٹھ دس دنوں میں، میں نے تو شاید تمہاری زبان سے ایک بار بھی پڑھائی کی بات نہیں سنی......''

شہزاد بولتا رہا اور وہ کسی اسٹوڈنٹ ہی کی طرح سر جھکائے سنتی رہی۔

''آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔'' اس نے آخر میں کہا۔

فاخرہ اسے باہر لے گئی۔

شہزاد چاہتا تھا کہ اب وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جائے لیکن وہ اور فاخرہ باتیں کر رہی تھیں۔ آدھ پون گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ شہزاد کو فاخرہ پر بھی غصہ آنے لگا کہ وہ اسے فارغ کیوں نہیں کر رہی۔ کچھ دیر بعد فاخرہ بیساکھیوں کے ساتھ اندر آئی اور ہولے سے بولی۔ ''وہ اب بھی پریشان ہے، کہہ رہی ہے کہ آپ نے اسے دل سے معاف نہیں کیا۔''

''تو کیا کروں اب؟''

''وہ آپ کے لیے چاکلیٹس لائی ہے، کہتی ہے کہ جب تک آپ اس کا چاکلیٹ نہیں کھائیں گے، وہ یہی سمجھے گی کہ آپ خفا ہیں۔''

یورپ امریکا وغیرہ میں چاکلیٹس شوق سے کھائے جاتے ہیں اور کئی حوالوں سے ان کی اہمیت بھی ہے، بے شمار جگہوں پر مختلف سوئٹس اور خاص طور... سے چاکلیٹس کا استعمال ہوتا ہے۔ کسی کو منانے کے لیے، تحفہ دینے کے لیے۔ Compliments پیش کرنے کے لیے، ہدیہ وغیرہ کے طور پر، اس کا استعمال ہمہ جہتی ہے۔ وہ بھی شہزاد کے لیے چاکلیٹس لائی تھی۔ طوعاً وکرہاً.... شہزاد کو بیڈ روم سے باہر آنا پڑا۔ اس نے چاکلیٹ کے ایک دو ٹکڑے کھائے۔ فاخرہ نے چائے اور اسنیکس بھی منگوا لیے تھے۔ انہوں نے اکٹھے چائے پی۔ شہزاد بھی کسی حد تک نارمل ہو گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بدلے ہوئے موڈ کی وجہ سے بچے بھی کچھ بجھ سے گئے ہیں۔ عینی کے ساتھ ان کی خاصی ایسوسی ایشن ہو گئی تھی اور اب عینی کو آزردہ دیکھ کر وہ بھی آزردہ تھے۔

عینی کی خواہش تھی کہ پیرس کی باقی سیر بھی وہ لوگ ان کے ساتھ کریں، اگر ایسا نہ ہوا تو وہ ان کے جانے کے بعد بہت دکھی رہے گی۔ شہزاد ہامی بھرنے سے کترا رہا تھا مگر فاخرہ نے ہامی بھر لی۔

عینی نے اپنے گال پر پڑنے والے تھپڑ کے بارے میں گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ اس نے فاخرہ سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ اس کے ماما پاپا یا زارا وغیرہ سے اس واقعے کا بالکل ذکر نہ کرے۔ وہ آٹھ بجے کے قریب گھر واپس چلی گئی۔ بچے موجودہ صورت حال سے خوش تھے۔ انہیں امید بندھ گئی تھی کہ اب پھر سیر کا موقع ملے گا۔ رات کو جب شہزاد سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو عینی کا چہرہ اس کی نگاہوں میں آ گیا۔ پہلی بار اسے عینی پر تھوڑا سا ترس آیا۔ سے لگا کہ اس سے زیادتی ہوئی ہے۔ تھپڑ کھانے کے بعد اس نے جس طرح ششدر ہو کر شہزاد کو دیکھا تھا اور اس کا رنگ رف ہوا تھا وہ واقعی ترس ناک تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ بھی تھوڑا سا پھٹ گیا تھا اور فاخرہ نے بتایا تھا کہ اس رات وہ دیر تک شو پیپر سے ہونٹ کو دباتی رہی تھی۔

جو کچھ بھی تھا، شہزاد کا دل اب بھی یہی چاہتا تھا کہ عینی کے ساتھ ان کی زیادہ میل ملاقات نہ ہو۔ شارق جس طرح ی بے ہودگی کر کے یہاں سے گیا تھا وہ بہت کچھ سوچنے پر بور کر رہی تھی...... عین ممکن تھا کہ اس نے عینی کے والد جمیل احب کے کانوں میں بھی کوئی الٹی سیدھی بات ڈال دی ہو روہ شہزاد کی طرف سے محتاط ہو گئے ہوں۔ دو چار روز سے ن کی طرف سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ابھی شہزاد یہ بات چ ہی رہا تھا کہ ہوٹل کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف جمیل احمد صاحب ہی تھے۔

سلام دعا کے بعد انہوں نے کہا۔ ”شہزاد! عینی نے تمہاری ایک شکایت کی ہے۔“

شہزاد بری طرح چونک گیا۔ ”کک...... کیسی شکایت جی؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ کہتی ہے کہ تم اس کی اور فاخرہ کی بار بار کی درخواست کے باوجود ہمارے گھر نہیں آئے ہو۔“

شہزاد نے ایک سرد آہ بھری۔ ”آپ نے دیکھا ہی ہے بھائی جان! کہ شارق یہاں کیا تماشا لگا کر گیا ہے، اس کے بعد ہماری میل ملاقات کی کم ہی گنجائش رہ جاتی ہے......“

”شارق کو گولی مارو...... میں اس کے نہیں اپنے گھر کی بات کر رہا ہوں۔ میرے گھر کے معاملوں میں دخل دینے والا وہ کون ہوتا ہے اور ویسے بھی اس کی کیا حیثیت ہے۔ وہ موٹے دماغ کا بیکار شخص ہے۔ اپنے طور پر اس نے کچھ نہیں کیا ہے۔ انکل جہانگیر نے جو کچھ کمایا تھا اسی پر اترا رہا ہے اور وہ سب کچھ بھی کتنی دیر تک ساتھ رہے گا۔ ادھر جہانگیر صاحب کی آنکھیں بند ہوئیں، ادھر اس نے سب کچھ اپنی عیاشیوں میں برباد کر چھوڑنا ہے، خیر چھوڑو، وہ اس قابل ہی نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے۔“ جمیل احمد صاحب شارق کے خلاف بھرے ہوئے تھے۔

انہوں نے آخر میں کہا۔ ”بھئی! عینی میری سب سے لاڈلی اولاد ہے اور میرا ایک مشورہ ہے تمہیں۔ اس کی کوئی بات ٹالنا نہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ اس کی بات ٹالنے والا نقصان میں اور ماننے والا فائدے میں رہتا ہے اور یہ تجربہ میں نے کوئی دو چار دن میں حاصل نہیں کیا۔ اٹھارہ انیس سال کا دورانیہ ہے، میں جب بھی...... جب بھی اس کے کہنے پر چلتا ہوں مجھے فائدہ ہوتا ہے۔ چاہے کوئی گھریلو پریشانی ہو، چاہے کاروباری معاملہ ہو یا کوئی اور مسئلہ۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے اندر کوئی خاص کرشماتی ٹائپ کی روح ہے۔ تمہیں پتا ہے جب یہ پیدا ہوئی تھی تو کیا ہوا تھا؟ تم نے وہ مکان گرنے والا واقعہ سنا ہوا ہے؟“

نہیں جی۔“ شہزاد نے کہا۔

”ان دنوں ہم سان فرانسسکو میں تھے۔ پیدائش کے تیسرے روز کی بات ہے۔ گھر آتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کی دادی اسے گود میں لے کر گھر میں چکراتی رہیں۔ یہ پورے گھر میں روتی رہی لیکن جب کچن کے ساتھ والے ایک چھوٹے کمرے میں پہنچتی تھی تو رونا بند کر دیتی تھی۔ آخر ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ کمرا نسبتاً زیادہ گرم ہے اس

لیے یہ یہاں آ کر چپ ہو جاتی ہے لہٰذا فرزانہ بھی اس کمرے میں شفٹ ہو گئی۔ اگلے روز صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ شدید زلزلہ آیا۔ اس زلزلے میں علاقے کا بہت جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ خاص طور سے ساحلی علاقے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ میں اس وقت آفس میں تھا۔ ہمارا گھر بھی تقریباً سارا ہی گر گیا تھا۔ صرف وہی کمرا بچا جہاں فرزانہ، زارا، عینی اور ان کی دادی موجود تھیں۔ امدادی کارکنوں نے انہیں بڑی مشکلوں کے ساتھ وہاں سے نکالا اور یہ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے بھئی۔ ہاں اسے تم پہلا واقعہ کہہ سکتے ہو۔ اس لڑکی کی بات مان لینے میں اکثر فائدہ ہی ہوتا ہے۔ اب یہ آخری تجربہ ہی دیکھ لو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ”اسی کے پرزور اصرار پر میں تبدیلی آب و ہوا کے لیے یہاں سوئٹزرلینڈ میں موجود ہوں اور کافی افاقہ ہوا ہے، بے شک مہنگائی بہت ہے اور جیب ہلکی ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ طبیعت بھی تو کافی ہلکی ہوئی ہے۔“ انہوں نے پھر قہقہہ لگایا۔

”ہاں آپ کی آواز سے تو لگ رہا ہے کہ آپ اچھا محسوس کر رہے ہیں۔“

”بالکل۔“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”اس وقت میں سوئٹزرلینڈ کے کیپٹل ”زیورخ“ میں ہوں۔ زیورخ کا دل زیورخ کی جھیل ہے جسے ”زیورخ بے“ کہتے ہیں۔ میں نے اس وقت نیکر پہنی ہوئی ہے۔ ہیڈ فون لگا کر ”ایس بی“ پر فریش میوزک سن رہا ہوں اور ہلکی پھلکی جاگنگ کر رہا ہوں۔ واقعی بھئی، کوئی بات ہے سوئٹزرلینڈ میں۔“

اگلے روز عینی اپنی ”پی جو“ گاڑی پر پھر ہوٹل پہنچ گئی۔ اسے دیکھ کر بچے بہت خوش ہوئے۔ ان کی چہکاریں لوٹ آئیں اور چہروں کی رونقیں بحال ہو گئیں۔ شہزاد نے نوٹ کیا۔ وہ حیران کن طور پر بڑا ”سوبر“ لباس پہنے ہوئے تھی۔ شلوار قمیص کے ساتھ ایک اسکارف ٹائپ کپڑا بھی تھا۔ لباس کے علاوہ اس کا چہرہ بھی سنجیدہ نظر آتا تھا تاہم یہ سنجیدگی ایسی نہیں تھی کہ تفریح کے موڈ کو خراب کرتی۔ حسب معمول اس نے اصرار کر کے فاخرہ کو بھی ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ فاخرہ کی طبیعت اب قدرے اچھی تھی۔ حسب معمول بچے عینی کے ساتھ آگے بیٹھ گئے۔ فاخرہ اور شہزاد نے پچھلی نشست سنبھال لی۔ آج وہ دریائے سین کے ساتھ ساتھ نکلے اور راستے میں آنے والی مختلف قابلِ دید جگہوں پر تھوڑی تھوڑی دیر رکتے گئے۔

وہ جو ذرا تناؤ کی کیفیت تھی وہ ایک دو گھنٹے کی سیر کے بعد دور ہو گئی۔ عمیر اور احسن عینی سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ وہ بھی انہیں جواب دینے لگی۔ فاخرہ بھی عینی کو نارمل کرنے کے لیے مسلسل باتیں کر رہی تھی، حالانکہ وہ کم ہی بولتی تھی۔

راستے میں ایک ٹریک سگنل پر ایک عمر رسیدہ فرنچ عورت کو دیکھ کر فاخرہ نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ تو بالکل تائی کلثوم لگتی ہے۔“ سب نے چونک کر عورت کی طرف دیکھا۔ لمبی ناک اور کرخت چہرے والی وہ عورت شاید کسی فلنگ اسٹیشن پر کام کرتی تھی۔ کم از کم اس کی وردی سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ وہ ایک سائیکل سوار لڑکے سے تکرار کرنے میں مصروف تھی جس نے شاید اس کا راستہ کاٹا تھا یا ہلکی پھلکی چوٹ پہنچائی تھی۔ گاڑی اس کے پاس سے گزر گئی۔

عینی نے چونک کر کہا۔ ”ہاں آنٹی! جن کو آپ نے تائی کلثوم کہا ہے یہ وہی ہیں ناں...... جنہوں نے...... میرا مطلب ہے جنہوں نے خالہ نجمہ کو بہو بنایا تھا۔“

”ہاں، وہی ہیں۔ آج کل اپنے بھائیوں کے پاس رہتی ہیں۔ کالے موتیے کی وجہ سے ان کی بینائی بالکل ختم ہو چکی ہے۔“

”ہاں...... ہاں کوئی ایسی بات تو میں نے بھی سنی تھی مگر وہ اپنے بھائیوں کے پاس کیوں ہیں؟“ عینی نے پوچھا۔ اس کے انداز میں گہرا تجسس تھا اور یہ وہی تجسس تھا جو شہزاد اور نجمہ کے حوالے سے اس میں شاید کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ممانی کلثوم بھی اس کہانی کا حصہ تھی۔

فاخرہ نے بتایا۔ ”تایا طفیل تو تیرہ چودہ برس پہلے فوت ہو گئے تھے۔ اس کے بعد تائی کے لے پالک سجاد نے پر پرزے نکالنے شروع کیے۔ باجی نجمہ کے بعد اس نے دوسری شادی کی تھی۔ اس کی دوسری بیوی ایک نمبر کی خرانٹ ہے۔ اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ تائی کے سیر کو سوا سیر مل گیا تھا۔ بیٹے اور بہو نے تائی کو نچا کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ ساس بہو میں مار پیٹ تک کی نوبت آ گئی۔ شاید قدرت نے تائی سے ان ناانصافیوں کا بدلہ لیا ہے جو انہوں نے باجی نجمہ سے روا رکھی تھیں۔“

”بالکل یہی ہوا ہوگا۔“ عینی نے ہنکارا بھرا۔ ”مجھے ماما نے بتایا تھا کہ شادی کے بعد نجمہ خالہ کو ساس اور شوہر نے بہت دکھی کیا تھا۔ اسی دکھ میں ان کی زندگی بھی چلی گئی۔“

”خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے، کبھی کبھی انصاف میں دیر تو لگتی ہے لیکن انصاف ہوتا ضرور ہے عینی۔“ فاخرہ نے کہا۔ ”تائی کلثوم کے لے پالک سجاد نے کاروبار تو پہلے ہی تباہ کر چھوڑا تھا، اب ڈھائی تین سال پہلے اس نے مکان بھی تائی کلثوم سے ہتھیا لیا۔ حالانکہ تائی خود بھی بڑی چوکس عورت

ہیں لیکن پتا نہیں کیسے اس کے چکر میں آ گئیں۔ انہوں نے سجاد کو مختار نامہ دیا اور اس نے گھر بیچ کر بیوی کے ساتھ کوئٹہ کا ٹکٹ کٹا لیا۔ تائی اب بے گھر ہو کر چھوٹے بھائی کے پاس ہے۔ کوئی کیس وغیرہ بھی لڑ رہی ہے لیکن بننا بنانا کچھ نہیں۔ بہو کا بھائی خود بڑا اخرانٹ وکیل ہے اور اب تو تائی ویسے بھی چل پھر نہیں سکتی۔ اس کی نظر بالکل ختم ہو چکی ہے۔''

عینی، فاخرہ سے کرید کرید کر سوال پوچھتی رہی اور اس کے سوالوں سے وہ گوناں گوں دلچسپی ظاہر ہوتی رہی جو وہ اس کہانی سے رکھتی تھی۔ اس کے چہرے مہرے سے صاف ظاہر تھا کہ ممانی کلثوم کی شامتِ اعمال کا سن کر وہ خوش ہوئی ہے۔

دریائے سین کے کنارے پر نرم نرم دھوپ کا بسیرا تھا۔ پھول کھلے تھے اور وہ اپنی چاروں طرف ہنستے مسکراتے چہروں کی بہار دیکھ رہے تھے۔ بچے کشتی کی سیر کو مچل گئے۔ شہزاد اور فاخرہ کا خیال تھا کہ کشتی کی سیر کے بجائے یہیں سبزہ زار میں ''میٹ'' بچھا کر بیٹھا جائے اور چائے پی جائے۔ ایک ہی خوبصورت مقام کو بچے اور انداز میں دیکھ رہے تھے جبکہ فاخرہ اور شہزاد اور انداز میں...... فاخرہ اور شہزاد کو ان کی ''تھکاوٹ'' کنارے پر رکھنا چاہتی تھی جبکہ بچوں کو ان کی ''وافر توانائی'' مچلتی لہروں کی طرف دھکیل رہی تھی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ شہزاد بچوں کو لے کر کشتی میں بیٹھے گا جبکہ عینی کنارے پر فاخرہ کے ساتھ رہے گی۔

قریباً ایک گھنٹا کشتی میں سیر کے بعد جب وہ کنارے پر واپس آئے تو شام ہو چکی تھی، پیرس کی دوشیزہ...... ایک ریشمی شب کو اپنے سامنے دیکھ کر انگڑائی لے رہی تھی اور اس کے آنچل میں بے شمار ستارے جھلملانے لگے تھے۔ انہوں نے کنارے پر بیٹھ کر گرما گرم چائے پی اور بسکٹ کھائے۔ ایک تفریحی بجرے پر موجود کچھ منچلے بیئر پی رہے تھے اور میوزک پر مسلسل رقص کر رہے تھے، ان میں لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ غالباً یہ کوئی برتھ ڈے پارٹی تھی پھر ان لوگوں نے آتش بازی شروع کر دی۔ قوس قزح کے رنگوں والی ہوائیاں فضا میں روشنی بکھیرنے لگیں۔

عینی اس آتش بازی میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ اس کے بجائے وہ دور ایفل ٹاور کے روشن ہیولے کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں سیکڑوں ہزاروں قمقمے جل بجھ رہے تھے اور ٹاور کی دلکشی میں اضافہ کر رہے تھے۔

''دیکھیں باجی! کتنی پیاری ہوائیاں ہیں۔'' عمیر نے عینی کو جھنجوڑتے ہوئے آتش بازی کی طرف متوجہ کیا۔

''ہوں۔'' عینی نے مختصر جواب دیا۔

''تمہیں آتش بازی اچھی نہیں لگتی؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''نہیں جی...... یہ خطرناک کام ہے اور آپ کو؟''

''مجھے بھی نہیں لگتی۔'' شہزاد نے کہا۔

وہ مسکرائی۔ ''پر آپ تو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے؟''

''وہ تو یونہی، بچوں کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔''

''پتا نہیں کیا بات ہے، مجھے پٹاخے، آگ، دھواں وغیرہ بالکل اچھے نہیں لگتے اور خاص طور پر اس کی بُو، جو فائر ورک کے ساتھ پھیلتی ہے۔''

ایکا ایکی شہزاد بری طرح چونک گیا، یہی الفاظ...... اسی انداز میں...... کسی موقعے پر کسی اور نے بھی کہے تھے۔

اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔ ہاں بالکل یہی انداز تھا۔ برسوں پہلے ماموں جہانگیر کے گھر کی چھت پر، شبِ برات کے موقع پر سارے کزن مل کر ہلا گلا کر رہے تھے۔ آتش بازی ہو رہی تھی۔ نجمہ اس آتش بازی سے بالکل لاتعلق ہو کر موم بتیاں روشن کرنے میں مصروف تھی۔ شہزاد اس کے پاس جا کھڑا ہوا تھا...... اور تب بالکل ایسی ہی باتیں نجمہ نے کہی تھیں۔

وہ گم صم ہو گیا۔ اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں سے بہت دور چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے نجمہ اور عینی میں گاہے بگاہے حیران کن مماثلتیں کیوں نظر آ رہی ہیں۔ وہ ان مماثلتوں سے صرفِ نظر کرنے کی بہت کوشش کرتا تھا، کچھ کو اپنا وہم قرار دیتا تھا، کچھ کو اتفاق کے حوالے سے دیکھتا تھا، لیکن پھر بھی یہ مماثلتیں اور مشابہتیں مسلسل اس کی نگاہوں کے سامنے ابھر رہی تھیں اور ان میں سب سے اہم مشابہت آنکھوں کی تھی۔ عینی کی آنکھوں میں شہزاد بہت کم دیکھتا تھا لیکن جب بھی دیکھتا تھا اسے ایک شاک کی سی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ آنکھوں کی بناوٹ ایک جیسی ہونا اور بات ہوتی ہے...... لیکن یہ تو عینی کی آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ یہ نجمہ کی تھیں اور ان کے اندر بھی جو کچھ تھا وہ نجمہ کا تھا۔ وہ چوتھائی صدی سے زیادہ کا فاصلہ پھلانگ کر پیرس میں رہنے والی عینی کی آنکھوں میں نمودار ہوئی تھی، اب وہ اسے دیکھ رہی تھی، پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں لوٹ کر آؤں گی اور وہ شاید لوٹ آئی تھی۔

مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے

شہرِ محبت

طاہر جاوید مغل

دوسرا حصہ

چاہت کے سپنے بڑے سُندر اور نازک آبگینوں کے مانند ہوتے ہیں جنہیں بہت سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے بھی کرچی کرچی ہوجاتے ہیں مگر...... یہاں تو حسد ورقابت کی اتنی تیز آندھیاں تھیں کہ کوئی زندگی ہی ہار گیا اور کوئی جیت کر بھی زندگی کا لطف نہ اٹھا سکا۔ حسد ورقابت کے جذبات سے جانے کتنی ہی کہانیوں نے جنم لیا۔ جہاں اپنی مقصد برآری کے لیے لوگ کیا کیا گُر اپنا لیتے ہیں اور کسی کو ذلّت کے گڑھے میں دھکیلنے کے لیے کیسے کیسے ہنر آزماتے ہیں لیکن...... قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی...... اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ محبت کے جو لمحات اس کے ہاتھوں سے ریت کے مانند پھسل چکے ہیں یوں اتنے دلکش سراپا میں ڈھل کر اس کے سامنے آکھڑے ہوں گے...... مگر جانے کیوں اس بار اس کی آنکھیں شہرِ محبت کا یہ خواب دیکھنے کے لیے راضی نہ ہوسکیں...... خوشبوئوں کی سرزمین پیرس کی حسین رہ گزاروں میں سفر کرتی ایک گنگناتی خوبصورت داستان۔ محبوب مصنّف طاہر جاوید مغل کے قلم کی دلکش روانی۔

جذبات کے تلاطم سے جنم لینے والی ایک سنسنی خیز داستان عشق

”میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔“

”اچھا چلیں چھوڑیں۔ کوئی اور بات کریں۔“ وہ بچوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

ایک دم شہزاد کو اندازہ ہوا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ شاید اپنی خالہ نجمہ کا ذکر کرنے والی تھی۔ شہزاد کو یہ سب کچھ ناگوار محسوس ہوا۔ بہرحال اسی دوران میں وہ کلیسا کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ یہی وقت تھا جب کلیسا کی گھنٹیاں زور شور سے بجنے لگیں۔ اندر سیاحوں کا ہجوم تھا۔ کھوے سے کھوا چھل

رہا تھا۔ نیم تاریک ماحول میں لوگوں کی سرگوشیاں، شمع کے جھلملاتے شعلے، خوبصورت کام والی طویل کھڑکیاں اور مرصع دیواریں، یہ سب کچھ قابل دید تھا۔ کیمروں کی فلیش گنز چمک رہی تھیں۔ وڈیو کیمرے بھی حرکت میں تھے۔ بلند و بالا چھت سے نیچے ایک آرچ میں سے گزرتے ہوئے عینی نے کہا۔ ''آپ کو ہالی وڈ کی مشہور فلم، ہنچ بیک آف دی نوٹرے ڈیم تو ضرور یاد آ گئی ہوگی؟''

''میں نے سنا تو ہے لیکن فلم دیکھی نہیں۔'' شہزاد نے سادگی سے کہا۔

''عمیر! تم نے بھی نہیں دیکھی؟'' عینی نے عمیر سے پوچھا۔

اس نے بھی نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ''آپ اور آپ کے ابو، دونوں بڑے نکلے ہیں یہ بھی کوئی نہ دیکھنے والی فلم تھی۔ او مائی گاڈ، ایسا کام کیا ہے انتھونی کوئین نے کہ بس حد کر دی ہے اور ساتھ میں ہے جینا لولو بریجڈا۔ اتنی پیاری لگتی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیں اور پھر ان دونوں کا دھیما دھیما پیار۔ بائی گاڈ مزہ آ جاتا ہے۔ یہ دیکھیں...... یہ جو رنگین پھول بوٹوں والی دو کھڑکیاں ہیں ناں، ان کے بالکل سامنے فائٹ ہوئی تھی انتھونی کوئین اور گارڈز کے درمیان۔ بڑی دھواں دھار فائٹ۔ ڈشوں ڈشوں دھڑام اور یہ اوپر جو گیلریاں نظر آ رہی ہیں ناں آپ کو، یہیں پر ''ہنچ بیک'' رہتا تھا۔ اسے یہاں قید کر دیا گیا تھا۔ بے چارہ کھڑکیوں اور روشن دانوں میں سے پیرس کی گہما گہمی دیکھتا تھا اور آزادی کے لیے تڑپتا تھا...... اور ہاں مجھے یاد آیا فلم کا اصل نام نوٹرے ڈیم ڈی پیرس تھا۔'' وہ فلم کی پوری اسٹوری سنانے پر تلی ہوئی تھی۔ شہزاد نے کہا۔

''اچھا آہستہ بولو، لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں۔''

''وہ تو میں نہ بھی بولوں گی تو دیکھتے رہیں گے۔'' وہ بے باکی سے بولی اور خود ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔

''تم کافی بگڑی ہوئی بچی ہو۔'' شہزاد نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''آپ کی دونوں باتیں غلط ہیں مائی لارڈ۔ میں بگڑی ہوئی نہیں ہوں اور بچی بھی نہیں ہوں۔ آئی ایم اے ینگ گرل۔'' اس نے تن کر دکھایا اور ایڑیاں بھی اونچی کر لیں۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے، تماشا نہ بناؤ۔'' شہزاد نے گھبرا کر کہا۔

''چلیں آپ کے بارے میں میرا ایک اندازہ تو درست ثابت ہوا۔'' وہ بولی۔

''کیسا اندازہ؟''

''میں جب بھی آپ کے بارے میں سوچتی تھی مجھے لگتا تھا کہ آپ کافی محتاط...... بلکہ...... بلکہ ڈرپوک واقع ہوئے ہوں گے۔''

''پتا نہیں، کیا بولتی چلی جا رہی ہو۔'' شہزاد نے زچ ہو کر کہا اور شیشے کے شوکیس میں نوٹرے ڈیم کلیسا کا ماڈل دیکھنے لگا۔

''عمیر کہاں ہے؟'' اچانک عینی نے چونک کر پوچھا۔

انہوں نے ارد گرد دیکھا وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ ''عمیر'' شہزاد نے دو تین بار پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ اسے ڈھونڈنے لگے۔ لاتعداد ستونوں، محرابوں اور سیاحوں کے اندر، آخر وہ دکھائی دے گیا۔ وہ ایک کمپیوٹرائزڈ مشین کے سامنے کھڑا تھا۔ عینی نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور سرزنش کی۔

''کیا کر رہے تھے یہاں؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''آٹومیٹک موم بتیاں نکال رہا تھا۔''

''اوئے یہ آٹومیٹک موم بتیاں کیا ہوتی ہیں؟'' عینی نے پوچھا۔

''یہ دیکھیں، اس مشین میں پانچ یورو ڈالیں تو موم بتیوں کا بنڈل خود بخود باہر نکل آتا ہے۔''

''تو الو بائے! یہ کہو ناں کہ آٹومیٹک مشین سے موم بتیاں نکال رہا تھا۔'' عینی نے کہا۔

پھر شہزاد کو دکھانے کے لیے اس نے اپنی جینز کی پاکٹ میں سے پانچ یورو نکالے اور موم بتیوں کا بنڈل نکال کر دکھایا۔

لوگ بنڈل نکال نکال کر مختلف جگہوں پر شمعیں روشن کر رہے تھے۔ اگر گرجے کی لائٹس بجھا دی جاتیں تو ان شمعوں کی روشنی سے بھی گزارا ہو سکتا تھا۔

قدیم تصویروں، محرابوں اور راہداریوں میں قریباً ایک گھنٹا گھومنے کے بعد وہ باہر نکلے اور گرجے کو باہر سے دیکھنے کے لیے اس کے پہلو میں ایک چوبی بنچ پر جا بیٹھے۔ یہاں کبوتروں کی بھرمار تھی۔ عمیر اور احسن بسکٹ توڑ توڑ کر کبوتروں کو کھلانے لگے۔ کبوتروں کا جمگھٹا ہو گیا۔ شہزاد ان مناظر کی تصاویر اتارنے لگا۔ عینی اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''آپ تصویریں بہت اچھی بناتے ہیں۔ آخر پروفیشن ہے ناں آپ کا۔ آپ کے بنائے ہوئے کئی کمرشل بھی میں نے پاکستان کے ٹی وی چینلز پر دیکھے ہیں، دو تین تو کمال کے ہیں۔ خاص طور سے وہ بیوٹی سوپ والا اور پھر اس لڑکی والا جو بسکٹ والے کے پیچھے بھاگتی ہے۔ آپ کے بنائے ہوئے

اشتہارات میں اسٹل فوٹوگرافی کمال کی ہوتی ہے، لگتا ہے کہ یہ شوق آپ کو بہت پہلے سے ہے۔''

''بہت پہلے سے کیا مطلب؟'' شہزاد نے عمیر کو کبوتروں کے درمیان فوکس کرتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب کہ نوجوانی سے۔ آپ کا بنایا ہوا ایک بڑا شاندار اسٹل فوٹوگراف میرے پاس موجود ہے، کسی دن دکھاؤں گی آپ کو۔''

''کس کا ہے؟''

''انہی کا۔'' وہ زیر لب مسکراتی ہوئی بولی۔ شہزاد نے کیمرے سے نظر ہٹائی اور چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب؟''

اس کی بولتی آنکھوں میں شوخی ابھری۔ پیرس کی چمک دار خوشگوار دھوپ میں یہ شوخی آبگینوں کی طرح چمکی۔ وہ ہولے سے بولی۔ ''خالہ نجمہ کا۔''

شہزاد نے گہری سانس لے کر کیمرا ایک طرف رکھ دیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کیا جانتی ہو خالہ نجمہ کے بارے میں؟''

وہ سب کچھ جو باقی سارے جانتے ہیں اور شاید اس کے علاوہ بھی کئی باتیں۔ دراصل خاندان میں اس بارے میں اتنا کچھ کہا اور سنا جاتا رہا ہے کہ اس حوالے سے پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔''

''دیکھو، بڑوں سے اس طرح کی باتیں نہیں کرتے۔'' شہزاد نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔

''اس طرح کی باتوں سے آپ کا کیا مطلب؟'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''کیا یہ کوئی بری باتیں ہیں، یہ تو ایک سیدھی سادی محبت کی کہانی ہے۔ آپ نے اور نجمہ خالہ نے ایک دوسرے سے محبت کی۔ پورے خلوص کے ساتھ برسوں تک ایک دوسرے کو چاہا اور حاصل کرنا چاہا۔ آپ کے ریلیشن میں کسی طرح کا عیب نہیں تھا لیکن حالات آپ کے آڑے آ گئے، نانی کلثوم، خالہ نجمہ کا رشتہ ہر صورت اپنے لے پالک بیٹے سے کرنا چاہتی تھیں اور اس کے لیے انہوں نے ہر الٹی سیدھی چال چلی۔ یہاں تک کہ خالہ نجمہ اور آپ کی امی کو بہنیں ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد نانا جی کا رویہ بھی ایک دم سخت ہو گیا۔ آپ کو اور نجمہ خالہ کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے دور کر دیا گیا۔ آپ دونوں اپنی طرف پل پل بڑھتی ہوئی جدائی کو دیکھتے رہے لیکن کچھ کر نہ سکے۔ نجمہ خالہ کی شادی ہو گئی۔ اس قربانی کے بعد آپ نے ایک اور بے مثال قربانی دی۔ آپ نے اس لڑکی سے شادی کی جو

ایک بڑی کمپنی میں افسران کے اجلاس میں کمپنی کے مالک نے ایک افسر کو ڈانٹتے ہوئے اس کی کارکردگی کی خامیاں گنوانی شروع کر دیں۔ جواب میں افسر نے کمپنی کے مالک کے اقدامات پر تنقید شروع کر دی۔

''اس پر مالک خفا ہو کر غصے سے چلائے ''اس کمپنی کا مالک میں ہوں یا تم......''

''آپ ہیں۔'' افسر نے تسلیم کیا۔

''تو پھر تم کیوں گدھوں کی طرح بولے چلے جا رہے ہو؟'' مالک اور بھی زور سے چلائے۔

خاندان میں سب سے بے کس اور محروم سمجھی جاتی تھی۔ آپ نے آنٹی فاخرہ کو شریک حیات بنایا اور انہیں زندگی میں کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔''

شہزاد پھر سرزنش کے انداز میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ اتنی روانی اور اعتماد سے بول رہی تھی کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

''تم تو واقعی کتاب لکھ سکتی ہو۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت لکھ بھی دوں مائی لارڈ......

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں پوئٹری لکھتی ہوں اور پوئٹری ہی پڑھتی ہوں۔ نثر سے مجھے کچھ زیادہ لگاؤ نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں پوئٹری میں ہی لکھ ماروں، دیکھیے مائی لارڈ! بات کہاں سے کہاں نکل گئی اور میں نے عدالت کا وقت ضائع کرنا شروع کر دیا۔ دراصل میں بات کر رہی تھی آپ کی شاندار فوٹوگرافی کی۔ نجمہ خالہ کی وہ تصویر شاید کسی تہوار وغیرہ پر اتاری گئی ہے۔ وہ نانا کے گھر کی چھت پر کھڑی ہیں۔ انہوں نے بند گلے کا سویٹر پہن رکھا ہے اور ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا ہے۔ دھوپ ان کی ایک سائڈ سے آ رہی ہے۔ دونوں بازو سینے پر باندھے وہ کچھ سکڑی سمٹی سی ہیں۔ بڑی شاندار تصویر ہے۔ امی نے بتایا تھا کہ یہ آپ ہی نے اتاری تھی اور شاید آپ ہی کے ہاتھ سے تصویر کی پشت پر لکھا ہوا ہے۔ ''اف یہ دسمبر۔''

شہزاد کو تصویر کے بارے میں یاد آ گیا لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

''آپ کو پتا ہے کہ یہ تصویر آپ نے کب اور کہاں اتاری تھی؟''

''یہ پوچھ کر کیا کرنا ہے تم نے؟''

''جن چیزوں سے بندے کو دلچسپی ہوتی ہے وہ انہیں کھوجنا چاہتا ہے مائی لارڈ۔ ان کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ انہیں ایک کھلی کتاب کی طرح پڑھنے کی خواہش رکھتا ہے۔''

''لگتا ہے کہ پوئٹری نے تمہارا کچھ زیادہ ہی بیڑا غرق کیا ہوا ہے۔ پڑھائی میں تمہارے گریڈز کیا آتے ہیں؟''

''میں وہاں بھی فرسٹ کلاس فرسٹ ہوں۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو یا پھر تمہارے اسکول کا معیار ایویں ہے، چلو اٹھو اب وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' شہزاد کھڑا ہو گیا۔

''آپ جینٹس مائی لارڈ۔ تصویر والی بات آپ نے پھر گول کر دی ہے۔''

شہزاد ان سنی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

عینی اور زارا لنچ ساتھ ہی لے کر آئی ہوئی تھیں۔ بیف کے شاندار کباب تھے۔ ساتھ ہی ڈھیر ساری سلاد اور مایونیز، ایک بڑی ڈبل روٹی تھی جس کے ساتھ مزیدار سینڈوچ بنائے جا سکتے تھے۔ عینی، شہزاد اور بچوں کے آنے تک زارا اور فاخرہ باتوں میں مصروف رہی تھیں۔ انہوں نے ایک جگہ دری بچھائی اور سامان خورونوش رکھ لیا۔ بچے دری پر قلابازیاں کھانے لگے، شہزاد نے ایک بیف کباب چکھا۔ بہت مزیدار تھا۔ ''بڑا اسپیشل ٹیسٹ ہے۔'' شہزاد نے بے ساختہ کہا۔

''آپ کی اس فین نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں جی۔'' زارا بولی۔ ''ویسے بڑے خوش قسمت ہیں آپ کہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیز کھائیں گے۔ ورنہ یہ مہارانی تو کچن میں گھس کر نہیں دیتی۔''

''دیکھو بگ سسٹر اب اس بات پر لڑائی ہو جائے گی۔ آپ کا مطلب ہے کہ میں کام نہیں کرتی۔''

''نہیں کام تو کرتی ہے جی۔ ابھی پچھلے سے پچھلے مہینے اس نے ایک دن ناشتے کے لیے انڈے فرائی کیے تھے۔'' زارا نے بکا منہ بنا کر کہا۔

''بگ سسٹر!'' وہ مکا تان کر اس کی طرف بڑھی۔ شہزاد نے راستے میں ہی اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

''نہیں بھئی نہیں، لڑائی نہیں۔'' فاخرہ بولی۔ ''عینی نے کباب واقعی اچھے بنائے ہیں اور مجھے پتا چلا ہے کہ یہ مایونیز بھی گھر کی بنی ہوئی ہے اور عینی نے ہی بنائی ہے۔''

اب زارا بھی سنجیدہ ہو گئی۔ اثبات میں سر ہلا کر کہنے لگی۔ ''مذاق کی بات نہیں ہے انکل، حقیقت میں یہ عینی ہی ہے جس کی وجہ سے ہم سب کی ملاقات ہو سکی ہے۔ ماما نے بتایا تھا ناں آپ کو کہ آپ کے یہاں آنے کی ساری مسٹری عینی نے ہی solve کی ہے۔ وہ بڑے دنوں سے اس چکر میں پڑی ہوئی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو آپ نے کہاں ہاتھ آنا تھا ہمارے۔''

''یہ بھی پتا نہیں کہ شہر میں گھومتے ہوئے کہیں ہمارے پاس سے گزر جاتے اور دیکھ کر بھی نہ دیکھتے۔'' عینی شکوہ کناں انداز میں بولی۔

''خیر اب ایسی بھی بات نہیں۔'' شہزاد نے کہا۔

''ایسی بات کیوں نہیں۔ جس چیز کے بارے میں علم نہ ہو اسے بندہ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس نوٹرے ڈیم کے گرجا کو ہی لے لیں جس کو اس کی تاریخ جغرافیے کا پتا نہیں ہوگا وہ پیرس دیکھتا دیکھتا اس بے چارے کے پاس سے گزر جائے گا...... شوں کر کے۔''

''مثالیں واقعی خوب دیتی ہے۔'' شہزاد بولا۔

''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔'' زارا نے کہا۔

فاخرہ اور عینی باتیں کرنے لگیں۔ فاخرہ ٹانگوں پر شال ڈالے نیم دراز تھی جبکہ عینی بے تکلفی سے اس کے کندھے سے لگی بیٹھی تھی۔ عینی کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ فنون لطیفہ خصوصاً پوئٹری اور فوٹوگرافی سے دلچسپی رکھتی ہے۔ حال ہی میں اس نے قریباً ڈھائی ہزار یورو میں Nikon کا کمرشل کیمرا اور لینسز وغیرہ خریدے تھے، پاکستانی کرنسی میں یہ قریباً پونے تین لاکھ روپیہ بنتا تھا۔ فوٹوگرافی میں عینی کی دلچسپی تب مزید بڑھ گئی تھی جب ڈھائی تین سال پہلے اس نے فوٹوگرافی پر ہی شہزاد کی لکھی ہوئی ایک کتاب پڑھی تھی۔ اب اس کی اسٹڈی کا رخ فائن آرٹ کی طرف تھا اور وہ شہزاد کی فیلڈ یعنی ''پبلسٹی ڈیزائننگ'' کی طرف جانا چاہتی تھی۔

باتیں کرتے کرتے عینی بے تکلفی سے پھیل کر دری پر لیٹ گئی۔ احسن نے اس کے سن گلاسز اتار لیے اور اپنی آنکھوں پر ٹکانے کی کوشش کرنے لگا۔ کل رات کی طرح شہزاد کی نگاہ ایک بار پھر اس کی آنکھوں پر پڑی اور پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی...... ان آنکھوں میں کوئی خاص بات تھی۔ شاید یہ عینی کی آنکھیں ہی نہیں تھیں، یہ کسی اور کی تھیں۔

احسن، عینی کے گلاسز شہزاد کی آنکھوں پر جمانے کی کوشش کرنے لگا۔ شہزاد نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''احسن،

عینی کو واپس دو عینک۔''

''آپ کا رعب سے بولنے کا انداز وہی ہے جو انگلش سیریل میں برٹش اداکار مائی لارڈ کا تھا۔'' عینی ایک بار پھر کھلکھلائی۔ ''اور شاید آپ کو غصہ بھی اسی کریکٹر کے انداز میں فوراً آ جاتا ہے، ذرا سی بات پر ڈانٹ دیا احسن کو۔''

اسی دوران میں احسن لپک کر گیا اور دری پر لیٹی عینی کو عینک واپس پہنانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں اس کا ہاتھ زور سے عینی کے چہرے پر لگا۔ عینک کی ایک ڈنڈی عینی کی آنکھ میں چبھ گئی۔ ''اوہ گاڈ'' وہ کراہی اور اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے آنکھ دبالی۔

اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ شہزاد جلدی سے عینی کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھوں کو کھینچ کر آنکھ سے علیحدہ کیا۔ آنکھ دیکھی۔ چند سیکنڈ میں ہی وہ سرخ ہو گئی تھی۔ عینک کی ڈنڈی سیدھی پتلی پر لگی تھی۔ ان لمحوں میں پتا نہیں کیوں شہزاد کو لگا کہ یہ عینی کی نہیں نجمہ کی آنکھ ہے۔ یہ چوٹ شاید نجمہ کو لگی ہے۔ اس کی سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا اس نے جیب سے تہ شدہ رومال نکالا اور دیسی طریقے کے مطابق اسے عینی کی آنکھ پر رکھ کر زور زور سے پھونکیں مارنے لگا۔

''ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں؟'' زارا نے گھبرا کر پوچھا۔

''نہیں ٹھیک ہو جائے گی۔'' شہزاد نے کہا اور اپنی طبی امداد جاری رکھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے رومال ہٹایا۔ عینی نے آنکھیں جھپک جھپک کر ارد گرد دیکھا۔ آنکھ کو ہولے سے ملا، پھر دوبارہ دیکھا۔

''ٹھیک ہو؟'' شہزاد نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ناک میں پانی آ جانے کی وجہ سے اس نے سوں سوں کی آواز نکالی۔ شہزاد نے رومال دوبارہ اس کی آنکھ پر رکھا اور چند بار مزید اپنے سانس کی گرمی اس کی آنکھ تک پہنچائی۔ اس دفعہ رومال ہٹایا تو صورت حال قدرے بہتر تھی۔ عینی نے براہ راست شہزاد کی آنکھوں میں دیکھا۔ دیکھنے کا یہ خاص انداز بھی عینی نے شاید...... اپنی خالہ نجمہ سے مستعار لیا تھا۔ شہزاد جلدی سے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

دس سالہ احسن گھبرایا ہوا سا کھڑا تھا۔ شہزاد نے اس کی طرف دیکھا تو اسے غصہ آ گیا۔ وہ اسے چپت رسید کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھا لیکن عینی نے لپک کر احسن کو اپنی

''یہ ہمارے سیلز منیجر صاحب ہیں۔ یہ کمپنی کی مصنوعات فروخت کرنے کے لیے سڑک کے راستے اپنے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔''

طرف کھینچ لیا اور اپنے ساتھ لپٹا کر رخ پھیر لیا۔ شہزاد احسن کے ارد گرد گھوم کر رہ گیا۔

''نہیں جی نہیں۔ یہ تو ہمارا چھوٹا سا بچونگڑا ہے۔'' وہ احسن کا دفاع کرتے ہوئے بولی۔

''میڈیکل اسٹور سے دوا وغیرہ کا پتا کر لو۔'' فاخرہ نے کہا۔

''نہیں آنٹی، یہاں عام طور پر اسٹور سے دوا نہیں ملتی۔ ویسے بھی اب میں ٹھیک ہوں۔'' عینی نے کہا۔

''دیکھ لو اگر تم بیمار ہو گئیں تو انکل اینڈ فیملی کو سیر کون کرائے گا۔'' زارا نے مسکراتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا۔

''کیا مطلب؟ آپ لوگ ہمیں اس آفت کے حوالے کر دیں گے؟'' شہزاد کا اشارہ عینی کی طرف تھا۔

''جی تو چاہتا تھا کہ میں اور ماما بھی آپ کے ساتھ ہوں لیکن قرعہ فال اسی کے نام نکلا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ فائنل ایگزیمز کے بعد دس پندرہ دن کے لیے آف ہے۔''

''بگ سسٹر! میں آف نہ بھی ہوتی تو انکل اور آنٹی کے لیے وقت ضرور نکالتی۔ آپ خوامخواہ مجھے ڈی گریڈ نہ کریں۔'' زارا اور عینی میں نوک جھوک پھر شروع ہو گئی۔

پیرس کا وہ دن واقعی بہت چمکیلا اور خوبصورت تھا۔ سب نے لطف اٹھایا اور شام سے تھوڑی دیر پہلے ہوٹل واپس پہنچ گئے۔

رات کو فرزانہ کا فون آ گیا۔ اس نے شہزاد سے کہا۔ ''جمیل آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آج کل وہ آب و ہوا

کی تبدیلی کے لیے زیورخ گئے ہوئے ہیں۔ اپنے ایک ترک دوست کے پاس۔ تھوڑی دیر میں آپ کو ان کا فون آئے گا۔‘‘
جمیل فرزانہ کے شوہر کا نام تھا۔

چار پانچ منٹ بعد جمیل صاحب کی کال آہی گئی۔ جمیل احمد صاحب کا تعلق سیالکوٹ کی ایک صنعت کار فیملی سے تھا۔ ذاتی طور پر اچھے اور نفیس آدمی تھے۔ وہ عمر میں شہزاد سے چھ سات سال بڑے تھے۔ اپنے ڈیل ڈول کے سبب بھی بڑے لگتے تھے۔ شہزاد انہیں بھائی جان کہتا تھا۔ جمیل صاحب خوش اخلاقی سے ملے اور شہزاد سے اصرار کیا کہ وہ ہوٹل چھوڑ کر ان کے گھر شفٹ ہو جائیں۔ شہزاد نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بہرحال یہ بات تو شہزاد کے ساتھ ساتھ جمیل صاحب بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ عملی طور پر ایسا ممکن نہیں۔ دونوں فیملیز میں عرصۂ دراز سے جو فاصلے موجود تھے وہ اس طرح کی قربت کی اجازت ہرگز نہیں دیتے تھے۔ اگر پاکستان میں فرزانہ کے گھر والوں کو بھنک بھی پڑ جاتی کہ شہزاد، فرزانہ کے گھر ٹھہرا ہوا ہے تو یقیناً وہ بہت سیخ پا ہوتے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی عینی گاڑی پر آدھمکی۔ فاخرہ کی طبیعت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ موسم کی تبدیلی کے سبب ٹانگوں میں مسلسل درد ہو رہا تھا۔ آج وہ کہیں جانا نہیں چاہتی تھی مگر عینی کے سامنے اس کی کوئی پیش نہیں چلی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح فاخرہ کو آمادہ کر ہی لیا۔ اس کے لیے اس نے بڑی ہوشیاری سے عمیر اور بچونگڑے یعنی احسن کی مدد بھی حاصل کی۔ آج پروگرام تھا پیرس کا مشہور و معروف عجائب گھر لوورد یکھنے کا۔

کل کی طرح آج بھی عینی لنچ کا انتظام گھر سے کر کے لائی تھی۔ سرخ رنگ کی چمکدار ’’پی جو‘‘ گاڑی میں دو ٹفن، منرل واٹر اور کوک کی دو بڑی بوتلیں رکھی تھیں۔ بچے آگے عینی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ شہزاد اور فاخرہ عقبی سیٹ پر تھے۔ کل والے دونوں بوڑھے آج بھی دریائے سین کے کنارے خاموش بیٹھے تھے۔ جلد ہی ان کی گاڑی پیرس کی صاف ستھری سڑکوں پر رواں تھی۔ پیرس کی کئی سڑکیں ہموار تارکول کی بجائے پتھروں کی تھیں۔ گاڑی ایسی سڑکوں پر ذرا تھرتھراتی ہوئی چلتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس معمولی تھرتھراہٹ سے بچنے کے لیے فرانسیسی اپنی قدیم روایات کو ملیامیٹ کرنا نہیں چاہتے۔ ایسی ہی ایک شاندار سڑک سے گزرتے ہوئے عینی نے بتایا۔ ’’یہ شانزالیزے ہے۔ اسے پیرس کا ہارٹ کہنا چاہیے۔ اس کے کناروں پر دنیا کے بہترین ریسٹورنٹ اور شاپنگ سینٹر موجود ہیں۔ اسے ہم بعد میں اطمینان سے دیکھیں گے۔‘‘

’’اطمینان سے کیوں دیکھیں گے؟‘‘ احسن نے معصومیت سے پوچھا۔

’’بھئی یہ پیرس کا ہارٹ جو ہوا اور ہارٹ کو بڑے اطمینان سے دیکھنا چاہیے۔ یہ بڑا نازک کام ہوتا ہے۔‘‘ وہ حسب عادت کھلکھلا کر ہنسی۔

آج اس نے کریم کلر کی پینٹ پہن رکھی تھی جس کے پائنچے اڑسے گئے تھے، مردانہ اسٹائل کی...... کالر والی آف وائٹ شرٹ تھی جس پر سرخ دھاریاں تھیں، بال کھلے چھوڑ رکھے تھے جو گاڑی میں داخل ہونے والی ہوا کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ آج اس نے نیکلی کلر فریم والے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ تصدیق شدہ اطلاع کے مطابق وہ بیسویں سال میں داخل ہو رہی تھی، تاہم اپنی عمر سے ایک دو سال چھوٹی لگتی تھی۔ شہزاد نے اسے پروفیشنل نظروں سے دیکھا اور اسے لگا کہ یہ لڑکی ڈیڑھ دو سال کے اندر جب تھوڑی سی اور بھر جائے گی تو یہ آسانی ماڈلنگ میں آسکتی ہے۔

لوور کا عجائب گھر ایک وسیع و عریض جگہ تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ حد نگاہ تک اس معروف میوزیم کی بیرونی دیوار نظر آتی تھی۔ پاکستان سے روانہ ہوتے وقت شہزاد کا خیال تھا کہ شاید لوور کا میوزیم پیرس سے باہر ہے اور درختوں سے گھری ہوئی کوئی جگہ ہے، لیکن یہ میوزیم ایک بارونق علاقے میں تھا۔ داخلے کا ٹکٹ نو یورو کا تھا یعنی پاکستانی کرنسی کے مطابق تقریباً 1035 روپے فی کس۔ شہزاد کی کوشش کے باوجود عینی نے اسے ٹکٹ نہیں خریدنے دیا۔ عینی ٹکٹ لے کر آئی اور پھر انہیں لے کر اس عظیم الشان میوزیم میں داخل ہوگئی۔

’’یہاں موم کے بنے ہوئے مجسمے ہیں؟‘‘ احسن نے معصوم لہجے میں پوچھا۔

عینی نے ’’پیار سے دانت پیس کر‘‘ اس کے سرخ گال پر زور سے چٹکی لی اور بولی۔ ’’موم کے مجسمے یہاں نہیں لندن کے میوزیم میں ہیں بچونگڑے۔ یہاں اور بہت کچھ ہے اور سب سے بڑھ کر یہاں مونالیزا کی اصل پینٹنگ ہے۔ لوگ پوری دنیا سے اسے دیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔‘‘

’’مونالیزا!! اس میں کوئی خاص بات ہے؟‘‘ عمیر نے پوچھا۔

’’مونالیزا بالکل میری طرح مسکراتی تھی۔ مجھ میں اور مونالیزا میں بس یہی ایک چیز ہے جو دیکھنے والوں کو پسند آتی ہے۔ یعنی ہماری مسکراہٹ۔‘‘

’’لیکن تمہاری مسکراہٹ تو کچھ خاص نہیں ہے۔‘‘ شہزاد نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

’’اسی لیے تو کہتی ہوں کہ میری اور مونالیزا کی مسکراہٹ ایک جیسی ہے۔ اب آپ دوسرے لوگوں کا کیا کر سکتے ہیں مائی لارڈ۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں مسکراہٹ پسند ہے تو بس پسند ہے۔ جن کو پسند نہیں وہ بھی خوردبین لگا لگا کر آنٹی مونالیزا کو دیکھتے ہیں اور پھر ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مغز ماری کے بعد انہیں بھی چار و ناچار ماننا پڑتا ہے کہ ہاں کچھ نہ کچھ ہے اس مسکراہٹ میں۔‘‘

شہزاد نے اندازہ لگایا کہ اس وسیع و عریض بے مثال میوزیم کو دیکھنے کے لیے ایک دو روز تو قطعی ناکافی ہیں۔ اگر ایک دو ہفتے دیے جاتے تو شاید میوزیم کا تھوڑا بہت حق ادا ہو جاتا۔ میوزیم کی طویل طویل گیلریوں میں آرٹ کے نادر شاہکار دیکھتے دیکھتے وہ ذرا تھک گئے تو ایک نہایت خوبصورت گیلری میں رکھے ہوئے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ فاخرہ کچھ زیادہ ہی تھک گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ’’میں تو بس اس صوفے پر بیٹھی بیٹھی آس پاس کی تصویریں ہی دیکھوں گی۔ آپ لوگ گھوم پھر لیں۔‘‘

احسن بھی ماں کے پاس ہی رہ گیا۔ عمیر کو مجسموں میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ شہزاد، عینی اور عمیر گیلریوں میں گھومنے لگے۔ اکثر تصاویر پر نمبروں کا اندراج تھا۔ تصویر کے بارے میں تفصیل معلوم کرنا ہوتی تو انتظامیہ کے فراہم کردہ ریسیور پر مطلوبہ نمبر دبایا جاتا۔ انگلش میں اس تصویر یا مجسمے کی ساری ہسٹری سنائی دینے لگ جاتی تھی۔ یہ تفصیل مختلف زبانوں میں منتخب کی جاسکتی تھی۔

جوں جوں وہ مونالیزا کی طرف بڑھ رہے تھے ان کے اشتیاق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہاں مقیم ہونے کے باوجود عینی بھی یہ پینٹنگ پہلی بار ہی دیکھ رہی تھی۔ راستے میں ایک رومانٹک پینٹنگ نے شہزاد کے قدم روکے۔ یہ وکٹوریہ دور کی ایک بالکونی تھی جس میں ایک لڑکی کھڑی اشک بھری آنکھوں سے اپنے محبوب کو الوداع کہہ رہی تھی۔ بڑی کلاس کی منظر نگاری تھی۔ تصویر کوئی تین سو سال پہلے بنائی گئی تھی۔ عینی بھی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ حسب عادت بالکل اچانک بولی۔ ’’جناب عالی آپ نے آخری ملاقات کب کی تھی نجمہ خالہ سے؟‘‘

شہزاد گڑبڑا گیا۔ ’’تم ایک دم کوئی بے موقع سوال کیوں کر دیتی ہو؟‘‘ وہ ذرا تلخی سے بولا۔

’’ہائیں ہائیں، یہ بے موقع تو نہیں ہے۔ یہ سامنے والی پینٹنگ دو محبت کرنے والوں کی آخری ملاقات کا منظر پیش کر رہی ہے۔ آخر نجمہ خالہ سے آپ کی بھی ایک آخری ملاقات تو ہوئی ہوگی۔‘‘

’’ہاں، ہوئی تھی تو پھر؟‘‘

’’اس کی کچھ تفصیل بتائیے ناں۔‘‘ وہ لاڈلے انداز میں بولی۔

’’لیکن کیوں؟‘‘

’’سچی بتاؤں...... مجھے آپ کی اس ساری کہانی میں بڑی دلچسپی ہے۔‘‘

’’کیوں دلچسپی ہے؟‘‘

’’اس کا تو مجھے خود بھی پتا نہیں۔‘‘ وہ عجیب لہجے میں بولتے ہوئے شہزاد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے دھوپ کا چشمہ اتار رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر شہزاد کو پھر نجمہ کی آنکھیں نظر آئیں۔ وہ بے طرح گڑبڑا گیا۔ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ’’دیکھو عینی! میں تمہارا بڑا ہوں۔ گفتگو کرتے ہوئے تمہیں ذرا محتاط رہنا چاہیے۔‘‘

وہ ایک دم دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ انداز احتجاج کرنے والا ہی تھا۔ ’’ایک تو مجھے یہ پتا نہیں چلتا کہ ہم ہر معاملے میں چھوٹے اور بڑے کا ذکر کیوں کرنے لگتے ہیں۔ انسان بس انسان ہوتا ہے۔ وہ عمر سے چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ اسے چھوٹا یا بڑا کرنے کے کچھ اور Elements ہوتے ہیں۔‘‘

’’چلو جو کچھ بھی ہے لیکن رشتوں کے لحاظ سے ایک دوسرے کا کچھ احترام وغیرہ تو ہونا چاہیے۔‘‘

’’اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں آپ کا احترام نہیں کرتی تو یہ بالکل غلط ہے، میں آپ کا اتنا احترام کرتی ہوں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔‘‘ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا لہجہ پھر عجیب سا ہو گیا۔

’’میرا مطلب یہ ہے کہ ہم ہر شخص کے ساتھ ہر موضوع پر کھلم کھلا بات نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے کچھ حدیں ہوتی ہیں......‘‘

’’یہ حدیں وغیرہ سب ہماری ہی بنائی ہوئی ہیں مائی لارڈ اور ان میں سے زیادہ تر حدیں بالکل بے کار ہیں۔ ایک دم کچرا۔ میں تو یہ سمجھتی ہوں جی کہ جو بھی چیز بندے کی نیچر کے خلاف ہے وہ بالکل کچرا ہے۔ اسے کچرے میں ہی جانا ہے۔ آج نہیں تو کل چلی جائے گی کل نہیں تو پانچ سو سال بعد چلی جائے گی...... یا پھر پانچ ہزار سال بعد چلی جائے گی۔‘‘

شہزاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے یقین

نہیں آیا کہ یہ کم عمر اوٹ پٹانگ سی لڑکی ایسی بھاری بھر کم باتیں بھی کر سکتی ہے۔ عمیر آگے جا کر ایک بڑے مجسمے کے گرد گھومنے لگا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا یہ خیال ہے مائی لارڈ! کہ ہم ہر موضوع پر بہ آسانی بات نہیں کر سکتے، میں تو ماما پاپا سے بھی ہر ''سبجیکٹ'' پر کھل کر بات کرتی ہوں۔ کلچر، آرٹ، عشق، محبت کی فیلنگز سب کے بارے میں، آپ بھی کر سکتے ہیں، مجھ سے بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں کہ میرا کوئی بوائے فرینڈ ہے یا نہیں۔ اسی طرح اپنے بارے میں بھی بتا سکتے ہیں۔'' اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

شہزاد کو اس لڑکی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ شاید مونا لیزا کی مسکراہٹ کی طرح یہ بھی ناقابل فہم تھی۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اچھا بتاؤ، کوئی بوائے فرینڈ ہے تمہارا یا نہیں؟''

''ہے'' اس نے بلا تکلف کہا۔ ''ایک پاکستانی ہے۔ آپ کو ملواؤں گی اس سے۔ بلکہ اس کی تصویر بھی دکھاؤں گی، اس کی تصویر ہے میرے پاس۔'' شہزاد اثبات میں سر ہلا کر چپ رہا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہی پھر حسب عادت اچانک بولی۔ ''آپ کو پتا ہے کہ ارینج میرج اور لو میرج میں کیا فرق ہے۔''

''مجھے نہیں پتا۔'' شہزاد کے لہجے میں بے تعلقی تھی۔

''لو میرج'' آپ اپنی گرل فرینڈ سے کرتے ہیں اور ارینج میرج کسی دوسرے کی گرل فرینڈ سے۔'' اس نے کہا اور ہنس ہنس کر سرخ ہونے لگی۔ قریباً چار گھنٹے تک مسلسل گھومنے کے بعد وہ اس عظیم الشان میوزیم کا بس ایک مختصر حصہ ہی دیکھ سکے تھے۔ ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی تھا یہاں تک کہ مونا لیزا کی اصل پینٹنگ بھی۔ لہٰذا اگلے روز دوبارہ آنے کا پروگرام بنا۔

☆☆☆

اس روز فاخرہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔ ہاں عمیر اور احسن اپنے کیمروں سمیت ہمراہ تھے۔ کل کی طرح آج بھی عینی نے اسٹائلش ڈرائیونگ کی اور آدھ پون گھنٹے میں انہیں میوزیم پہنچا دیا۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ باہر نکلے۔ ایک دم عینی ٹھٹک گئی۔ ''اوہ آپ کو اپنے بوائے فرینڈ کی تصویر تو دکھائی ہی نہیں۔'' اس نے کہا اور پلٹ کر پھر کار کی طرف گئی، کار میں سے اس نے قریباً 12 انچ ضرب 9 انچ کا ایک کارڈ پیپر نکالا۔ اس پر ایک بلیک اینڈ وائٹ چہرہ تھا، یہ پین ورک سے بنایا گیا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ چہرے پر نقوش نہیں تھے۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' شہزاد نے کہا۔

''بس یہی ہے جی میرا بوائے فرینڈ۔ دیکھ لیں پاکستانی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''کپڑوں سے زیادہ ناک کان آنکھیں ضروری ہوتی ہیں اور وہ ہیں نہیں۔ لگتا ہے کہ تم نے بوائے فرینڈ کو پکنے نہیں دیا، کچا کچا ہی پیڑ سے اتار لیا ہے۔'' آج شہزاد بھی قدرے خوشگوار موڈ میں تھا۔

''آپ تو خود آرٹسٹ ہیں مائی لارڈ، آپ کو پتا ہونا چاہیے۔ مصور کے ذہن میں جتنی تصویر ہوتی ہے اتنی ہی کینوس پر یا کاغذ پر ٹرانسفر ہوتی ہے، باقی تو سب الٹی سیدھی لکیریں ہوتی ہیں۔''

پین ورک سے بنی ہوئی تصویر شہزاد کو دکھا کر اس نے دوبارہ گاڑی میں رکھ دی۔ وہ ایک بار پھر لوور میوزیم کے خزینوں میں غوطہ زن ہو گئے۔ مصری، یونانی، رومی، پتا نہیں کون کون سی تہذیبیں تھیں جن کے آثار بڑی خوبصورتی سے مختلف گیلریوں میں سجائے گئے تھے۔ بے شمار شاہکار دیکھنے کے قابل تھے لیکن زیادہ تر لوگوں کا رخ اس مقام کی طرف تھا جہاں مونا لیزا موجود تھی...... لوگ ایک دوسرے سے استفسار بھی کر رہے تھے کہ مونا لیزا کس جگہ ہے۔

آخر مختلف بھول بھلیوں سے گزرنے کے بعد وہ بھی مونا لیزا کے روبرو پہنچ گئے۔ یہاں دیکھنے والوں کا جمگھٹا تھا اور ایک پرتقدس خاموشی تھی۔ اس جگہ کو ''اسٹیٹ روم'' کا نام دیا گیا تھا۔ شیشے کے پیچھے مونا لیزا خاص اہتمام سے رکھی گئی تھی۔ یہ تصویر دنیا کی مشہور و معروف اشیا میں سے ایک تھی اور ہر مشہور و معروف شے کی طرح اس کے اندر بھی ایک بارعب شناسائی کی کرنیں سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔ یہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھی۔ ''ہاں میں ہی مونا لیزا ہوں۔ میرے ہی ہونٹوں کو لیونارڈو کے برش نے لازوال و بے مثال مسکراہٹ بخشی ہے۔ مجھ پر ہی کتابیں لکھی گئی ہیں، کہانیاں تخلیق کی گئی ہیں، میں جو بھی ہوں جیسی بھی ہوں لیکن مصوری کی دنیا میں یکتا ہوں۔''

ایک عجیب سے سحر نے شہزاد کو گرفت میں لے لیا لیکن غور کرنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شاید مونا لیزا کا سحر نہیں ہے اس کی شہرت کا سحر ہے۔

مونا لیزا سے رخصت ہو کر وہ آگے بڑھ گئے۔ اچانک ایک دروازے میں سے عینی کو کچھ نظر آیا۔ اس نے ایک دم شہزاد کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتی ہوئی میوزیم کے اندرونی احاطے کی طرف لپکی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں احسن کا ہاتھ تھا۔ عمیر کا ہاتھ تو شہزاد کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شہزاد

کو اسی طرح کھینچتی ہوئی ایک اہرام نما مقام کے قریب لے گئی۔ یہ اہرام شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اردگرد فوارے تھے۔ خوبصورت روشنی تھی اور پھول مہک رہے تھے۔ عینی نے شیشے کے قریباً چھ میٹر بلند اہرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اسے پیرس کا سینٹر کہا جاتا ہے۔ یہاں تصویر اتروا کر لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔“

”تو پھر تو ہمیں بھی خوش ہونا چاہیے۔“ شہزاد نے کہا۔

”چلیں آپ کھڑے ہوجائیں عمیر اور بچوں کے ساتھ ہوجائے ایک تصویر Paris Pyramios کے سامنے۔“

شہزاد نے عینی کو تصویر کھینچنے کے حوالے سے کچھ ہدایات دیں اور پھر دونوں بچوں کے ساتھ شیشے کی تکون کے پاس کھڑا ہوگیا۔ عینی نے دو تین تصویریں اتار دیں۔ اس کے بعد عینی بچوں کے ہمراہ کھڑی ہوئی اور شہزاد نے تصویریں اتاریں۔ وہ پروفیشنل تھا، اس کی اتاری ہوئی تصویریں کمال کی تھیں۔ عینی بولی۔

”ایک تصویر مجھ اکیلی کی اتاریں مائی لارڈ۔“

”وہ کیوں؟“

”بس میرا دل چاہتا ہے کہ ایک بڑا فنکار اپنے ہاتھوں سے مجھے ایکسپوز کرے۔ بعد میں، میں یہ تصویر دیکھا کروں گی اور اپنے دوستوں کو فخر سے بتایا کروں گی کہ یہ تصویر ایک عالمی شہرت یافتہ آرٹسٹ کی اتاری ہوئی ہے۔“

”زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال تصویر میں اتار دیتا ہوں۔“

دھوپ بائیں رخ سے آرہی تھی۔ شہزاد نے عینی کو خاص اینگل سے کھڑا کیا۔ اس کو کالر درست کرنے کو کہا پھر Nikon کے کیمرے کو ایڈجسٹ کرکے اس کی دو تصویریں کھینچ لیں۔ ایک تصویر واقعی بہت زبردست آئی۔ اس کی شارپ نس قابل دید تھی۔ عینی نہال ہوگئی۔

”یو آر گریٹ سر، ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں یونہی آپ کا نام نہیں ہے۔“

وہ چاروں تھک گئے تھے۔ دھوپ میں گھاس پر بیٹھ کر آئس کریم وغیرہ کھانے کا خیال انہیں اچھا لگا لیکن جس گراسی گراؤنڈ کی طرف وہ جانا چاہ رہے تھے وہاں کا ماحول کچھ ابتر نظر آیا، پودوں اور چھوٹے موٹے پیڑوں کی اوٹ میں کئی جوڑے حالت مستی میں بیٹھے ہوئے تھے یا نیم دراز تھے۔ وہ دوسری طرف نکل گئے اور چھوٹے سے باغیچے میں جا بیٹھے۔

باغیچے میں آئس کریم کھاتے ہوئے عینی نے ایک کاغذ شہزاد کی طرف بڑھایا۔ اس پر انگریزی میں کچھ لکھا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میری تازہ نظم اور اس کا موضوع ہے اجنبی پیرس۔“

شہزاد نے نظم پڑھنی شروع کی۔ اس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

پیرس اجنبی نہیں
جانا پہچانا ہے اور دیکھا بھالا ہے
اس کے سارے راستے، سارے درخت اور ساری دھوپ چھاؤں
اس کا سب کچھ مجھے ازبر ہے اور میرے دل کے قریب بھی
لیکن کل ایک ایسا عجیب مہمان میرے ساتھ تھا
جو پہلی بار ملا تھا، لیکن
اس کی وجہ سے سارا پیرس اجنبی لگا
دریائے سین کے دونوں کناروں پر موجود ہر شے
پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت نظر آئی۔

”اجنبی مہمان سے کیا مراد ہے؟“ شہزاد نے نظم پڑھ کر پوچھا۔

”آپ سب اور خاص طور سے آپ۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔

اس کے ساتھ وہ اٹھ کر ایک خوبصورت جرمن لڑکی کی طرف بھاگی، لڑکی کی عمر 25 سال کے قریب ہوگی۔ اس کی شرٹ پر سامنے کی طرف انگلش میں لکھا ہوا تھا۔ ”میں اکیلی ہوں۔“

ایسے فقروں والے پہناوے یہاں اکثر نظر آتے تھے۔ عینی اس قبول صورت لڑکی سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔ بات کرتے ہوئے وہ چند بار ہنس ہنس کر دہری ہوگی۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں شہزاد کی طرف بھی اشارہ کیا۔

جرمن لڑکی بھی ہنس رہی تھی پھر وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر اپنے راستے پر بڑھ گئی۔ عینی بھی واپس آگئی۔ ”کیا گپ شپ ہورہی تھی؟“ شہزاد نے پوچھا۔

”اگر بتایا تو آپ ماریں گے۔“ وہ سرخ چہرے کے ساتھ شوخ لہجے میں بولی۔

”اچھا بتاؤ، کچھ نہیں کہتا۔“

”وعدہ؟“ شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ عینی نے بڑی ادا سے شہزاد کی بند چھتری اس کے پاس سے اٹھا کر دور رکھ دی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ شہزاد چھتری سے ہی اسے مارنا شروع کردے گا۔

”چلو ایکٹنگ نہ کرو، بتاؤ۔“ شہزاد نے ذرا تحکم سے کہا۔

”نہیں آپ ماریں گے۔“ وہ پھر ٹھٹکی۔

”بھئی، تم سے وعدہ کیا ہے ناں۔“

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد کھٹاک سے بولی۔ ”اس جرمن دوشیزہ سے آپ کی شادی کی بات کررہی تھی۔ بس ایک انچ کی کسر رہ گئی ورنہ ہوسکتا تھا کہ معاملہ فکس ہوہی جاتا۔“

”کیا الٹی سیدھی ہانک رہی ہو۔“ شہزاد کے چہرے پر سنجیدگی آگئی۔

”دیکھیں مائی لارڈ...... عدالت کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا۔ میں تو آنٹی فاخرہ کی خواہش پر عمل کررہی ہوں یا کہہ لیں کہ عمل کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔“

”آنٹی فاخرہ نے کیا کہا تھا؟“

”مختصر بتاؤں یا تفصیل سے؟“ اس نے مودب نظر آنے کی اداکاری کی۔

”تمہارا مختصر بھی بڑا تفصیلی ہوگا۔ اس لیے مختصر ہی بتاؤ۔“

عمیر اور احسن کچھ فاصلے پر کشتی میں مصروف تھے۔ وہ آلتی پالتی مار کر بولی۔ ”آج صبح جب آپ واش روم میں تھے، میں آنٹی کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کررہی تھی۔ وہ انکار کرتی جارہی تھیں۔ میں نے کہا، آنٹی فاخرہ ان مردوں کا کوئی بھروسا تھوڑا نہیں ہوتا۔ آپ اگر ان کے ساتھ یہاں آئی ہیں تو پھر ساتھ ساتھ ہی رہیں۔ یہ نہ ہو کہ یہ یہاں کوئی گڑبڑ کردیں۔ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ یہ کوئی ایسا کام کریں بلکہ بڑے عرصے سے چاہ رہی ہوں۔ یہ خود ہی اس طرف نہیں آتے۔ میں نے کہا آنٹی اگر آپ واقعی اس معاملے میں سنجیدہ ہیں تو پھر اس کے لیے پیرس سے بہتر جگہ کوئی نہیں۔ یہاں آکر تو سو سال کے بوڑھوں میں بھی رومانس کی حس جاگ جاتی ہے اور وہ شادی کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ آنٹی میری باتوں پر ہنستی جارہی تھیں، کہنے لگیں، تم ان معاملوں میں کافی تیز لگتی ہو، اپنے انکل کے لیے کوئی اچھی سی میم ڈھونڈو۔ میری طرف سے تمہیں کھلی اجازت ہے۔ تو جناب! مائی لارڈ میں نے اسی سلسلے میں تھوڑی سی کوشش کی تھی۔“

”باتیں تو تم واقعی مار کھانے والی کررہی ہو لیکن......“

”لیکن میں وعدہ کرچکا ہوں اس لیے کیا ہوسکتا ہے۔“ اس نے شہزاد کا فقرہ جلدی سے مکمل کردیا اور ہنستی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔

شہزاد کو فاخرہ کی فکر لگی رہتی تھی۔ وہ سہ پہر ہوتے ہی واپس ہوٹل پہنچ گئے۔ ٹانگوں کے درد کے ساتھ ساتھ فاخرہ کو ہلکا سا بخار ہوچکا تھا۔ ٹانگوں کے درد اور بخار کا تعلق تھا اور اکثر ایسا ہوجایا کرتا تھا۔ تمام ضروری دوائیں شہزاد ساتھ لے کر آیا تھا۔ انجکشن وغیرہ بھی وہ خود لگا لیتا تھا۔ لہٰذا وہ فاخرہ کی تیمارداری میں لگ گیا۔

اگلی صبح فرزانہ، اس کی دونوں بیٹیاں اور داماد ریحان فاخرہ کی تیمارداری کے لیے آئے تھے۔ وہ بہت سا پھل اور سامان خورونوش بھی ساتھ لائے تھے۔ فاخرہ کی تکلیف دیکھتے ہوئے فرزانہ نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ وہ لوگ ہوٹل چھوڑ دیں اور ان کے ساتھ گھر چلیں مگر شہزاد کے نزدیک یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کے قیام وطعام کا بیشتر خرچا اسے مدعو کرنے والا ادارہ اٹھا رہا تھا۔

فرزانہ نے شہزاد سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”اگر گھر نہیں جانا تو پھر عینی کو یہاں رکھو۔ یہ فاخرہ کی دیکھ بھال کرلے گی۔“

”میں اس سب کا عادی ہوں فرزانہ۔ میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔“ شہزاد نے کہا۔

”لیکن یہ پردیس ہے۔ دیس اور پردیس میں فرق ہوتا ہے۔“ فرزانہ نے جواب دیا۔

باقی سب چلے گئے مگر عینی وہیں رہی اور اس کی وجہ سے واقعی کئی آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ فاخرہ کو جب یوں بخار ہوتا تو سات آٹھ دن ضرور چلتا تھا۔ ماں کی بیماری کی وجہ سے بچوں پر افسردگی چھا جایا کرتی تھی تاہم اس دفعہ عینی نے فاخرہ سمیت کسی کو افسردہ نہیں ہونے دیا۔ تین چار دن کے اندر وہ گھر کا ایک فرد ہی نظر آنے لگی۔ کبھی فاخرہ کو دوا کھلا رہی ہے، کبھی بچوں کے کپڑے بدل رہی ہے۔ کبھی رات گئے شہزاد کو الیکٹرک کیٹل میں چائے بنا کر دے رہی ہے۔ رات گئے سے مراد دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ مقامی دستور کے مطابق شام سات آٹھ بجے تک ڈنر کرلیا جاتا تھا۔ کبھی دس بجے کے قریب شہزاد کھڑکی سے باہر جھانکتا تو لگتا کہ سارا پیرس سویا پڑا ہے۔ تمام بازار سرشام ہی بند ہوجاتے تھے، بس کہیں کہیں ہوٹل ...... وغیرہ کھلے رہ جاتے تھے یا پھر مخصوص جگہوں پر نائٹ لائف کی سرگرمی ہوتی تھی اور یہ صورت حال کوئی پیرس کے ساتھ ہی خاص طور پر نہیں تھی، قریباً پورا یورپ جلدی سونے اور جلدی جاگنے کے فارمولے پر عمل کرتا نظر آتا ہے۔ صرف

ویک اینڈز پر لوگ دیر تک جاگتے ہیں لیکن یہ دیر تک جاگنا بھی بس رات بارہ ایک بجے تک ہی ہوتا ہے۔ شہزاد کو تو خیر یہ باتیں پہلے سے معلوم تھیں لیکن فاخرہ اور بچے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ وہ غروب آفتاب کے وقت ہی لوگوں کو کینڈل ڈنر کرتے دیکھتے تو دانتوں میں انگلیاں داب لیتے۔ شروع میں تو عمیر کا خیال یہ تھا کہ یہ لوگ ڈنر نہیں بلکہ لیٹ لنچ کر رہے ہیں۔

ایک دن احسن نے فرمائش کی کہ وہ صبح ناشتے میں پائن ایپل کیک پیسٹری کھائے گا۔ یہ شام چھ ساڑھے چھ بجے کا وقت تھا لیکن عینی اسی وقت بیکری جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شہزاد نے کہا۔ ''بھئی ابھی تو ناشتے کا وقت ہونے میں تیرہ چودہ گھنٹے باقی ہیں۔ اتنی جلدی کیا ہے؟''

''ناشتے میں تیرہ چودہ گھنٹے ہیں لیکن دکانیں بند ہونے میں صرف آدھا گھنٹا باقی ہے۔ یہاں ناشتا اسی وقت خریدا جاتا ہے مائی لارڈ۔''

وہ جانے کے لیے تیار ہوئی تو شہزاد اور احسن بھی چل پڑے۔ ڈپارٹمنٹل اسٹور زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک ذیلی سڑک پر وہ ترک مسجد کے پاس ہی تھا۔ وہ ایک نہایت صاف شفاف، ہر لحاظ سے نیم آلودہ شام تھی، چمکیلی کاریں چمکیلی سڑکوں پر پھسلتی جا رہی تھیں۔ اکثر یورپی شہروں کی طرح پیرس میں بھی ٹریفک کا نظام بہترین ہے۔ چھوٹی چھوٹی اندرونی سڑکوں پر بھی سگنل اور زیبرا کراسنگ وغیرہ موجود ہیں۔ بیشتر زیبرا کراسنگ پر ٹریفک سگنل ہوتے ہیں پیدل چلنے والوں کے لیے لیکن کچھ پر نہیں بھی ہوتے۔ ایسے جونہی پیدل چلنے والے کا پاؤں زیبرا کراسنگ کو چھوتا ہے سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ خود کو روک لیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے والوں کو بھی گاڑیوں کے حقوق کا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ شہزاد نے نوٹ کیا تھا کہ اگر پیدل چلنے والے رولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سڑک کراس کرنے کی کوشش کریں تو گاڑی سوار ان کو قطعاً رعایت نہیں دیتے۔ وہ بڑے زناٹے کے ساتھ سامنے سے یا پیچھے سے گزر جاتے ہیں۔

اس دن بھی شہزاد سے ایسی ہی غلطی ہوئی۔ وہ پانچ چھ سال کی ایک نہایت ہی خوبصورت سائیکل سوار بچی کو دیکھ رہا تھا، اس لیے ٹریفک سگنل پر غور نہ کر سکا۔ اس نے زیبرا کراسنگ پر دو تین قدم ہی بڑھائے تھے کہ ایک کار کے پہیے چرچرائے اور وہ لہراتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر گئی۔ عین وقت پر شہزاد نے ایک جھٹکے سے اپنے قدم روکے اور خود کو پیچھے ہٹا لیا تھا۔

''اوہ گاڈ۔'' عینی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

عمیر بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔ ''آج تو آپ واقعی پروفیسر لگے۔'' عینی نے لرزتی آواز میں کہا۔

''پتا نہیں چلا۔'' شہزاد منمنایا۔ اس نے اپنی گردن عقب سے تھامی ہوئی تھی۔ ایک دم پیچھے ہٹنے کی کوشش میں اس کی گردن کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

وہ پیسٹریاں اور بسکٹ وغیرہ لے کر ہوٹل واپس پہنچے۔ شہزاد کی گردن میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا لیکن اس نے کسی کو بتایا نہیں۔ فاخرہ نے دوا کھائی تھی لہٰذا سرِ شام ہی سو گئی تھی۔ اس کی بوجھل سانسوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ شہزاد نے اس کے بیڈ روم کا دروازہ ہولے سے بند کر دیا تاکہ وہ ڈسٹرب نہ ہو۔

وہ چاروں کچھ دیر ٹی وی دیکھتے رہے پھر کارڈ کھیلنے لگے۔ اسی دوران میں عمیر نے اٹیچی کیس میں سے لوڈو نکال لی۔ شہزاد کا خیال تھا کہ عینی کو لوڈو کھیلنا نہیں آتا ہوگا مگر اسے آتا تھا۔ عمیر احسن اور وہ کھیلنے لگی پھر انہوں نے زبردستی شہزاد کو بھی شریک کر لیا۔ عمیر بڑا تیز تھا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے برتری حاصل کر لی۔ شہزاد کی باری آئی تو عینی نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی انگلی شہزاد کے گھٹنے پر چبھوئی اور اسے اشارتاً بتایا کہ وہ اپنی تیسری گوٹی کو محفوظ خانے میں لے جائے ورنہ عمیر اسے پیٹ دے گا۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ شہزاد نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ اچانک شہزاد کے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ ایسا پہلے بھی تو ہوتا رہا تھا...... بالکل اسی انداز میں...... اسی ادا کے ساتھ...... کوئی اسی طرح...... کھیل میں بڑی ہمدردی سے اسے خاموش مشورے دیا کرتا تھا۔ مگر یہ بہت پہلے کی بات تھی۔

وہ چونک کر عینی کو دیکھنے لگا۔ وہ بڑی محویت سے اپنی باری لینے میں مصروف تھی۔ اچانک شہزاد اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''کیا ہوا ابو جی۔'' عمیر اور احسن ایک ساتھ بولے۔

''کچھ نہیں، تم کھیلو۔ میری گردن میں درد ہو رہا ہے۔ میں ذرا آرام کرتا ہوں۔''

عینی بولی۔ ''میں سمجھ گئی ہوں۔ یہ درد سڑک کو غلط طریقے سے پار کرنے کی وجہ سے ہے۔ میں اسی وقت سمجھ گئی تھی، چلیں آپ لیٹیں، میں پیچھے سے آپ کی گردن کے مسلز دباتی ہوں۔''

''نہیں، نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔ بس آرام کر لوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

وہ انہیں کھیلتا چھوڑ کر چھوٹے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ عینی اور نجمہ کی آنکھوں کی حیرت انگیز مشابہت اس کے ذہن میں چکرانے لگی اور اب بات صرف آنکھوں کی نہیں تھی۔ عینی کی کئی اداؤں میں اسے نجمہ کی جھلک نظر آتی تھی اور وہ گاہے بگاہے نہ چاہنے کے باوجود نجمہ کو یاد کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اب بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو شہزاد کو لگا تھا جیسے اس کے گھٹنے کو بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی انگلی سے چھونے والی عینی نہیں نجمہ تھی۔

وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا ورنہ جنموں وغیرہ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا۔ جنموں کی بات تو دور کی تھی، وہ کسی بھی فرسودہ خیال کو ذہن میں جگہ دینے والا بندہ نہیں تھا۔ ہاں یہ بات اسے ضرور تسلیم تھی کہ کچھ چیزیں انسان کے خون میں نسل در نسل سفر کرتی ہیں۔ کچھ جذبے، کچھ خیال ایک پود سے دوسری اور پھر تیسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ عینی عجیب انداز میں اس سے وابستگی کا اظہار کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ اگلی پیڑھی سے تھی۔ کیا یہ بھی ایک نسل سے دوسری نسل تک خون میں سفر کرنے والا کوئی ایسا ہی بے نام جذبہ تھا۔

وہ بستر پر لیٹا سوچتا رہا کہ پھر اسے نیند آ گئی۔ وہ قریباً ایک گھنٹا سویا۔ آنکھ کھلی تو وہ اوندھا لیٹا تھا۔ کوئی ہولے ہولے اس کی گردن کے عقبی حصے کو دبا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے مڑ کر دیکھا، یہ عینی تھا۔

''او ہو رہنے دو۔'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''آپ زیادہ باتکلف بننے کی کوشش نہ کریں۔'' وہ تحکم سے بولی۔ ''خاموشی سے لیٹے رہیں۔'' اس کے دبانے سے شہزاد کو واقعی سکون مل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سارے پٹھے کھنچ گئے ہیں۔ گردن اکڑی ہوئی لگتی تھی۔

''لگتا ہے کہ اب بڑھاپا حاوی ہو رہا ہے۔'' شہزاد نے ہولے سے کہا۔ ''معمولی سا جھٹکا تھا مگر لگتا ہے کہ دوسری منزل سے چھلانگ لگائی ہے۔''

''بڑھاپا نہیں ہے مائی لارڈ، تین چار ہفتے پہلے میرے ساتھ ایسا ہو گیا تھا۔ سائیکل پر سے گری حالانکہ بالکل سوفٹ جگہ تھی، گھاس اگی ہوئی تھی پھر بھی گردن کو ایسا جھٹکا لگا کہ تین چار دن کلاسز ہی نہیں لے سکی۔ امی نے صبح شام وکس ملی پھر کچھ بہتری آئی۔''

''تو گھر والے تمہیں سائیکل چلانے دیتے ہیں؟''

''سائیکل کیا، میں ہوائی جہاز چلانے کا کہہ دوں تو بھی انہیں ماننا پڑے گا۔ میری بات کوئی ٹال نہیں سکتا جی۔ بڑی ضدی قسم کی لڑکی ہوں۔ اس کے علاوہ میری ایک ویٹو پاور بھی ہے۔''

''ویٹو پاور...... وہ کیا؟''

''آپ خود اندازہ لگائیں۔''

''کیا مقامی قانون کے مطابق کوئی سہولت حاصل ہے؟''

وہ ہنسی۔ ''ایسی سہولتیں تو یہاں ہوتی ہی ہیں مائی لارڈ لیکن میں کوئی اور بات کر رہی ہوں۔''

''اچھا...... بتاؤ گی یا پہیلیاں بھجواؤ گی؟''

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہ کر بولی۔ ''اچھا رہنے دیں پھر کبھی بتاؤں گی......''

شہزاد نے بھی زیادہ استفسار نہیں کیا۔ وہ چونک کر بولی۔ ''اوہ...... آپ نے باتوں میں بات ہی بھلا دی۔ میں وکس کی بات کر رہی تھی۔ ادھر بھی ایک ایسی آئنٹمنٹ پڑی ہے۔ میں ابھی لاتی ہوں۔ تھوڑا سا ملوں گی تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

شہزاد اسے منع کرتا رہ گیا۔ وہ جلدی سے گئی اور مرہم لے آئی۔ شہزاد اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ہلنے جلنے سے اسے پھر درد ہونے لگا تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ تھوڑا سا مرہم لگوا ہی لے۔ وہ پھر اوندھا لیٹ گیا۔ اس کی قمیص کو شانوں سے پیچھے ہٹا کر وہ بڑی مہارت اور نرمی سے گردن کا مساج کرنے لگی۔ اس کے بال آگے کو جھول کر بار بار شہزاد کے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ شہزاد کو اس سے بیزاری ہو رہی تھی۔ ایک دو منٹ بعد شہزاد بولا۔

''اب بس کرو، تھک جاؤ گی۔''

''آپ کا کام کرتے ہوئے میں کبھی نہیں تھک سکتی، مائی لارڈ۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

شہزاد کو الجھن ہونے لگی۔ وہ ایسے لہجے میں کیوں بات کرتی تھی اس سے؟ قبل اس کے کہ شہزاد کچھ کہتا، اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ اس کے کندھوں پر مالش کرتے ہوئے بولی۔

''جنابِ عالی، جب آپ تصویر اتار رہے ہوتے ہیں ناں، میں آپ کو دیکھتی رہتی ہوں۔ آپ کے کھڑے ہونے کا انداز، آپ کی انگلیاں، آپ کا چہرہ...... اور پتا ہے مجھے کیا لگتا ہے؟ مجھے لگتا ہے کہ میں کسی لیجنڈ کو لائیو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے انٹرنیشنل میگزینز میں پرنٹ ہونے والے آپ کے معروف فوٹوگرافرز یاد آ جاتے ہیں۔''

''ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بڑا بڑا اچھا کام کرنے والوں سے دنیا بھری ہوئی ہے۔ ہم کسی شمار قطار میں نہیں ہیں۔''

''یہ تو آپ کی انکساری ہے۔''

''اچھا چلو چھوڑو اب۔ کافی ہوگیا۔'' شہزاد نے ایک بار پھر اٹھنے کا ارادہ کیا۔

وہ بولی۔ ''بس دو منٹ اور...... گھڑی دیکھ کر۔''

وہ مرہم گردن کے مساموں میں جذب کر رہی تھی اور اسے درد میں افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسی کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''اچھا، اگر میں آپ ہی کی طرح بننا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''سنجیدہ ہونا ہوگا، باتیں کم کرنی ہوں گی، پڑھائی کی طرف خیال رکھنا ہوگا اور...... محنت۔''

''ٹھیک ہے مائی لارڈ۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی پھر جیسے ایک دم اس کے ذہن میں نیا خیال آیا اور وہ چہکی۔ ''کیا یہ نہیں ہوسکتا مائی لارڈ کہ آپ مجھے اپنا شاگرد بنالیں۔ پکا پکا شاگرد۔''

''یہ پکا پکا شاگرد کیا ہوتا ہے؟''

''مطلب یہ کہ میں ہر وقت آپ کے ساتھ رہوں۔ آپ کو ہر لحاظ سے پورا پورا فالو کروں۔ آپ سے ہر لحہ کچھ نہ کچھ سیکھوں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ہاں واقعی، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' وہ قدرے اداسی سے بولی۔

پھر ایک دم نہ جانے کیا ہوا، اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ ایک مرتبہ ہنسنا شروع ہوئی تو پھر ہنستی چلی گئی۔ وہ ہنسی روکنے کی کوشش میں دہری ہوئی جا رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہوگیا اور بال آگے کو بکھر گئے۔

''کیا ہوا؟'' شہزاد نے اپنے سینے کو کہنیوں کے بل تھوڑا سا اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے بہ مشکل کہا۔ ''بس یونہی ایک خیال ذہن میں آگیا تھا۔''

''کیسا خیال؟''

''بس یونہی۔'' اور اس پر ایک بار پھر ہنسی کا اٹیک ہوگیا۔ ساتھ ساتھ وہ گردن کی مالش بھی کرتی جا رہی تھی۔

شہزاد اس سے ہنسی کی وجہ...... پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اسی دوران میں دروازے پر کال بیل ہوگئی۔ نو بج چکے تھے۔ شہزاد نے خیال کیا کہ بیرا ہوگا۔ ساتھ والے کمرے میں عمیر اور احسن ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ شہزاد نے آواز دی۔

''عمیر، دروازے پر دیکھو۔''

''بھائی تو سوگیا۔'' احسن نے بتایا۔

''تو تم دیکھ لو بچونگڑے۔'' عینی نے کہا۔ اب وہ اپنی ہنسی کو بریک لگانے میں کامیاب ہوچکی تھی۔ احسن دروازے پر گیا۔ چند لمحوں بعد شہزاد کو محسوس ہوا کہ کوئی اندر آگیا ہے۔ ایک دم عینی چہکی۔

''اوہ ماموں جان...... آپ؟''

شہزاد نے جلدی سے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اس وقت یہاں اس کمرے میں شارق کو دیکھے گا۔ اس کی معلومات کے مطابق تو شارق آج کل انگلینڈ میں تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور قمیص کے بٹن بند کرنے لگا۔ وہ آج شارق کو قریباً آٹھ نو سال بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے موٹا ہوگیا تھا۔ جبڑوں کے نیچے کافی گوشت آگیا تھا، کنپٹیاں سفید ہوچکی تھیں۔ ایک تہائی سر بالوں سے خالی ہوگیا تھا۔ بال اتر جانے سے سر پر لگی ہوئی ایک چوٹ بھی نمایاں ہوگئی تھی۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ اس نے چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ سجانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''ہیلو پروفیسر صاحب۔''

شہزاد بغلگیر ہونا چاہ رہا تھا مگر شارق کا انداز دیکھتے ہوئے اس نے بھی مصافحے پر اکتفا کیا۔ فاخرہ کی کھانسی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی جاگ گئی ہے۔ عینی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''آنٹی، دیکھیں کون آیا ہے۔'' کچھ دیر بعد وہ سب فاخرہ کے بیڈ کے اردگرد بیٹھے تھے۔

شارق نے بتایا کہ وہ آج صبح ہی یہاں پہنچا ہے۔ یہاں قریب ہی دو مقامی دوستوں نے ایک اوپن ایئر ریستوران میں پارٹی دے رکھی تھی۔ وہاں سے فارغ ہوکر وہ ادھر آگیا ہے کیونکہ فرزانہ نے بتایا تھا کہ ہم یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

وہ سب وہاں بیٹھ کر وہی باتیں کرتے رہے جو آٹھ نو سال بعد ملنے والے قریبی رشتے دار آپس میں کرسکتے ہیں۔ فلاں کراچی میں کیا کر رہا ہے، فلاں کے بیٹے کی شادی کس کی بیٹی کے ساتھ ہونے والی ہے۔ فلاں کا کاروبار کیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔ شہزاد واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ شارق کے لہجے میں سرد مہری ہے۔ وہ صرف خانہ پوری کے لیے گفتگو جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس نے کچھ چبھتی ہوئی سی باتیں بھی کیں۔

شہزاد اس سے ایسی ہی توقع رکھ سکتا تھا۔ شارق کا یہ کہنا بھی غلط تھا کہ وہ خاص ان سے ملنے کے لیے یہاں آیا ہے۔ وہ غالباً عینی کو لے جانے کے لیے آیا تھا۔

جلد ہی مدعا اس کی زبان پر آگیا۔ وہ عینی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''چلو بھئی پھر چلیں، تمہاری ماما نے کہا تھا کہ آتے ہوئے اسے ساتھ ہی لے آنا۔ تمہارے پاپا کا بھی فون آیا تھا۔''

احسن بولا۔ ''نہیں نہیں انکل، ہم نہیں جانے دیں گے باجی کو۔ ہم نے تو صبح کیک پیسٹریوں کا بریک فاسٹ کرنا ہے اور دریا میں کشتی بھی چلانی ہے۔''

''ٹھیک ہے ماموں میں کل آجاؤں گی۔'' عینی نے کہا۔

''بھئی تمہاری ماما نے تاکید کی تھی۔'' شارق کے چہرے پر ہلکی سی سرخی لہرا گئی۔

''ماما سے میں خود بات کرلیتی ہوں ماموں۔'' وہ ٹھنکی۔

''چلیں رہنے دیں شارق بھائی۔'' فاخرہ نے بھی لیے سفارش کی۔

شارق جز بز نظر آ رہا تھا۔ شہزاد کا دل بھی یہی چاہ رہا تھا کہ وہ چلی جائے لیکن وہ اڑ گئی۔ آخر شارق اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے کل شام تک آجانا یا ہوسکتا ہے کہ میں خود ہی لینے آجاؤں۔''

''میں فون کردوں گی۔''

شارق کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ اسے فون والی بات پسند نہیں آئی تھی۔ اس میں امکان نظر آتا تھا کہ شاید وہ کل بھی نہیں آئے گی۔ بہرحال وہ کچھ بولا نہیں اور سنی ان سنی کرتا ہوا رخصت ہوگیا۔

شارق کی اس اچانک آمد نے شہزاد کے ذہن میں ہلچل سی مچادی تھی۔ کئی پرانے زخم تازہ ہوگئے تھے۔ اسے لگا جیسے ابھی کل ہی کی بات ہے، جب نجمہ زندہ تھی۔ وقت کی تیز ہوا چل رہی تھی مگر ان کے دلوں میں آس امید کے چراغ بھی روشن تھے پھر ان چراغوں کو بجھانے کے لیے شارق پھنکارتا ہوا آگے بڑھا تھا۔ اس کی ساری ستم ظریفیاں شہزاد کو یاد آگئیں اور وہ منظر بھی یاد آیا جب نجمہ سے ملنے کی پاداش میں شارق نے اسے ایک ویران جگہ پر گھیر لیا تھا۔ اس کا ایک غنڈہ دوست راجا بھی اس کے ساتھ تھا۔ انہوں نے شہزاد کو دہشت زدہ کرنا چاہا تھا اور شاید وہ ہو بھی جاتا لیکن جب شارق نے اسے باپ کی گالی دی تو شہزاد سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ ان تینوں کے درمیان زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی کی یادگار ایک زخم ابھی تک شہزاد کی کلائی پر ایک کٹ کی صورت میں موجود تھا۔ درست کہتے ہیں کہ ہاتھ سے لگائے گئے زخم ٹھیک ہوجاتے ہیں لیکن زبان کے لگائے گئے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں۔

کچھ دن پہلے جب پیرس یاترا شروع ہوتے ہی فرزانہ شہزاد اور اس کے بچوں کے پاس آدھمکی تھی تو شہزاد کو کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی جو آج سامنے آئی تھی۔ شہزاد جانتا تھا کہ بے شک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے لیکن نفرت اور عداوت کی سیاہ چٹانیں ایک زمانہ گزر جانے کے بعد بھی اپنی جگہ موجود ہیں اور آج یہاں شارق کی آمد اور اس کے رویے سے اس کا ثبوت مل بھی گیا تھا۔ شہزاد کو یاد آیا کہ جب شارق اندر آیا تو عینی بے تکلفی کے ساتھ اس کے کندھوں کی مالش کرنے میں مصروف تھی۔ شاید شارق نے یہ منظر بھی دیکھا تھا اور اسی منظر نے اس کے رویے کو مزید خشک کردیا تھا۔

بے شک شہزاد بڑا نام کما چکا تھا۔ بڑی کامیابیاں حاصل کرچکا تھا۔ اس نے فاخرہ کو شریک حیات بنا کر ایثار کی ایک اعلیٰ مثال بھی قائم کی تھی لیکن شارق اور اس کے ہم خیالوں کے نزدیک تو وہ اب بھی گھٹیا...... پینڈو...... اور جنگلی ہی تھا۔ ایک ایسا گھٹیا، کمتر بندہ، عینی سے اپنی خدمت کرا رہا تھا یقیناً یہ صورت حال شارق جیسے بندے کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی۔

عینی ابھی جانا نہیں چاہتی تھی لیکن شہزاد نے اسے آمادہ کرلیا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کسی طرح کا کوئی تناؤ پیدا ہو۔ ویسے بھی عینی کی یہاں موجودگی اسے خوامخواہ الجھن میں مبتلا کرتی تھی۔ شام کو شارق کے ساتھ فرزانہ اور عینی کی بڑی بہن زارا بھی چلی آئیں۔ وہ فاخرہ کی عیادت کرنے آئی تھیں۔ شہزاد نے صاف محسوس کیا کہ شارق کی موجودگی میں فرزانہ اور زارا وغیرہ زیادہ بے تکلفی سے بات نہیں کر رہی تھیں۔ شہزاد نے روم سروس والوں کو کال کرکے کافی اور اسنیکس وغیرہ منگوائے۔ اسی دوران میں فاخرہ اٹھ کر فریج سے کولڈ ڈرنک کی بوتل نکالنے لگی۔ پتا نہیں کہ اس کا پاؤں رپٹا یا ویسے ہی چکر آیا، وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ شہزاد اور عینی اضطراری حرکت کے ساتھ اس کی طرف لپکے۔ عینی نے اسے پشت کی طرف سے تھامنے کی کوشش کی اگر وہ ایسا نہ کرتی تو فاخرہ کا سر بڑے زور سے تپائی کے ساتھ ٹکراتا پھر بھی اپنا وزن سہارنے کی کوشش میں فاخرہ کا سارا بوجھ اس کے دائیں ہاتھ پر

آ گیا۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔

انہوں نے اسے سنبھال کر دوبارہ بیڈ پر لٹایا۔ شہزاد اسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

''کتنی دفعہ کہا ہے سونم، خود نہ اٹھا کرو۔ کوئی مجبوری ہو تو پھر بھی الگ بات ہے۔ مجھے کہنا تھا میں نکال دیتا بوتل۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ شہزاد نے ہاتھ کو ہلا جلا کر دیکھا۔ ہڈی بچ گئی تھی تاہم کلائی مڑنے کی وجہ سے پورا بازو لرز رہا تھا۔ کچھ دیر بعد تھوڑی سی سوزش بھی ہوگئی۔ عینی نے کل والی آئنٹمنٹ لگا کر تھوڑی سی مالش کی۔ شہزاد نے اس پر لچک دار پٹی باندھ دی۔

عینی واپس جانے کے لیے آمادہ ہو چکی تھی لیکن اس نئے واقعے کے بعد وہ تذبذب میں نظر آئی۔ اس نے فرزانہ سے کہا۔

''ماما! اگر آپ کہیں تو میں کل کا دن اور نہ رہ لوں؟''

فرزانہ نے چند لمحے سوچ کر کہا۔ ''یا پھر میں رہ لیتی ہوں۔''

''لیکن آپ نے تو کل ڈینٹسٹ سے ٹائم لیا ہوا ہے۔'' زارا نے یاد دلایا۔

''ویسے کوئی ایسا مسئلہ تو نہیں ہے۔'' شارق جلدی سے بولا۔ ''پٹھے میں تھوڑا سا کھنچاؤ آیا ہے، صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔''

شہزاد اور فاخرہ بھی کہنے لگے کہ ایسی کوئی بات نہیں، وہ لوگ تسلی سے جائیں لیکن عینی نے کہا کہ نہیں وہ کم از کم کل کا دن یہاں رکے گی۔ اس نے فرزانہ کو بھی نیم رضامند کر لیا۔ فرزانہ نے بھی کہہ دیا کہ ٹھیک ہے کل دوپہر تک آ جانا۔

شارق اس دوران میں خاموش بیٹھا رہا لیکن اس کے چہرے کی سرخی اس کے اندر کی اتھل پتھل کا موہوم سا سراغ دے رہی تھی پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ گرج کر بولا۔

''اٹھو عینی! یہاں کوئی ایسا سیریس مسئلہ نہیں ہے۔ زیادہ پریشانی ہے تو کل آفٹر نون میں پھر چکر لگا لینا۔'' اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

یہ تحکمانہ لب و لہجہ کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ خاص طور سے عینی کو تو بالکل بھی نہیں۔ اس نے پہلے ذرا تعجب سے ماموں کی طرف دیکھا پھر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ماموں کے ایک دم بھڑک اٹھنے پر حیران تھی۔ وہ ماضی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی پھر بھی کم جانتی تھی۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ماموں، آپ کیوں بگڑ رہے ہیں۔ میں نے کہا ہے ناں کل شام تک آ جاؤں گی۔''

''نہیں، ابھی چلو۔ کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں یہاں رہنے کی۔'' شارق کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

''ضرورت ہے ماموں۔'' عینی نے بھی فیصلہ کن لہجہ اختیار کر لیا۔

اس سے پہلے کہ شہزاد مداخلت کرتا۔ شارق بالکل آگ بگولا ہو گیا۔ وہ جنونی انداز میں بولا۔

''نہیں ہے ضرورت...... نہیں ہے...... تم کل کی بچی ہو۔ تم کچھ نہیں جانتی ہو۔ تمہیں کچھ پتا نہیں ہے ان لوگوں کا۔ کچھ پتا نہیں ہے۔''

''ماموں۔'' عینی کے لہجے میں احتجاج تھا اور حیرت تھی۔

''چپ رہو۔ تم کیا جانتی ہو اس بندے کے بارے میں۔'' وہ دھاڑا اور انگلی سے سیدھا شہزاد کی طرف اشارہ کیا پھر وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''تم کچھ نہیں جانتی ہو۔ یہ بندہ کیا ہے۔ مجھے پتا ہے...... مجھے پتا ہے۔'' اس نے زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ بارود کا کوئی ڈھیر تھا جو ایک دم ہی اس کے اندر پھٹ گیا تھا۔

''شارق، تم ہوش سے بات کرو۔'' شہزاد کہے بغیر نہ رہ سکا۔ سب سناٹے میں تھے۔

''ہاں میں ہوش میں ہوں اور بڑے عرصے سے ہوش میں ہوں تمہیں...... شرم آنی چاہیے اپنے آپ پر۔ تم بدنیت ہو...... گندے ہو...... ہمیشہ کے ایسے ہو۔'' جو کچھ منہ میں آیا وہ جنونی انداز میں کہتا چلا جا رہا تھا۔

''شارق، منہ سنبھال بات کر۔'' شہزاد پھر پھنکارا۔

''کس کو کہہ رہا ہے گندا؟''

''اسی کو کہہ رہا ہوں جس کا ذہن گندا ہے، جس کا خون گندا ہے۔ جس نے ہمیشہ خاندان کی عزت اچھالی ہے۔''

شہزاد سے برداشت نہیں ہوا۔ اس نے شارق کا گریبان پکڑ لیا۔ فاخرہ، فرزانہ اور عینی چلائیں۔ بچے بھی دہشت زدہ ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بات اتنی بڑھ جائے گی کسی کے خیال میں نہیں تھا۔ اپنے گریبان پر شہزاد کے ہاتھ پڑتے ہی شارق نے فون سیٹ اٹھا کر شہزاد کے چہرے پر دے مارا۔ شہزاد پشت کے بل ٹیبل لیمپ پر جا گرا۔ ٹیبل لیمپ کا بلب پٹاخ کے ساتھ پھٹا اور لکڑی کا لیمپ دو ٹکڑے ہو گیا۔ فرزانہ چلاتی ہوئی دونوں کے درمیان آ گئی۔

''خدا کے لیے نہیں...... خدا کے لیے نہیں۔''

اسی دوران میں شارق کے ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے لیمپ کا قریباً تین فٹ لمبا چوبی ٹکڑا آ گیا۔ اس نے اس وزنی ٹکڑے سے بے دریغ شہزاد کے سر پر ضرب لگائی۔ پہلی ضرب پھر دوسری پھر تیسری۔ وہ اس وقت شاید جنون کی حالت میں تھا۔ مدتوں سے اس کے اندر اکٹھا ہونے والا زہر ایک زبردست اُبال کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔ شہزاد تیورا کر گر پڑا۔ ساری عورتیں چلاتی ہوئی ان دونوں کے درمیان آ گئیں۔ اسی دوران میں باہر سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ وہ ہوٹل کے ملازمین تھے جو فرانسیسی میں پکارتے ہوئے آ رہے تھے......

شہزاد تقریباً نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہوٹل ملازمین اندر گھس آئے اور بپھرے ہوئے شارق کو شہزاد کے پاس سے ہٹا کر دور لے گئے۔ شارق اب بھی دھاڑ رہا تھا۔ ''میں تیرے ہاتھ پاؤں توڑ دوں گا، جان سے مار دوں گا تجھے۔ اپنی عمر دیکھ اپنے کرتوت دیکھ۔ ہاں تیرا خون گندا ہے، گندی نسل ہے تیری......''

روم سروس کا انچارج بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ شہزاد کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ فرزانہ نے اپنی شال سے شہزاد کے سر کے زخموں کو دبا رکھا تھا۔ جو قالین پر نیم دراز تھا۔ روم سروس والے نے شہزاد کی حالت دیکھتے ہوئے فوراً اسپتال کی موبائل گاڑی کو فون کر دیا۔ فقط دو تین منٹ بعد ایمبولینس کا ہوٹر سنائی دینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں دو باوردی افراد موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے شہزاد کا پاسپورٹ طلب کیا۔ فاخرہ نے لرزتے ہاتھوں سے اپنا اور شہزاد کا پاسپورٹ اہلکاروں کو دکھایا۔ انہوں نے شہزاد کے زخموں کا سرسری معائنہ کیا۔ اس کے بعد اسے اسٹریچر پر باہر کھڑی گاڑی تک لے گئے۔ شارق اتنی دیر میں نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔

اہلکار صرف شہزاد کو لے جانا چاہتے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ قواعد کے مطابق وہ صرف مریض کو لے جا سکتے ہیں۔ لواحقین کو آنا ہو تو وہ اپنی گاڑی پر آئیں۔ بہرطور فرزانہ بحث کر کے کسی نہ کسی طور ایمبولینس میں سوار ہو گئی۔ شہزاد کی آنکھوں میں خون بھر گیا تھا۔ اسے اردگرد کی ہر شے سرخی مائل نظر آ رہی تھی۔ تاہم ایمبولینس میں آنے کے بعد اس کے دماغ میں چھایا ہوا اندھیرا تھوڑا سا چھٹ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں فاخرہ اور بچوں کو تسلی دی۔ ''میں ٹھیک ہوں...... خطرے کی بات نہیں۔'' اس نے کہا۔

''تم کوئی فکر نہ کرو فاخرہ۔'' فرزانہ نے بھی فاخرہ کو تسلی دی۔ پھر اس نے زارا اور عینی سے کہا کہ وہ یہاں فاخرہ کے پاس ہی رہیں۔

شہزاد کو تیز رفتاری سے ایک قریبی اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے زخموں سے بہنے والا لہو راستے میں ہی بند کر دیا گیا تھا۔ اہلکاروں نے اسے ایک وہیل چیئر پر بٹھا کر ایمرجنسی وارڈ میں انتظار کے لیے بٹھا دیا۔ فرزانہ اس کے پاس تھی اور عملے کے ارکان سے گاہے اور بگاہے ٹوٹی پھوٹی فرنچ میں بات کر رہی تھی۔ ایمرجنسی میں پہلے سے آٹھ دس مریض موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر عمر رسیدہ تھے جو باتھ روم میں یا سیڑھیوں وغیرہ سے گرے تھے۔

اسپتال کے ایک اہلکار نے آ کر انگلش میں شہزاد سے پوچھا۔ ''کیا یہ میڈیکولیگل کیس ہے؟''

فرزانہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن شہزاد نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے روک دیا۔ وہ اہلکار سے بولا۔ ''جی نہیں، مجھے خود سے چوٹیں آئی ہیں، میں گر گیا تھا۔''

اہلکار نے سر کے زخموں کو دیکھا۔ یقیناً وہ شہزاد کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ بہرحال وہ چلا گیا۔

شہزاد کے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی جو کچھ ہوا بالکل غیر متوقع تھا۔ کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ شارق اتنی سرعت سے بات کو اس قدر بڑھا دے گا۔ وہ جیسے اندر سے طیش کا آتش فشاں بنا ہوا تھا اور ایک معمولی تحریک سے پھٹ پڑا تھا۔ فرزانہ بار بار معذرت کے الفاظ ادا کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ اس کی ہی وجہ سے ہوا ہے۔ شہزاد نے اسے تسلی تشفی دی۔

پیرس کا یہ اسپتال جدید اور صاف ستھرا تو تھا مگر یہاں کی سروس کے بارے میں اس کی جو توقع تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ مریض بڑی سست روی سے اندر جا رہے تھے۔ ایمبولینس میں دی جانے والی ابتدائی طبی امداد کے بعد اسے ابھی تک کسی نے دیکھا نہیں تھا۔

فرزانہ کے موبائل پر بار بار اس کی بڑی بیٹی زارا کا فون آ رہا تھا اور وہ شہزاد کا حال پوچھ رہی تھی۔ فرزانہ کے کہنے پر شہزاد نے فاخرہ اور دونوں بچوں سے بھی بات کی۔ ہاں عینی سے بات نہیں ہوئی۔ ''عینی کہاں ہے؟'' شہزاد نے فاخرہ سے پوچھا۔

''وہ چلی گئی ہے۔''

''کس کے ساتھ؟''

''پتا نہیں، شاید وہی لے کر گیا ہے اسے۔'' فاخرہ نے کہا۔ ''وہی'' سے اس کی مراد شارق تھا۔

ایمرجنسی میں قریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ ان کی باری آ کر نہیں دے رہی تھی۔ فرزانہ سخت پریشان تھی۔ اسے شارق پر بھی بہت غصہ تھا۔ یہ غصہ اس کی آنکھوں کے علاوہ اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ شہزاد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''فرزانہ! میں اسی لیے تم سے کہتا تھا کہ ہمارا ایک دوسرے سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ سوچو، اب تو ہم ہوٹل میں ہیں اگر ہم تمہارے گھر ٹھہرے ہوتے تو کیا قیامت آتی۔ ہمارے گھرانوں میں نفرت کی جڑیں کافی اندر تک جا چکی ہیں، یہ آسانی سے باہر نہیں نکلیں گی۔''

''مجھے شارق پر اتنا افسوس ہوا ہے شہزاد کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ وہ مجھ سے ایک سال بڑا ہے لیکن اگر اس وقت وہ میرے سامنے ہوتا ناں تو میں نے ...... اس کا منہ نوچ لینا تھا۔'' فرزانہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''اس سے کیا ہو جاتا، معاملہ اور سنگین ہو جانے کے علاوہ؟''

''معاملہ اور کیوں سنگین ہو جاتا تھا۔ میں لاہور میں ابا جی کو فون کروں گی۔ انہیں بتاؤں گی کہ شارق نے یہاں کیا چاند چڑھایا ہے...... ابا جی اب بڑے بدل چکے ہیں شہزاد۔ وہ ہر معاملے میں بڑے نرم ہو گئے ہیں...... تم تو کافی عرصے سے ان سے ملے نہیں ہو ناں۔''

شہزاد کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ ہولے سے بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ بہت کچھ بدل چکا ہو لیکن...... فرزانہ...... مجھے پتا ہے میرے لیے کہیں کچھ بھی نہیں بدلا ہوگا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماموں جہانگیر بھی جب کبھی میرے سامنے آئیں گے ان کی آنکھوں میں ایسے ہی خون اتر آئے گا۔''

''کیوں اتر آئے گا؟ کیا کیا ہے تم نے؟ تم نے بڑوں کی مرضی کے سامنے سر جھکایا تھا۔ ٹھیک ہے کہ اس وقت ماحول کی گرماگرمی میں دونوں طرف سے کچھ باتیں ہوئی تھیں لیکن اب تو اس برے وقت کو گزرے ایک عرصہ گزر چکا ہے......''

''کچھ بھی ہو فرزانہ! میں نہیں چاہتا کہ ہم ایک سوئی ہوئی آفت کو پھر سے جگانا شروع کر دیں۔ تم نے اور تمہارے بچوں نے ہمارے لیے جو کچھ کیا میں اس کے لیے تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ ہم تمہاری اس میزبانی کو ہمیشہ یاد رکھیں گے...... لیکن...... اب میری خواہش ہے کہ ہم جتنے دن یہاں رہیں ہمارے درمیان کسی طرح کا کوئی رابطہ نہ ہو۔ اگر یہ رابطہ رہا تو مجھے یقین ہے کہ پھر کچھ بھی ٹھیک نہیں رہے گا۔''

''لیکن شہزاد بھائی تم......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں فرزانہ...... شارق تمہارا سگا بھائی ہے تو میرا بھی ماموں زاد ہے، میں اس کے مزاج کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ غصے میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آج مجھے چوٹیں آئی ہیں اور میں نے سہہ لی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کل میں نہ سہہ سکوں یا پھر جتنی چوٹیں مجھے آئی ہیں اتنی ہی اس کو بھی آ جائیں۔ پلیز فرزانہ...... اس سلسلے کو آج سے ختم کر دو۔ زندگی رہی اور حالات اچھے رہے تو ہم پھر رابطہ کریں گے۔''

''لیکن میں اس سلسلے کو ایسے ہی ختم نہیں کر سکتی۔'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ''شارق کو تم سے معافی مانگنی ہوگی۔ تم میری میزبانی میں تھے، اس نے تم پر نہیں مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔''

''دیکھو، یہ سارے معاملے کو بڑھانے والی باتیں ہیں اور میں اسے بڑھانا نہیں چاہتا۔'' شہزاد کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

اسی دوران میں بالآخر شہزاد کی باری آ گئی اور وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے سر کا ایکسرے کیا گیا۔ دو زخموں کی اسٹچنگ ہوئی اور قریباً ایک گھنٹے بعد وہ اسپتال سے فارغ ہو کر واپس ہوٹل لوٹ آیا۔ واپسی پر فرزانہ نے ٹیکسی کا انتظام کیا تھا۔

اس رات فرزانہ ہوٹل میں ہی فاخرہ اور شہزاد کے پاس رہی۔ تاہم اگلے روز شہزاد کے پرزور اصرار پر گھر واپس چلی گئی۔ شہزاد کی حالت اب کافی اچھی تھی۔ دوپہر کے وقت اس کے اصل میزبانوں میں سے کچھ لوگ اس سے ملنے پہنچ گئے۔ یہ اسی انسٹی ٹیوٹ کے افراد تھے جن کی دعوت پر وہ یہاں پیرس آیا تھا۔ یہ چار خواتین وحضرات تھے۔ شہزاد کی چوٹیں دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے۔ ان لوگوں سے کچھ چھپانا فضول تھا کیونکہ بعد میں انہیں ہوٹل کی انتظامیہ سے معلوم ہو ہی جانا تھا۔ شہزاد نے مناسب الفاظ میں انہیں بتا دیا کہ یہ فیملی کے دو افراد کے درمیان ہونے والا ایک اتفاقیہ جھگڑا تھا۔ یہ لوگ چار بجے کی چائے تک شہزاد کے ساتھ رہے۔ انہوں نے شہزاد کو بتایا کہ یہاں پیرس میں بہت سے لوگ اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔

درد میں افاقے کے لیے شہزاد مسلسل پین کلر کھا رہا تھا۔ اسے تکلیف تو تھی مگر وہ بیوی بچوں پر زیادہ ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ خاص طور سے عمیر اور احسن کے سامنے وہ بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت شہزاد اور فاخرہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب شام سات بجے کے قریب عینی پھر ہوٹل آ پہنچی۔ اس کے ساتھ چھوٹا سا بیگ بھی تھا۔ گڈ ایوننگ ایوری

باڈی۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔

فاخرہ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''میرے کپڑے ہیں اور تولیا...... ٹوتھ پیسٹ، برش وغیرہ۔''

''کس لیے؟'' شہزاد نے ٹھٹک کر پوچھا۔

''میں دو چار دن یہیں رہوں گی آپ کے پاس۔ آپ دونوں کو میری ضرورت ہے۔'' وہ ٹھسے سے بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' شہزاد نے تیوری چڑھائی۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں جو کر رہی ہوں سوچ سمجھ کر ہی کر رہی ہوں۔'' وہ بڑے اطمینان اور عزم سے گویا ہوئی۔

شہزاد کو اس کے لہجے میں عجیب سا باغیانہ پن محسوس ہوا۔ وہ اندر تک لرز گیا۔ فاخرہ نے دبے لہجے میں کہا۔ ''عینی! تمہیں پتا ہی ہے تمہارے ماموں نے کتنا غصہ کیا ہے، اگر......''

''ماموں اگر ہوش میں نہیں ہیں تو کیا ہم بھی ہوش میں نہ رہیں۔'' اس نے تیزی سے فاخرہ کی بات کاٹی۔ ''ایک غلط بات کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ بھی اس غلطی میں شریک ہیں۔''

عینی کی آمد سے دونوں بچے ایک دم خوش ہو گئے تھے۔ وہ اس سے لپٹ گئے اور اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار کرنے لگے۔

شہزاد نے عینی سے پوچھا۔ ''تمہاری ماما نے کیا کہا ہے اس بارے میں؟''

''وہ بھی آپ کی طرح ڈر رہی تھیں...... کہہ رہی تھیں کہ تمہارے جانے سے تمہارا ماموں بہت بگڑے گا۔ میں نے غصے سے کہا کہ ماموں کو بیچ میں سے نکال دیں۔ مجھے صرف یہ بتائیں کہ اس سچویشن میں ہم میں سے کسی کو ہوٹل میں موجود ہونا چاہیے یا نہیں؟ وہ خاموش ہو گئیں۔''

''عینی! یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' شہزاد منمنایا۔

''کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں، یہ بحث بعد میں کر لیں گے، اب مجھے یہ بتائیں کہ صبح ناشتے میں آپ نے یا بچوں نے کوئی خاص چیز لینی ہے؟ اگر لینی ہے تو میں ابھی اسٹور سے لے آتی ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی دوائیں بھی دیکھ لیں۔ اگر کوئی دوا لانی ہے تو مجھے بتا دیں۔''

''نہیں، ابھی تو کوئی ضرورت نہیں۔'' فاخرہ نے کہا۔

اس نے کمرے کا فریج کھولا۔ وہاں موجود اشیا کا جائزہ لیا اور پھر جلدی سے باہر نکل گئی۔

دس پندرہ منٹ بعد وہ لدی پھندی واپس آئی بسکٹ، چاکلیٹس، جوسز، ٹن پیک فوڈ...... پتا نہیں کیا کچھ اٹھا رکھا تھا اس نے۔ شہزاد اور فاخرہ احتجاج کرتے ہی رہ گئے۔ اس نے سب کچھ فریج میں ٹھونس دیا۔

اسی دوران میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی اور باتیں کرنے لگی۔ چند سیکنڈ میں ہی شہزاد کو اندازہ ہو گیا کہ فون پر دوسری طرف کون ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ شہزاد کی طرح فاخرہ نے بھی بھانپ لیا تھا اور اس کا رنگ زرد نظر آنے لگا تھا۔ وہ شارق سے بات کر رہی تھی۔

اس نے بڑی بے خوفی سے شارق کو بتایا کہ وہ ہوٹل میں فاخرہ، شہزاد اور بچوں کے پاس ہے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے دو چار دن یہیں رہنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دوسری طرف سے شارق نے گرجنا برسنا شروع کر دیا ہوگا۔ عینی کے تاثرات میں کسی طرح کی کمزوری نظر نہیں آئی، بلکہ ایک طرح کی طیش آمیز تمتماہٹ نے اس کے نقوش کو ڈھانپ لیا۔ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''ماموں! میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں کہ آپ مجھے یہاں سے اٹھا کر لے جائیں گے۔ میں اپنے نفع نقصان کی خود ذمے دار ہوں اور مجھے آپ کی کسی ایڈوائس کی ضرورت بھی نہیں ہے، آپ اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں تو بہتر ہے۔''

دوسری جانب شارق بہت زور سے بولا۔ موبائل کی اسپیکر سے اس کی آواز نکل کر قریب بیٹھے شہزاد کے کانوں تک پہنچی۔ ''عینی! میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔ جانتی ہو کہ تم کس سے بات کر رہی ہو۔ جانتی ہو تم؟''

''میں اچھی طرح جانتی ہوں لیکن آپ نہیں جانتے کہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں اور کہاں کر رہے ہیں۔ یہ لاہور نہیں پیرس ہے اور میں ایک بالغ لڑکی ہوں، میں اپنی مرضی سے یہاں موجود ہوں اور جب تک مناسب سمجھوں گی یہاں رہوں گی۔ میرے ساتھ زبردستی نہیں کی جاسکتی۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں تم کیسے رہتی ہو یہاں۔ میں آ رہا ہوں۔'' شارق کی نہایت دھمکی آمیز آواز سنائی دی۔

''یہ غلطی نہ کرنا ماموں۔ بات بہت بڑھ جائے گی۔'' عینی نے کھٹاک سے جواب دیا۔ ''میں پولیس کو فون کر رہی ہوں۔ آپ کے تشریف لانے سے پہلے یہاں پولیس موجود

ہو گی۔''

''اچھا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے، تم ہتھکڑیاں لگواؤ گی مجھے؟ ہتھکڑیاں لگواؤ گی؟''

''اگر آپ باز نہیں آئیں گے تو یہ بھی ہوگا۔ یہاں قانون سب کے لیے ایک جیسا ہے۔'' عینی کا لہجہ اٹل تھا۔

شہزاد نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر اسے روکنا چاہا لیکن وہ بپھرے ہوئے رواں دواں لہجے میں بولتی چلی گئی۔

اندازہ ہوا کہ دوسری طرف شارق قدرے ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ وہ بہت شعلہ مزاج تھا۔ خاندان میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی مگر آج اس کو ٹکر کے جواب ملے تھے۔ وہ قہربار لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے عینی! میں پہلے تیرے باپ سے بات کر لوں، پھر دیکھ لیتا ہوں تجھے......'' اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔

''عینی یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔'' شہزاد نے کراہ کر کہا۔ ''یہ نہ ہو کہ شارق کوئی ایسا ویسا قدم اٹھا لے۔''

وہ بڑے سکون سے بولی۔ ''کچھ نہیں ہوگا مائی لارڈ۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ یہ فرانس ہے۔ یہاں کسی کے بنیادی حقوق سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا مطلب سیدھی سیدھی جیل ہے۔''

''لیکن ہمیں یہیں تو نہیں بیٹھے رہنا، پاکستان بھی تو جانا ہے اور شارق کو... بھی وہیں ہونا ہے۔ وہاں آ کر تمہاری یہ فرانسیسی گورنمنٹ ہمارا کیا سنوار لے گی۔ بہتر ہے کہ ہم اس معاملے کو اور زیادہ خراب نہ کریں۔'' شہزاد کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

''دیکھیں، میں ہوں ناں۔ میرے ہوتے آپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے، میں ابھی پاپا سے بھی بات کر لیتی ہوں، آپ بالکل ''ریلیکس'' ہو جائیں۔''

ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ عینی کا موبائل پھر جاگ اٹھا۔ اس مرتبہ اس کے پاپا یعنی جمیل صاحب کا ہی فون تھا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے ''ہائے پاپا جانی'' کہا اور ان سے بات کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ بات کرتے کرتے باہر کوریڈور میں ٹہلنے لگی۔ کچھ دیر بعد شہزاد نے کھڑکی سے دیکھا۔ عینی کی آواز تو شہزاد کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی تاہم اس کے انداز اور ہاتھوں کی حرکات وغیرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بڑے اعتماد سے بات کر رہی ہے۔

پانچ چھ منٹ بعد وہ بات ختم کر کے واپس سویٹ میں آ گئی۔ اس کے گال ہلکے گلابی ہو رہے تھے اور بولتی آنکھوں میں اطمینان کی چمک تھی۔ ''کیا بات ہوئی؟'' فاخرہ نے پوچھا۔

''بس ہو گئی ناں آنٹی...... میں نے ان کو سمجھا دیا ہے۔ پاپا میری کوئی بات نہیں ٹال سکتے۔ ہی از اے ویری ویری نائس گائے۔''

شہزاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، بہرحال عینی کا اعتماد دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ غالباً فوری طور پر کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔

رات کو جب بچے ٹی وی دیکھ رہے تھے اور فاخرہ ساتھ والے کمرے میں سوئی پڑی تھی، عینی نے خود ہی شہزاد کے سر کی پٹیاں بدلیں۔ بینڈیج کا یہ سامان ڈاکٹری نسخے کے مطابق وہ شام کو ہی میڈیکل اسٹور سے لے آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے اور زارا نے فرسٹ ایڈ کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہوئی ہے۔ اس حوالے سے ان دونوں کے پاس کئی سرٹیفکیٹس بھی ہیں۔

جب وہ پٹی بدل رہی تھی۔ شہزاد نے پوچھا۔ ''پاپا سے کیا بات ہوئی تمہاری؟''

''کوئی خاص نہیں، بس میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں یہاں آپ لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، کیونکہ آپ کو میری ضرورت ہے۔''

''اور انہوں نے مان لیا؟ حالانکہ وہ جانتے بھی ہوں گے کہ شارق نے کیا ہنگامہ مچایا ہے۔''

''میں نے کہا ہے ناں کہ وہ میری کوئی بات نہیں ٹال سکتے۔'' پھر ایکدم ہنستے ہوئے بولی۔ ''میں تو یہ بھی کہہ دوں ناں کہ آنٹی میری گرل فرینڈ اور آپ میرے فرینڈ ہیں تو، انہیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

شہزاد سٹپٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ قد آدم ٹیبل لیمپ کی دودھیا روشنی اس کے بائیں رخ کو روشن کر رہی تھی۔ لمبے گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ماں باپ دونوں پاکستانی تھے لیکن وہ یہیں کی پیدائش تھی۔ اس کی رگوں میں تو فرنچ خون شامل نہیں تھا لیکن اس کے خدوخال اور انداز میں ''فرانسیسیت'' سرایت کر چکی تھی۔ اس کی اردو زبان میں بھی فرانسیسی آہنگ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ شہزاد اس کی اوٹ پٹانگ بات کے بارے میں کچھ کہتا وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس دن میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ میرے پاس ایک ویٹو پاور ہے۔ اس پاور کے سامنے ماما...... بگ سسٹر...... برادران لا وغیرہ کوئی نہیں ٹھہر

سکتا۔ یہ پاور پاپا جانی کی ہے۔ وہ میری ہر بات کھلے دل دماغ کے ساتھ سنتے ہیں اور مانتے ہیں۔ وہ بس ایک ہی بات کہتے ہیں...... تم جیسی سچی لڑکی کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتی۔ وہ مجھ پر بے حد ''کانفی ڈینس'' رکھتے ہیں۔''

''تمہارا اپنا کیا خیال ہے، تم ایک سچی لڑکی ہو؟''

''سچی کا تو پتا نہیں لیکن اسٹریٹ فارورڈ ضرور ہوں، کوشش کرتی ہوں کہ جو کچھ میرے دل دماغ میں ہے وہی کچھ میری زبان پر ہو اور وہی کچھ میرے عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہو۔ میں نے اس خیال کو ایک جگہ نظم بھی کیا ہے۔ سناؤں آپ کو؟''

شہزاد نے دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ اسے زارا کی سخت وارننگ یاد آ گئی تھی کہ عینی سے کچھ سنانے کی فرمائش نہ کیجیے گا ورنہ یہ گھنٹوں آپ کا دماغ چاٹے گی۔ وہ بھی بھانپ گئی اور بات کا رخ پھر اپنے پاپا جانی کی طرف پھیر لیا۔ ''میں نے اپنی ویٹو پاور کئی جگہ استعمال کی ہے اور ہر بار پوری طرح کامیاب ہوئی ہوں۔ آخری دفعہ تو اس پریکٹس نے زبردست مزہ دیا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا تھا؟'' شہزاد نے مجبوراً پوچھ لیا۔

وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ''ایک لڑکا تھا نجیب واحدی نام کا۔ باپ پاکستانی تھا ماں فرنچ تھی۔ یہ لوگ کراچی کے قریب کاٹھیاواڑ میں چمڑے کا کاروبار کرتے تھے...... کاٹھیاواڑ ہی نام ہے ناں......؟'' اس نے اپنی ہی قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہاں "Auxerre" میں بھی یہ لوگ بیس پچیس سال سے ''لیدر گارمنٹس'' کا کام ہی کر رہے ہیں۔ پکے کاروباری ہیں۔ لڑکا بھی باپ کے ساتھ بزنس میں شریک ہے۔ برادران لاؑ (ریحان) سے ان کی جان پہچان تھی۔ بس وہ میرے گلے ڈالنے کے لیے اس لڑکے کو یہاں پیرس میں لے آئے۔ برادران لاؑ یعنی ریحان بھائی نے ماما اور بگ سسٹر کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ لڑکا مستقبل میں میرے لیے اچھا شوہر ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ یہ میری زندگی کا معاملہ ہے، اس کے بارے میں میں خود فیصلہ کروں گی۔ پہلے اس لڑکے کے ساتھ دوستی کروں گی، اس کے ساتھ گھوموں پھروں گی، پھر کسی رزلٹ پر پہنچوں گی۔ دیکھنے میں تو وہ اچھا لگتا تھا۔ ایک سال یونیورسٹی میں بھی گیا تھا...... مگر جب میں نے اس سے میل جول شروع کیا تو مجھے پتا چلا کہ بھائی صاحب خالص بزنس مائنڈڈ رکھتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی کیا ہوتی، انہیں ٹھیک سے پتا ہی نہیں تھا کہ فنونِ لطیفہ کیا ہوتے ہیں۔ میری انگلش پوئٹری پر بغیر سمجھے واہ واہ کرتا رہتا تھا۔ کیٹس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ شاید وہ کوئی فٹ بال کا کھلاڑی ہے، شیکسپیئر کو اسٹیج ایکٹر سمجھتا تھا، شیلے اس کے نزدیک کسی آسٹریلین پھل کا نام تھا۔ اب بتائیں جی، میں کسی ایسے ڈفر کے ساتھ اپنی لائف تباہ کر سکتی تھی۔ بے شک اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں لیکن اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ وہ میرے حساب سے باذوق نہیں تھا۔ پوری فیملی نے انگیج منٹ کے لیے بڑا زور لگایا۔ مجھے منانے کے لیے پاکستان سے نانا جہانگیر کی خدمات بھی حاصل کی گئیں لیکن میں نے بالکل کورا سا جواب دے دیا۔ اس کے دیے ہوئے تحفے وغیرہ واپس کر دیے اور جو دو چار میں نے دیے تھے ان کی واپسی کا بھرپور مطالبہ کر دیا۔ معاملے نے کچھ طول کھینچا لیکن آخر جیت میری ہی ہوئی۔ پتا ہے کیسے؟''

''کیسے؟''

''پاپا کے ویٹو سے۔ پاپا کو جب میری بات سمجھ میں آ گئی تو انہوں نے اس معاملے کو یکسر ختم کر دیا۔ وہ سمجھ گئے کہ میں اس چمڑا فروش کے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گی۔''

''تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم میں لاابالی پن بہت ہے۔''

''آپ کی طرح آرٹسٹ جو ہوں۔ کیا آپ میں لاابالی پن نہیں؟''

''مجھ میں کیا ہے؟''

''آپ نے اسٹل فوٹوگرافی پر جو کتاب لکھی ہے اس کے دیباچے میں کیا لکھا ہے آپ نے...... شروع میں آپ کو کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا کریں۔ جب آپ بہاولپور کے قریب ایک چھوٹے قصبے میں رہتے تھے تو آپ نے دو تین سال میں مستقبل کے درجنوں منصوبے بنائے اور بگاڑے۔ ایک دفعہ آپ نے وحید مراد سے متاثر ہو کر فلمی اداکار بننے کا فیصلہ کر لیا اور ایک مرتبہ آپ کی ساری توجہ جدید انداز میں کاشتکاری کی طرف چلی گئی۔ اب دیکھیں کہاں اداکاری، کہاں ٹریکٹر چلانا اور کہاں ایڈورٹائزنگ......''

''اچھا بھئی! میں ہارا۔ تم سے باتوں میں مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔''

''ہار جیت کی بات نہیں ہے مائی لارڈ! میں تو یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ فن کار میں تھوڑی سی متلون مزاجی تو ہوتی ہی ہے۔''

''یعنی تم خود کو آرٹسٹ ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہو۔''

''نہیں مائی لارڈ۔ عدالت غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہے۔ میں خود کو آرٹسٹ کلیم نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو آرٹسٹ بننا چاہتی ہوں۔ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ آپ مجھے اپنا شاگرد بنائیں...... بلکہ...... بلکہ پکا پکا شاگرد۔''

پکا پکا شاگرد کہنے کے بعد ایک دم اس کا چہرہ سرخ ہوا اور پھر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکنے کی کوشش کی۔ پھر یہی کوشش کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

شہزاد کو ہنسی کے اس حملے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی اور یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ایک دن پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ ڈیڑھ دو منٹ تک ہنس ہنس کر دہری ہوتی رہی تھی۔ عجیب معما سی لڑکی تھی اور بے حد بولڈ بھی۔ شہزاد کو اس سے خوف آنے لگا تھا۔

اگلے اڑتالیس گھنٹے میں عینی ان سب کو گھر کا ایک فرد ہی محسوس ہونے لگی۔ وہ فاخرہ کا اتنا خیال رکھ رہی تھی کہ شہزاد اس کی طرف سے تقریباً بے فکر ہی ہو گیا تھا۔ وہ خود ہی بازار سے ایک خاص قسم کی چپکنے والی میڈیکل پٹی لے کر آئی تھی۔ یہ پٹی اس نے بڑی چابکدستی سے فاخرہ کی مڑی ہوئی کلائی کے گرد لپیٹ دی تھی۔ اس سے فاخرہ کو کافی افاقہ ہوا تھا۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ بے حد مانوس ہو گئے تھے۔

تیسرے روز شام کو عینی کے پاپا جمیل احمد صاحب کا فون ہوٹل کی لینڈ لائن پر آ گیا۔ شہزاد نے ان سے بات کی۔ جمیل احمد صاحب نے کہا کہ انہیں ہوٹل والے واقعے کا بڑا افسوس ہوا ہے۔ انہوں نے شارق کو بے حد غیر ذمے دار اور احمق قرار دیا۔ انہوں نے کہا۔ ''عینی نے اس کے ساتھ جس طرح سے بات کی ہے اسے ایسی ہی کرنی چاہیے تھی۔ وہ اسی لائق ہے۔ اچھا ہے کہ جلدی دفع ہو گیا یہاں سے...... ورنہ اس پر مار پیٹ کا کیس بن سکتا تھا۔''

''کہاں گیا ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''سنا ہے واپس لندن چلا گیا ہے۔ وہاں سات آٹھ روز رہ کر پاکستان پہنچ جائے گا۔ اپنی بہن سے بھی تلخ کلامی کر کے گیا ہے۔ اس کی فطرت ہی ایسی ہے۔ خود خوش ہو سکتا ہے نہ کسی کو دیکھ سکتا ہے۔''

شہزاد نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ڈرنک بھی کافی کرتا ہے، میرے ساتھ جھگڑے کے وقت بھی وہ نشے میں تھا۔''

''یہ تو تمہاری مہربانی ہے کہ تم نے اسپتال میں اس کا نام نہیں لیا ورنہ یہاں تو ایک وزیر بھی پچھلے دنوں بالکل اسی طرح کے واقعے میں جیل پہنچا ہے۔ یہاں رو رعایت کسی کے لیے نہیں ہے۔ وزیر صاحب بھی عام قیدیوں کے ساتھ جیل میں پڑے ہیں۔''

''ہاں...... پچھلے دنوں میں نے یہ نیوز دیکھی تھی اور حیران بھی ہوا تھا۔''

''تمہیں بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ عینی نے مشکل وقت میں تم لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑا۔ ہوٹل کے کمرے کا جو تھوڑا بہت نقصان ہوا تھا اس کی ادائی میں نے اپنے اکاؤنٹ سے بذریعہ نیٹ کر دی ہے۔ یہ معاملہ ''سیٹل'' ہو گیا ہے اگر طبیعت اب بہتر ہے تو بے فکری سے گھومو پھرو اور انجوائے کرو، پیرس جیسے شہر میں آ کر کمرے میں بند ہو جانا بڑی زیادتی ہے۔ ذرا عینی کو فون دو۔ میں اسے بتا دیتا ہوں کہ آپ کو کہاں کہاں جانا چاہیے۔''

اس سے پہلے کہ شہزاد کوئی جواز پیش کرتا، عینی نے خود ہی ریسیور شہزاد کے ہاتھ سے لے لیا...... اور پاپا جانی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔

اگلے روز صبح سویرے عینی نے بچوں کو اکسایا اور انہوں نے ایک قریبی تفریحی پارک میں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ ایسے معاملوں میں بڑی چابک دست تھی، اسے معلوم تھا کہ بچوں کا پروگرام بن جائے گا تو پھر فاخرہ اور شہزاد کو بھی تیار کرنا آسان ہو گا، اس نے ایک گھنٹے کے اندر اندر اس تفریحی پارک کے ان گنت فضائل بیان کر دیے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شانز الیزے روڈ یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور وہ بہ آسانی واک کرتے ہوئے وہاں پہنچ سکتے تھے۔ فاخرہ نے حسب معمول جانے سے انکار کیا لیکن اس مرتبہ عینی بھی اڑ گئی۔ اس نے کہا کہ اگر آنٹی فاخرہ نہیں جائیں گی تو پھر یہ پروگرام کینسل۔

پارک کے جو فضائل عینی نے بیان کیے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پروگرام کینسل ہونے کے آثار دیکھ کر بچوں نے ٹھنکنا اور منہ بسورنا شروع کر دیا۔ وہ بھی غالباً یہی چاہتی تھی۔ مجبوراً فاخرہ کو کمر ہمت باندھنی پڑی۔ عینی نے دو چار منٹ کے اندر فاخرہ کے لیے ہوٹل سے ہی وہیل چیئر کا انتظام کر لیا۔ استقبالیہ والوں نے کال کر کے ٹیکسی منگوا لی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بذریعہ لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچے اور پھر شاندار ٹیکسی کار میں سوار ہو گئے۔ پاکستان میں شہزاد جب بھی سنتا تھا کہ فلاں پاکستانی اٹلی، جرمنی، فرانس یا یورپ کے کسی اور ملک میں ٹیکسی چلاتا ہے تو ذہن میں ایک غریب مسکین ٹیکسی ڈرائیور کا تصور ابھرتا تھا مگر یہاں آ کر یہ تصور کافی حد تک دھندلا گیا۔ اول تو ''ٹیکسیاں'' جدید آلات سے لیس نہایت لگژری قسم کی گاڑیاں تھیں۔ دوسرے ڈرائیور خواتین و حضرات بھی ٹھاٹ

بات والے تھے۔ مسافر سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ مسافر کے سامان کو بار کرنا تو دور کی بات ہے اسے ہاتھ لگانا بھی وہ شاید توہین سمجھتے تھے۔ ٹیکسی کاروں کے بیش بہا کرائے بھی ٹیکسی ڈرائیوروں کی شان میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔

وہ لوگ ٹیکسی میں سوار ہو کر آٹھ دس منٹ کے اندر تفریحی پارک پہنچ گئے۔ اس آٹھ دس منٹ کے سفر کے عوض انہیں قریباً تین ہزار پاکستانی روپے ڈرائیور صاحب کی نذر کرنا پڑے۔ ایک مرتبہ پھر عینی نے شہزاد کی کوئی پیش نہیں چلنے دی اور کرایہ خود ادا کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فاخرہ اور شہزاد سے عہد بھی لیا کہ وہ ایک مہمان کی حیثیت سے اپنی حدود کا خیال رکھیں گے اور جب بھی اس کے ساتھ کہیں جائیں گے تو اپنی جیب سے کچھ خرچ نہیں کریں گے۔

یہ زیادہ بڑا تفریحی پارک نہیں تھا۔ بڑے تفریحی پارک ڈزنی لینڈ اور پارک ایس ٹیرکس وغیرہ شہر سے کافی باہر تھے۔ بہرحال یہاں بھی بچوں کے کھیل تماشے کا کافی سامان موجود تھا۔ پارک کا ٹکٹ ایک ہی دفعہ وصول کرلیا جاتا تھا، اندر داخل ہونے کے بعد ساری تفریحات اور جھولے وغیرہ فری تھے۔ فاخرہ اور شہزاد تو ایک جگہ چمکیلی گھاس پر MAT بچھا کر بیٹھ گئے۔ عینی بھاگ بھاگ کر بچوں کو مختلف جھولوں پر سوار کرانے اور اتارنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی اور آواز میں چہکار تھی۔ بچے بھی اس کی کمپنی میں بے حد انجوائے کر رہے تھے۔ وہ شہزاد اور فاخرہ کو جیسے بھول ہی گئے تھے۔

یہ بھی پیرس کا ایک نہایت چمک دار اور خوشگوار دن تھا۔ پارک میں قریباً دو گھنٹے گزارنے کے بعد وہ باہر آ گئے...... اور پیدل ہی شانزالیزے روڈ کی طرف چل دیے۔ یہ ویک اینڈ تھا اس لیے ہر طرف رونق تھی۔ سیاحوں کی ٹولیاں گلی کوچوں میں چکرا رہی تھیں۔ اپنے سر کے زخم چھپانے کے لیے شہزاد نے ایک پی کیپ پہن رکھی تھی۔ عینی ہلکے پھلکے انداز میں اس پی کیپ کو مسلسل تنقید کا نشانہ بنا رہی تھی۔

”آخر یہ تمہیں کیا تکلیف دے رہی ہے؟“ شہزاد نے کہا۔

”مجھے اس پر دو اعتراضات ہیں مائی لارڈ۔ پہلی بات تو یہ کہ بندہ جیسا ہے اسے ویسا ہی نظر آنا چاہیے۔ آپ کے سر پر ایک دو چوٹیں لگی ہوئی ہیں اور آپ اس کیپ کے ذریعے انہیں چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یعنی آپ جیسے ہیں ویسے نظر آنا نہیں چاہ رہے۔ میرے خیال میں تو یہ فیئر نہیں ہے۔“

”اور دوسری بات؟“

”دوسری بات یہ کہ آپ مائی لارڈ ہیں اور مائی لارڈ نے اس ٹی وی سیریل میں کہیں بھی اس طرح کی ٹوپی نہیں پہنی۔ اس ٹوپی کی وجہ سے میرا تصور درہم برہم ہو رہا ہے۔“

”دیکھو بھئی، یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ اس ٹی وی سیریل میں کسی شخص نے مائی لارڈ کے سر پر ٹوٹے ہوئے لیمپ سے حملہ نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ ممکن ہے کہ وہ بھی ٹوپی پہن لیتے اور میری ہی طرح نظر آتے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ بچے بھی ہنسنے لگے۔

اس کے یوں ہنسنے سے شہزاد کو پھر اس کی ترسوں رات والی رواں دواں ہنسی یاد آ گئی...... اس پر دو دفعہ ہنسی کا ایسا حملہ ہوا تھا اور دونوں مواقع وہ تھے جب اس نے شہزاد کی شاگرد بننے کی بات کی تھی۔ یہ گتھی ابھی تک سلجھی نہیں تھی۔

وہ پیرس کی مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے معروف مشہور روڈ شانزالیزے پر پہنچے تو انہیں یوں لگا جیسے وہ چھوٹے چھوٹے آبی راستوں پر سفر کرتے کرتے اچانک ایک بہت بڑے لہریں مارتے دریا میں پہنچ گئے ہیں۔ اس سڑک کی وسعت، رونق اور خوبصورتی سب سے جدا نظر آئی...... بہت سی دیگر شاہراہوں کی طرح یہ بھی پتھر کے ہموار ٹکڑوں سے بنی ہوئی تھی۔ بسیں کاریں اور دیگر گاڑیاں اس پر سے کچھ تھرتھراتی ہوئی گزرتی تھیں۔ ریستورانوں میں اور فٹ پاتھوں پر دوپہر کا کھانا کھانے والوں کا اژدھام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس میں پانی کم اور شراب زیادہ پی جاتی ہے۔ پتا نہیں کہ یہ موازنہ کس طرح کیا جاتا ہے کیونکہ شہزاد کو تو کہیں پانی نظر ہی نہیں آیا۔

فاخرہ وہیل چیئر پر تھی اور وہیل چیئر مسلسل عینی نے ہی تھامی ہوئی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ فاخرہ کو مختلف مقامات کے بارے میں بتا بھی رہی تھی۔ فلاں رومانی ناول کی اطالوی ہیروئن اس ریستوران میں آ کر بیٹھتی تھی۔ ہالی وڈ کی فلاں مشہور فلم کی شوٹنگ اس چوراہے پر ہوئی تھی، وغیرہ وغیرہ۔ پیرس جدید اور قدیم کا حسین امتزاج ہے اور اس وقت یہ امتزاج اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ ان کے سامنے تھا۔ بلند و بالا ماڈرن عمارتوں کے ساتھ ساتھ روم کی طرز کے آثار قدیمہ بھی جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔

وہ اس شہر کی اور خاص طور سے شانزالیزے کی دلکشی کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اب انہیں کچھ فاصلے پر ایک نہایت بلند و بالا دروازہ نظر آنے لگا تھا۔ عینی نے بتایا کہ یہی آزادی کی محراب ہے۔

ایک گراسی گراؤنڈ میں دھوپ بہت کھل کر برس رہی تھی۔ پھولوں کی رنگ برنگی کیاریاں اس جگہ کی خوبصورتی کو بڑھا رہی تھیں۔ اپنے تھکے ہوئے قدموں کو کچھ دیر آرام دینے کے لیے انہیں یہ جگہ بڑی مناسب لگی اور لوگ بھی یہاں وہاں ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے تھے۔ ایک میوزیکل گروپ کے سیاہ فام ارکان موسیقی بکھیر رہے تھے اور لوگ ان کے سامنے رکھی ٹوپیوں میں سکے ڈال رہے تھے۔ شہزاد اور عینی نے بھی ایک جگہ چٹائی بچھائی اور ڈیرہ جما لیا۔ احسن ہینڈی کیم سے مووی بنانے لگا۔ عمیر نے فوٹو گرافی شروع کر دی۔

اسی دوران میں عمیر کی نگاہ چوراہے کی طرف گئی۔ وہاں لب سڑک ہجوم تھا اور کوئی کھیل تماشا ہو رہا تھا۔ دونوں بچے تماشا دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ عینی اور فاخرہ وہیں بیٹھی رہیں اور شہزاد بچوں کو لے کر ہجوم والی جگہ کی طرف چلا گیا۔ یہ جگہ آزادی کی محراب کے بالکل سامنے تھی۔ یہاں میلے کا سا سماں تھا۔ تین سیاہ فام لڑکے بریک ڈانس کر رہے تھے۔ درجنوں لوگ ان کے اردگرد کھڑے تالیاں بجا رہے تھے۔ دوسری طرف کچھ نوجوان رقص آمیز بازی گری میں مصروف تھے۔ ان میں دو خواتین بھی تھیں۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے انجوائے کر رہے تھے اور اپنا نذرانہ عقیدت سامنے رکھی ٹوپیوں میں ڈالتے جا رہے تھے۔ پھر تماشائیوں میں سے کچھ حوصلہ مند بچے بھی بریک ڈانس میں شریک ہو گئے۔ تماشائیوں کی دلچسپی بڑھ گئی۔ شانزالیزے کے اس نہایت وسیع اور پرشکوہ چوراہے میں یہ کھیل کود بے حد روایتی اور دلکش تھے۔ شہزاد ان میں کھو گیا...... اور ان لمحوں میں اس سنگین معاملے کو تقریباً تقریباً بھول گیا جو صرف پانچ چھ دن پہلے اس کے اور شارق کے درمیان پیش آیا تھا اور جس کی ایک نشانی ”پی کیپ“ کی صورت میں اس کے سر پر موجود تھی۔

تماشے کے دوران وہ فاخرہ اور عینی کی طرف بھی گاہے بگاہے نگاہ دوڑا لیتا تھا۔ وہ قریباً ڈیڑھ سو میٹر دور سبز گھاس کے اوپر بچھی سرخ چٹائی پر بیٹھی تھیں۔ عینی بڑی محبت سے فاخرہ کی پنڈلیاں دبا رہی تھی، ساتھ ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہی تھی۔ عینی کو دیکھ کر یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ برسوں سے ان کے ساتھ رہ رہی ہے۔

قریباً آدھ پون گھنٹے بعد وہ فاخرہ اور عینی کے پاس واپس لوٹے، تو عینی بڑی بے تکلفی سے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

”کیا کوئی جوک سنایا گیا ہے؟“ شہزاد نے پوچھا۔

”جوک نہیں جی، بہت سنجیدہ بات ہے۔“ عینی چہکی۔

”میں نے اور آنٹی فاخرہ نے آج ایک فیصلہ کرلیا ہے......“

”کہ آج ہمیں کھانے کو کچھ نہیں دیں گی اور ایسے ہی باتیں بناتی رہیں گی۔“ عمیر نے اس کی بات اچکی۔

”الو بائے! تمہیں کھانے کے سوا اور کوئی بات نہیں آتی۔ ہم ایک اہم مسئلے پر بات کر رہے ہیں۔ تم ذرا گراؤنڈ میں تھوڑی سی بھاگ دوڑ کرو تاکہ بھوک اور اچھی طرح لگ جائے، پھر تمہیں بڑے شاندار سینڈوچ کھلاتے ہیں۔“

بچے واقعی بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ عینی کھلکھلاتے لہجے میں بولی۔ ”تو مائی لارڈ ہم نے طے کیا ہے کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی پاکستان جاؤں گی۔ وہاں ہم سب اکٹھے رہیں گے، میں دن رات آنٹی کی خدمت کروں گی اور بدلے میں آنٹی مجھے اپنی محبت بھری باتوں سے خوش کریں گی۔ یہی خوشی وہ چیز ہے جو یہاں ہمارے یورپ میں ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں افراتفری کے سوا اور کچھ نہیں ہے می لارڈ! یوں لگتا ہے کہ ہم سب مشینیں ہیں اور ویک اینڈز کی تھوڑی سی فراغت کے لالچ میں دھڑا دھڑ چل رہی ہیں۔ بس ویک اینڈز...... اور کچھ نہیں۔ میں اب ذرا اور طرح سے جینا چاہ رہی ہوں می لارڈ......“ اس نے کسی مقرر کی طرح ہاتھ لہرایا۔

”اور اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ شہزاد بھی زیر لب مسکرایا۔

”آپ کو کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ ہم نے سب طے کرلیا ہے۔ بس آپ کو زیادہ سے زیادہ دو لفظ بولنے ہوں گے...... تین دفعہ۔“

”تین دفعہ؟ کیسے لفظ؟“

”قبول ہے...... قبول ہے......قبول ہے۔“

”کس کے لیے؟“ شہزاد نے حیران ہو کر پوچھا۔

”میرے لیے اور کس کے لیے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”ہم دونوں کی میرج ہو جائے گی اور بس سارے راستے سیدھے ہو جائیں گے، ہم تینوں، دونوں بچونگڑوں کو ساتھ لے کر سنڈے کے سنڈے کلفٹن پر پکنک منانے جایا کریں گے...... اور قیمے والے پراٹھے کھایا کریں گے۔ قیمہ اچھا لگتا ہے نا آپ کو؟“

شہزاد چکرا کر رہ گیا۔ ”یہ کیا الٹی سیدھی ہانک رہی ہو۔“ وہ بے حد حیرت سے بولا۔ فاخرہ زیر لب مسکرائے جا رہی تھی۔

''الٹی سیدھی نہیں...... سیدھی سیدھی ہانک رہی ہوں مِی لارڈ...... کیا آپ کو قیمہ اچھا نہیں لگتا۔ آپ کو میرے سر کی قسم...... سچ سچ بتائیں۔''

''مجھے تمہارے سر کی قسم، میں سچ سچ بتا رہا ہوں۔ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔'' شہزاد نے اسٹیل کا وزنی ٹفن اٹھایا تو وہ ''نونو'' کا شور مچاتی الٹے پاؤں پیچھے کو دوڑی اور بچوں کے پاس پہنچ گئی۔

''بڑی شرارتی ہے۔'' فاخرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور بے ہودہ بھی۔ یہ یہاں کے رہن سہن کا اثر ہے۔'' شہزاد نے برا سا منہ بنایا۔

''ویسے ایک بات ہے شہزاد! آپ کی دل سے عزت کرتی ہے، بڑا مانتی ہے آپ کو اور آپ کے کام کو۔ آپ کی بنائی ہوئی بہت سی تصویروں کے پرنٹ اس کے پاس موجود ہیں...... انہیں بڑے فخر سے اپنے دوستوں، عزیزوں کو دکھاتی ہے۔ ابھی پتا ہے کیا کہہ رہی تھی؟'' شہزاد سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ فاخرہ بولی۔ ''ایک نیا نکتہ نکال رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ پچیس برس پہلے نانا جہانگیر نے اپنی مرضی کے لیے آپ کو نجمہ خالہ کا بھانجا بنا دیا تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اب آپ اس کے خالہ زاد بھائی ہیں اور خالہ زاد بھائی سے بے تکلف ہوا جا سکتا ہے۔''

وہ دونوں اس کی عجیب وغریب بے باک شخصیت کے بارے میں بات کرتے رہے۔ وہ بچوں کو لے کر وہیں اس جگہ پر پہنچ گئی تھی جہاں کھیل تماشے ہو رہے تھے اور میوزک کی دھنا دھن گونج رہی تھی۔ عظیم الشان محراب پر چڑھے ہوئے لوگ نیچے سے بونوں کی طرح نظر آتے تھے۔ یقیناً اوپر والوں کو نیچے والے بونے نظر آتے ہوں گے۔ شاید زیادہ پستی کی طرح زیادہ بلندی بھی انسان کے قد وقامت کو کم کر دیتی ہے۔

شہزاد نے کہا۔ ''مجھے اس سارے معاملے سے ڈر سا لگ رہا ہے سونم! یہ یہاں کے ماحول میں پرورش پائی ہوئی لڑکی ہے۔ اس کے اور ہمارے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم نے دیکھا ہی تھا اس دن وہ خبیث شارق کس طرح کی بکواس کر کے گیا تھا۔ اب اگر یہ ہمارے ساتھ رہے گی تو ان لوگوں کو مزید باتیں بنانے کا موقع ملے گا...... میں چاہتا ہوں کہ جس طرح بھی ہو آج شام تک یہ یہاں سے چلی جائے......''

''آج شام تو یہ کسی صورت نہیں جائے گی۔''

''وہ کیوں؟''

''اسے پتا ہے کہ آج احسن کی سالگرہ ہے۔ یہ اس کے لیے گفٹ وغیرہ بھی لے کر آئی ہوئی ہے۔''

''بہرحال، اسے کل تک چلے جانا چاہیے سونم۔'' شہزاد کا لہجہ حتمی تھا۔

شام کو ہوٹل کے سویٹ میں ہی احسن کی سالگرہ منائی گئی۔ عینی بضد تھی کہ ماما، بگ سسٹر زارا اور ریحان وغیرہ کو بھی بلائے گی لیکن شہزاد نے منع کر دیا۔ یہاں شارق کی وجہ سے جو بدمزگی پیدا ہو چکی تھی اس کے بعد کسی ایسی ''گیدرنگ'' کا کوئی جواز نہیں تھا۔ احسن کی دسویں سالگرہ کا چھوٹا سا کیک کاٹا گیا اور مزیدار ترکش ڈنر کیا گیا۔ عینی نے احسن کو ایک زبردست وڈیو گیم کا تحفہ دیا۔ اس کے علاوہ ایک آٹوگراف بک بھی تھی جو بہت قیمتی تھی۔ احسن اس کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ عینی نے کہا۔ ''اس بک پر سب سے پہلا آٹوگراف پتا ہے کس کا لینا ہے؟''

''کس کا؟'' احسن نے پوچھا۔

''اپنے ابو جان کا۔''

احسن ہنسا۔ ''لو ابو جان بھی کوئی مشہور کھلاڑی ہیں۔''

سب مسکرانے لگے۔ عینی بولی۔ ''لو جی اس کو کہتے ہیں گھر کی مرغی دال برابر۔ بچونگڑے آپ کے ابو کوئی ایویں شیویں بندے نہیں ہیں۔ ایک دنیا جانتی مانتی ہے ان کو۔ انہوں نے یادگار تصویریں کھینچی ہوئی ہیں۔ یہاں پیرس میں ہی زیادہ نہیں تو، ڈیڑھ دو ہزار بندے ان کے پرستار ضرور ہوں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم مجھے شدید قسم کی خوش فہمیوں کا شکار کر دوگی۔'' شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''خود کو ''اوور اسٹیمیٹ'' کرنے والا ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔''

''اور ''انڈر اسٹیمیٹ'' کرنے والا بھی۔'' اس نے برجستہ جواب دیا۔

کھانے کے بعد شہزاد اور فاخرہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ بچے اور عینی ٹی وی لاؤنج میں ہلا گلا کرتے رہے۔ میوزک آن تھا، پھر شہزاد کو اندازہ ہوا کہ وہ لوگ رقص کر رہے ہیں...... شہزاد نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا۔ وہ بچوں کے ساتھ بچہ بنی ہوئی تھی۔ وہ شارٹس پہنے ہوئے تھی، پنڈلیاں دو تہائی عریاں تھیں، بالائی جسم پر بھی ہلکی پھلکی شرٹ تھی۔ اس شرٹ کے کشادہ گریبان میں سے اس کا جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا تاہم وہ ایسی باتوں سے قطعی غافل رہتی تھی اور یہ کوئی صرف عینی کی بات ہی نہیں تھی۔ یہاں کا ماحول ہی ایسا تھا۔ شہزاد نے نوجوان لڑکیوں کو ایسی پتلونیں پہنے ہوئے

دیکھا تھا جو پیٹ کو انتہائی زیریں حد تک عریاں رکھتی تھیں، ان پتلونوں کے ساتھ جب انہیں جھکنا پڑتا تھا تو وہ عقب سے عریاں ہونے لگتی تھیں۔

پھر عینی نے رقص کرتے کرتے عمیر کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ وہ بھی الٹے سیدھے قدم اٹھانے لگا۔ رقص کی مشقت سے عینی کے گال شہابی ہونے لگے تھے۔ احسن تالیاں بجا رہا تھا۔ اس دوران میں عینی نے دیکھ لیا کہ شہزاد دروازے میں ہے۔ وہ شوخی سے بولی۔ ''آ جائیں ناں آپ بھی۔'' اس نے تھوڑی دیر کے لیے میوزک بند کر دیا تھا۔

''سوری مجھے ناچنا نہیں آتا۔'' شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا چلیں تالی ہی بجائیں۔''

''ابو بجائیں نا تالی...... پلیز بجائیں نا۔'' بچے ضد کرنے لگے۔

''مجھے تالی بجانی بھی نہیں آتی۔''

اس دوران میں فاخرہ بھی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی دروازے میں آ گئی۔ ''اچھا میں بجاتی ہوں تالی۔'' اس نے کہا۔

عینی نے میوزک پھر آن کیا۔ وہ ایک پاؤں کو ہولے ہولے حرکت دیتی رہی۔ جب میوزک میں مطلوبہ مقام آیا اور گٹار کے ساتھ ڈرم کی سنگت ہوئی اس نے رقص شروع کر دیا۔ اس کا انداز دلکش تھا...... گاہے بگاہے وہ عمیر کو بھی اپنے ساتھ شامل کر رہی تھی۔ احسن اور فاخرہ تالیاں بجا رہے تھے۔ ہوٹل ''لینوتا'' کی چوتھی منزل کی کھڑکیوں سے باہر پیرس کی جگمگاتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں اور دریائے سین پر دھیرے دھیرے چلنے والی روشن کشتیوں کی حرکت بھی کمرے کے اندر سے ہی محسوس کی جا سکتی تھی۔ رقص کے دوران میں تیز حرکات کی وجہ سے اس کے بال جو ربن سے بندھے ہوئے تھے بکھر گئے اور وہ بھی جیسے اس کے ساتھ ہی شریک رقص ہو گئے۔

پھر وہ بڑے انداز سے فاخرہ کی طرف مڑی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ ایک خاص ردھم کے ساتھ فاخرہ کے بازوؤں کو حرکت دینے لگی۔ فاخرہ کرسی پر ہی بیٹھی رہی لیکن یوں لگا کہ وہ بھی اس کے ساتھ رقص میں شریک ہو گئی ہے۔ بچے بھی اس صورتِ حال پر خوش نظر آ رہے تھے۔ فاخرہ کی مضروب کلائی کو اس نے بڑی احتیاط سے کہنی کے پاس سے پکڑا ہوا تھا تاکہ اسے تکلیف نہ ہو۔ میوزک ختم ہوا تو رقص بھی ختم ہو گیا۔ عینی ہانپتی ہوئی ایک صوفے پر گر گئی۔

احسن اس کے اوپر چڑھ گیا اور شوخی میں اس کو گدگدانے لگا۔ وہ لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ اس کا لباس اور بھی بے ترتیب ہو گیا مگر وہ اس صورتحال سے قطعی لاعلم رہتی تھی۔ اسی دوران میں ایک ثانیے کے لیے اس کی نگاہ شہزاد کی نگاہ سے ملی۔ شہزاد کو وہی برقی جھٹکا محسوس ہوا جو اس سے پہلے بھی ہوا کرتا تھا۔ اسے عینی کی آنکھوں میں نجمہ کی آنکھیں دکھائی دیں۔ وہی رنگ، وہی گہرائی وہی معنی خیزی۔ وہ عموماً کوشش کرتا تھا کہ براہ راست عینی کی طرف نہ دیکھے لیکن کبھی کبھار ایسا ہو بھی جاتا تھا جیسے اب ہوا تھا۔ یہاں ایک اور بات بھی قابل غور تھی۔ عینی نے شروع میں دو چار بار شہزاد کو انکل کہا تھا، لیکن اب وہ اسے بڑے تواتر سے مائی لارڈ اور سر جی جیسے خطاب دیتی تھی مگر انکل نہیں کہتی تھی۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔

وہ ان لوگوں کو شور مچاتے چھوڑ کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور ایک کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ اسے پرسوں ایک مقامی لائبریری میں جانا تھا اور ایک فرنچ پروفیسر کے ساتھ مل کر کچھ اسٹوڈنٹس کو ایک لیکچر دینا تھا۔ وہ دیر تک کتاب میں سر کھپاتا رہا لیکن ایک دو نوٹس ہی تیار کر سکا۔ ذہن میں یکسوئی نہیں تھی۔ پردہ تصور پر بار بار وہ دو آنکھیں ابھر آتی تھیں جنہوں نے اٹھائیس تیس سال پہلے اس کے دل ودماغ پر حکمرانی کی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کی زندگی کے ابتدائی بیس پچیس سال انہی آنکھوں کے سنہری طلسم میں گزرے تھے۔ وہ مسکراتی تھیں تو وہ بھی مسکراتا تھا، وہ بھیگتی تھیں تو وہ بھی بھیگ جاتا تھا۔ وہ کچھ کہتی تھیں تو شہزاد چند لمحوں میں سمجھ جاتا تھا۔ ان آنکھوں نے شہزاد کی آنکھوں کے ساتھ مل کر گئے موسموں میں ان گنت سپنے دیکھے تھے...... لاتعداد امیدیں پالی تھیں...... اور پھر یہی آنکھیں تھیں جو دائمی ہجر کو اپنے روبرو دیکھ کر ٹوٹ کر برسی تھیں، خود جل تھل ہوئی تھیں اور شہزاد کو بھی کر گئی تھیں اور پھر یہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے شہزاد کی آنکھوں سے دور ہو گئی تھیں...... لیکن نہیں...... شاید بعد میں ایک اور موقع ایسا آیا تھا جب یہ آنکھیں شہزاد کی آنکھوں سے ملی تھیں اور انہوں نے کچھ کہا تھا...... ہاں ایسا ہوا تھا...... استری شدہ قمیص لے کر اپنے شوہر کے پیچھے لپکتی ہوئی نجمہ سیڑھیوں سے گری تھی اور بستر مرگ پر پہنچ گئی تھی۔ شہزاد نے اسے اسپتال کے سفید براق بستر پر ہی دیکھا تھا۔ کسی ستم گر کی گولی سے شکار ہونے والے سفید ہنس راج کی طرح وہ بے حرکت پڑی، سفید بستر کا حصہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ تب اس کی آنکھیں آخری بار شہزاد کی آنکھوں سے ملی تھیں۔ ان بولتی آنکھوں نے کہا تھا۔

''ہم ہار گئے شہزاد! لیکن ہماری محبت نہیں ہاری، یہ محبت زندہ رہے گی، میں روپ بدل کر آپ سے ملوں گی، نئے موسموں میں...... نئی ہواؤں میں اور نئے کھلنے والے پھولوں میں اور سورج کی روپہلی کرنوں میں ......

شہزاد نے کتاب ایک طرف پھینک دی اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرلیں، وہ کچھ دیر کے لیے غنودگی میں رہا پھر سو گیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس کے پہلو میں فاخرہ سو رہی تھی۔ اس کی بھاری سانسیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ بچے بھی ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو چکے تھے۔ دھیمی آواز میں کوئی کارٹون فلم اب بھی چل رہی تھی۔ شہزاد نوٹس تیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اٹھ کر ٹی وی آف کیا اور وہیں ایک صوفے پر نیم دراز ہو کر کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اس نے محسوس کیا کہ ساتھ والے کمرے میں عینی ابھی تک جاگ رہی ہے۔ اس نے درمیانی پردہ ہٹا کر دیکھا وہ ٹیبل لیمپ کے پاس قالین پر اوندھی لیٹی کچھ لکھ رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''پوئٹری۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

شہزاد پھر اپنی کتاب میں مگن ہو گیا...... ''موجودہ دور میں ایڈورٹائزنگ کا اہم کردار اور اس کے منافع بخش پہلو'' یہ اس کے لیکچر کا موضوع تھا۔ وہ اس موضوع سے Related مواد تلاش کرتا رہا۔

اچانک اس نے محسوس کیا کہ عینی اس کے سرہانے کھڑی ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیپر تھا۔ ''یہ دیکھیے مائی لارڈ، میری تازہ نظم۔''

شہزاد اس کے ہاتھ سے لے کر پڑھنے لگا۔ وہ دوبارہ وہیں جا کر ٹیبل لیمپ کے پاس بیٹھ گئی۔ انگلش میں لکھی ہوئی نظم کا ترجمہ کچھ اس طرح تھا۔

مذاق کیا ہے؟
جھوٹ ہی تو ہے
آج آزادی کی محراب کے سامنے شاہِ بلوط کے پیڑوں کے پاس
گھاس پر سنہری دھوپ کی چادر بچھی تھی
وہی طلسمی دھوپ جو زمین کے اندر
گلِ لالہ کی کونپل کو باہر آنے کی طاقت دیتی ہے
اس دھوپ سے میرے دل میں بھی شرارت کی ایک کونپل پھوٹی
میں نے ایک مذاق کیا۔
اور مذاق کیا ہے؟ ایک جھوٹ ہی تو ہے
لیکن اب جبکہ رات آدھی گزر چکی ہے
پیرس کی روشن آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی ہیں
میں سوچ رہی ہوں
پیرس کی طلسمی دھوپ سے تو صرف پھولوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں
خوشبو اور سچائی پھوٹتی ہے
اس دھوپ سے جھوٹ تو نہیں پھوٹ سکتا
وہ کچھ اور تھا...... ہاں وہ کچھ اور تھا۔ شاید گلِ لالہ کی کونپل تھی۔

نظم ختم کرتے کرتے شہزاد اس کے مفہوم تک پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے رگ و پے میں عجیب سی بے چینی پھیل گئی۔ غالباً عینی نے شاعری کا سہارا لے کر آج دوپہر والے واقعے کا ذکر کیا تھا۔ تب اس نے مذاق کے لہجے میں بڑی بے باکی سے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جسے سن کر فاخرہ بھی ٹھٹک گئی تھی لیکن اب اس نے ڈھٹائی سے اپنے الفاظ کے ذریعے اس مذاق کو سچ کا پہناوا پہنانے کی کوشش کی تھی یعنی یہ صورت حال دوپہر کی صورت حال سے بھی زیادہ سنگین تھی۔

شہزاد نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھا۔ وہ ٹیبل لیمپ کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ روشنی اور آدھا تاریکی میں تھا۔ وہ عجیب انداز سے شہزاد کی طرف دیکھ رہی تھی...... اس نے ایک ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے ٹکایا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ یہ سویا سویا سا انداز بڑا انوکھا تھا۔

''ادھر آؤ عینی۔'' شہزاد نے تحکم سے کہا اور اس کے ساتھ ہی انگلی کی حرکت سے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی شہزاد کے سامنے آئی پھر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی...... ''یہ کیا ہے؟'' شہزاد نے بھنائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نظم ہے جی۔'' وہ سادگی سے بولی۔ اس نے ابھی تک وہی شارٹس اور کھلے گلے کی شرٹ پہن رکھی تھی۔

''یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ نظم ہے لیکن تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہو۔'' شہزاد کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔

''مائی لارڈ! شاعری میں کچھ ثابت تو نہیں کیا جاتا، ثابت تو سائنس میں کیا جاتا ہے۔ شاعری تو خود مانتی ہے کہ اسے کسی چیز کا پتا نہیں۔ وہ تو خود حیران ہوتی ہے، ورڈز ورتھ ایک جگہ لکھتا ہے کہ......''

''ورڈز ورتھ کو گولی مارو۔'' شہزاد نے چیخ کر کہا۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کیوں کر رہی ہو، کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ میرا اور تمہارا رشتہ کیا ہے؟''

شہزاد کے تلخ تر لہجے کو اس نے بڑی آسانی سے جھیلا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہ کچھ سنجیدہ دکھائی دینے لگی۔

پہلے وہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی، پھر اس نے اپنے دونوں گھٹنے اٹھائے اور ان کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ سا قائم کرلیا۔ اس کی ٹھوڑی دائیں گھٹنے کے اوپر ٹک گئی۔ زیرِ لب مسکرا کر بولی۔ ''سچی سچی بتاؤں یا آپ کے ڈر سے گول مول بات کروں؟''

''مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔'' شہزاد کا انداز بدستور خشک تھا۔

''میں بھی آپ کے منہ سے یہی سننا چاہتی تھی۔ ویسے اگر آپ سچ نہ سننا چاہتے تو پھر میں نے آپ کو کچھ نہیں بتانا تھا کیونکہ جھوٹ بولنے سے تو خاموش رہنا بہتر ہوتا ہے۔''

''اچھا...... کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟'' شہزاد نے دیوار سے ٹیک لگائی۔

''لیکن اس سے پہلے میری ایک چھوٹی سی شرط ہے مائی لارڈ۔'' وہ لجاجت سے بولی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ بہت غصے میں ہونے کے باوجود شہزاد نے کوئی سخت بات نہیں کہی۔

''کیا شرط ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ بس معمولی سی شرط...... آپ کو اپنا آٹوگراف دینا ہوگا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' شہزاد کوشش کے باوجود اپنے لہجے کی بیزاری چھپا نہیں پا رہا تھا۔

عینی نے گہری سانس لے کر قالین پر سوئے پڑے عمیر اور احسن کی طرف دیکھا۔ احسن اس کے قریب تھا۔ اس نے احسن کی ٹانگوں پر کمبل درست کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مجھ میں بے شمار خامیاں ہوں گی جی...... اور کچھ ایسی خامیاں ہیں جن کو میں خود بری طرح محسوس کرتی ہوں لیکن ایک بات میں پورے اعتماد سے کہہ سکتی ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بولتی اور کوشش کرتی ہوں کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی زبان پر بھی ہو اور وہی میرے کاموں سے بھی ظاہر ہو۔ اب مجھے نہیں پتا کہ جو کچھ میں آپ سے کہوں گی وہ آپ کو اچھا لگے گا یا برا لیکن یہ ہے سو فیصد سچ۔ آپ نے ابھی رشتے کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ میں اپنے اور آپ کے رشتے کو نہیں پہچانتی۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے میں واقعی نہیں پہچانتی۔ میں جس رشتے کو پہچانتی ہوں وہ کوئی اور ہے۔''

''عینی جو کہنا ہے کھل کر کہو۔ میں سن رہا ہوں۔'' شہزاد کی آواز سپاٹ تھی۔

''آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ آپ کا اٹھنا بیٹھنا، ہنسنا، بولنا، ہر چیز...... اور اس سے بڑھ کر آپ کا کام۔ میں ان چند دنوں میں ہی آپ کو اپنے دل کے بے حد پاس محسوس کرنے لگی ہوں۔ مجھے زندگی میں کبھی غصہ نہیں آیا لیکن جب شارق ماموں نے آپ کو یہاں اس کمرے میں چوٹیں لگائیں تو مجھے اتنا غصہ آیا کہ اگر میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوتا تو شاید...... شاید......'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہو گئی۔

ٹشو پیپر سے آنکھوں کی نمی صاف کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''گھر جا کر میں کئی گھنٹے تک روتی رہی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ آپ کی اور آنٹی کی دیکھ بھال کروں، آپ کی ہمت بندھاؤں لیکن ماما کو شارق ماموں کا ڈر تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میرے یہاں آنے سے کوئی بڑا فساد کھڑا ہو جائے۔ میں نے اگلے روز شام تک تو برداشت کیا مگر پھر نہ کر سکی۔ میں نے سوچا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں یہاں آپ دونوں کے پاس چلی آئی۔''

شہزاد یکسر خاموش تھا۔ وہ بس عینی کے چہرے کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے انداز کو محسوس کر کے وہ بولی۔ ''شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں ایک جذباتی لڑکی ہوں، جو چند دن کی میل ملاقات کے بعد ایسی باتیں کرنے لگ گئی ہوں، ایسی باتیں جو ریت پر لکھی عارضی تحریر کی طرح ہوتی ہیں۔ یہاں میں آپ سے اختلاف کروں گی۔ یہ سب کچھ عارضی نہیں ہے اور نہ ہی دو چار دن میں پروان چڑھا ہے۔ یہ سب کچھ کافی عرصے سے ہے، شاید تین چار سالوں سے۔ دراصل میرے اور آپ کے درمیان جو رشتہ ہے وہ فن کا رشتہ ہے اور ذہنی ہم آہنگی کا رشتہ ہے اور میرے نزدیک یہی رشتہ زیادہ اہم ہے۔''

اس نے جملہ ختم کر کے ایک بار پھر شہزاد کی طرف دیکھا۔ جیسے توقع کر رہی ہو کہ وہ کچھ کہے گا مگر وہ خاموش رہا۔ نیند میں فاخرہ کی کھانسی کی آواز سنائی دی اور تب ایک بار پھر ہوٹل کے اس سویٹ میں گہری خاموشی چھا گئی۔ رات کے اس پہر پیرس کی جگمگاہٹیں قدرے ماند پڑ گئی تھیں۔ دور کئی کلومیٹر کے فاصلے پر ایفل ٹاور خاموش کھڑا تھا۔ وہ بھی جیسے شہر کے ساتھ ہی اونگھ رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''دیکھیں، میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ سچ کہوں گی اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔ میں اپنی عمر کے ساتھ ساتھ، عقل سمجھ بوجھ اور شاید ''کامن سینس'' میں بھی آپ سے بہت پیچھے ہوں، میں یہیں پلی بڑھی ہوں۔ پاکستان سے میرا ناتا بہت کم رہا ہے۔ وہاں کے بارے میں میری جو بھی انفارمیشن ہیں وہ مجھے ماما اور پاپا کے ذریعے ہی ملی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہاں اس طرح کے سچ بولے جاتے ہیں یا نہیں اور اگر بولے جاتے ہیں تو انہیں کیا سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال جو کچھ میرے دل میں ہے وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ میں آپ کو پسند کرتی ہوں، آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، آپ سے سیکھنا چاہتی ہوں اور..... اگر..... ہمارے مستقل طور پر ساتھ رہنے اور زندگی گزارنے کا کوئی رستہ نکلتا ہو تو میں اس پر بھی بخوشی قدم رکھنے کو تیار ہوں اور میں پھر کہوں گی، یہ محض جذباتی باتیں نہیں ہیں۔ آپ کے ساتھ میرے تعلق میں بڑی گہرائی ہے۔ یہ تو ایک اچھا اتفاق ہو گیا کہ آپ یہاں آگئے اور مجھے آپ کے آنے کا پتا بھی چل گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اسی سال یا سال کے آخر میں، میں آپ سے ملنے پاکستان جاتی اور بہت دن تک آپ کی جان کھاتی۔ آپ کے بارے میں میری معلومات اتنی زیادہ ہیں کہ اگر میں آپ کو بتانے پر آجاؤں تو آپ خود حیران رہ جائیں گے اور ہاں یاد آیا، میں آپ کو ایک مزے کی بات اور بتاؤں.....'' ایک لمحہ توقف کر کے وہ دوبارہ بولی۔

''میں دو تین دفعہ پاکستان میں آپ سے فون پر بات بھی کر چکی ہوں۔ ایک مرتبہ کا تو ماما پاپا کو بھی پتا ہے لیکن میں نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ آپ کو بتائیں کہ میں کون ہوں۔ اسی وقت ماما پاپا نے بھی آپ سے تھوڑی ''ہیلو ہیلو'' کی تھی۔ وہ شاید عید کا دن تھا۔ آپ حیدرآباد میں کسی مشترکہ عزیز کے گھر آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دو دفعہ میں نے اکیلے میں آپ سے بات کی۔ بس آپ کی آواز سنی۔ آپ کی خیر خیریت پوچھی۔ آپ بس پوچھتے ہی رہ گئے کہ میں کون ہوں لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ شاید آپ یاد کریں تو آپ کو یاد آجائے، یہ کوئی چار پانچ ماہ پہلے کی بات ہے۔''

اس کی بولتی آنکھوں میں شوخی تھی اور چہرے پر عجیب سی چمک۔ وہ بات ختم کر کے ایک بار پھر شہزاد کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بار بار توقع کر رہی تھی کہ شاید شہزاد کچھ بولے گا لیکن وہ پتھر کی طرح خاموش تھا۔

شہزاد کے اس انداز نے عینی کو گڑبڑا سا دیا۔ وہ کھسیانی ہو کر کوئی اور موضوع تلاش کرنے لگی۔ پھر ایک دم تیزی سے بولی۔ ''ارے ہاں..... اب آپ اپنی شرط تو پوری کیجیے ناں۔ میں نے تو سب کچھ بتا دیا۔''

شہزاد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''آپ جناب نے آٹوگراف دینا ہے۔'' وہ اٹھی اور اپنے شولڈر بیگ میں سے ایک خاص قسم کا سرخ مارکر اٹھا لائی۔ اسپیشل PERMANENT INK والے ایسے مارکرز عام طور پر جلد پر ٹیٹو وغیرہ بنانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

''لیجیے جناب!'' اس نے مارکر شہزاد کو تھما دیا۔ پھر شرٹ کا بالائی بٹن کھول کر اپنی شرٹ شانے پر سے نیچے کھسکا دی۔ ''یہ نیا فیشن ہے جی۔ کالر بون (ہنسلی کی ہڈی) کے نیچے ٹیٹو بنانے کا۔ اسے ہم آج کل ''ہارٹ ٹاپ مارک'' کہتے ہیں۔ آپ ٹیٹو تو نہیں بنائیں گے آپ بس اپنے پیارے سے سائن کر دیجیے۔''

وہ خطرناک حد تک عریاں ہو رہی تھی اور اسے اس عریانی کی مطلق پروا نہیں تھی یا شاید..... وہ جان بوجھ کر پروا نہیں کر رہی تھی۔

شہزاد نے بہت درگزر کیا تھا۔

بہت تحمل کا ثبوت دیا تھا۔

لیکن اب یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

اس کی رگوں میں جیسے لہو کی جگہ چنگاریاں چھوڑتا آتش دوڑ گیا۔

اس نے مارکر ایک طرف رکھا اور پھر..... ایک زناٹے کا تھپڑ عینی کے گال پر مارا۔ چٹاخ کی آواز ابھری۔ عینی کے بال اچھل کر اس کے چہرے پر آئے اور وہ بیٹھی بیٹھی دو تین فٹ پیچھے لڑھک گئی۔ اس کے چہرے پر حیرت کا سمندر موجزن ہوا..... اور ہمیشہ بولتی آنکھیں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ اس کا کندھا ابھی تک عریاں تھا اور کمرے کی روشنی میں بالکل دودھیا نظر آ رہا تھا۔

''اٹھو یہاں سے الّو۔'' شہزاد نے دھیمے لیکن نہایت سخت لہجے میں کہا۔

وہ لرز کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سفید تھا۔ شہزاد اپنی جگہ سے اٹھا اور دھیمے قدموں سے چلتا اس کے پاس پہنچا۔ اس نے ایک نظر بیڈروم کے بند دروازے پر ڈالی۔ جیسے اندازہ لگانا چاہ رہا ہو کہ فاخرہ کہیں جاگ تو نہیں گئی۔ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ وہ عینی سے مخاطب ہو کر پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم انتہائی بے شرم ہو۔ تمہیں اپنی عزت کا پاس ہے نہ کسی اور کی عزت کا۔ تم جانتی ہو تم کس سے بات کر رہی ہو؟ میں تمہاری ماں کا پھوپی زاد ہوں۔ اپنی

عمر دیکھو، میری عمر دیکھو، خدا کا خوف نہیں تو کچھ دنیا کا خیال ہی کرو، میں حیران ہوں کہ تم نے کیا پڑھا ہے اور کیا تربیت حاصل کی ہے۔'' غصے کے سبب شہزاد کا سارا وجود لرز رہا تھا۔

وہ پلکیں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ تاہم اب اس کے چہرے کی سفیدی ہلکی سی سرخی میں بدل گئی تھی۔

اس دوران میں بیڈروم سے فاخرہ کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔ ''شہزاد! کیا بات ہے، کیا ہوا ہے؟''

شہزاد نے عینی کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور اس سے مخاطب ہو کر دھیمی آواز میں بولا۔ ''صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جاؤ۔ میں دوبارہ تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔''

اس کے بعد اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور فاخرہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کچھ نہیں فاخرہ...... سو جاؤ تم۔''

مگر لگتا تھا کہ فاخرہ جاگ چکی ہے اور بیساکھیوں کے سہارے باہر آ رہی ہے۔ عینی اپنے آنسو چھپاتی ہوئی جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فاخرہ باہر آئی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے تیزی سے ماحول کا جائزہ لیا اور اس کی نیند سے بوجھل آنکھوں میں اندیشے کچھ اور بڑھ گئے۔

''کیا بات ہے عینی؟ کیا ہوا ہے؟'' فاخرہ نے عینی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے۔'' شہزاد نہایت کرخت لہجے میں بولا۔ ''اس سے کہو کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جائے۔ نہیں تو میں چلا جاؤں گا۔''

وہ پاؤں پٹختا ہوا بیڈروم میں آ گیا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ گردن میں پھر شدید درد ہونے لگا تھا۔ اس نے دو پین کلر کھائیں ساتھ میں ایک سکون بخش ٹیبلیٹ بھی لے لی اور اپنے ذہن کو نارمل کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ فاخرہ دوسرے کمرے میں عینی کے پاس تھی۔ وہ بہت مدھم آواز میں بول رہی تھی۔ الفاظ شہزاد کی سماعت تک نہیں پہنچ رہے تھے۔

وہ اضطراب کے عالم میں کچھ دیر تک اونگھتا رہا۔ فاخرہ کمرے میں واپس نہیں آئی، کچھ دیر بعد شہزاد کو بھی نیند آ گئی۔

وہ زیادہ دیر نہیں سویا۔ آنکھ کھلی تو اجالا ہو رہا تھا۔ المونیم کی عجیب وضع کھڑکی سے دھوپ کی پہلی کرنیں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ نیلے آسمان پر جہازوں کے چھوڑے ہوئے سفید دھوئیں کی آڑی ترچھی لکیریں دکھائی دے رہی تھیں۔ فاخرہ سامنے وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ اس کی بیمار آنکھوں میں گہری اداسی اور یاسیت کروٹیں لے رہی تھی۔

شہزاد کو اندازہ ہوا کہ عینی شاید بہت کچھ اسے بتا چکی ہے۔

''شہزاد! یہ کیا کیا آپ نے؟'' وہ نم ناک لہجے میں بولی۔

''جو کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔'' شہزاد کا لہجہ اٹل تھا۔ فاخرہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ ''اسے کہو سونم! کہ بس ایک آدھ گھنٹے کے اندر یہاں سے چلی جائے۔'' شہزاد نے حکمیہ انداز اختیار کیا۔

''وہ جا چکی ہے۔'' فاخرہ آزردہ لہجے میں بولی۔

''کب؟''

''دو گھنٹے ہو گئے ہیں، ابھی اندھیرا ہی تھا۔ میں روکتی رہی لیکن وہ نہیں رکی۔ بڑی دکھی ہو کر گئی ہے یہاں سے۔''

شہزاد خاموش رہا۔ اس کے ہونٹ مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔

''آپ نے اسے طمانچہ بھی مارا تھا؟'' فاخرہ نے پوچھا۔

''ہاں مارا تھا بلکہ اس وقت میرا دل چاہا تھا کہ اسے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔ وہ پرلے درجے کی احمق ہے...... وہ...... وہ فلرٹ کر رہی تھی مجھ سے...... اسے شرم نہیں آئی کہ میرا اور اس کا رشتہ کیا ہے۔ میں اس کے باپ کی عمر کا ہوں۔''

فاخرہ کچھ دیر خاموش رہی پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ''جو کچھ بھی ہے شہزاد...... آپ کو اس کے ساتھ ایسا رویہ تو اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ یہاں کے آزاد ماحول میں پلی بڑھی ہے۔ بندہ جس ماحول میں ہوتا ہے اسی میں ڈھل جاتا ہے...... اور یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔''

''تم نہ کرو اس کی وکالت۔'' شہزاد گرجا۔ ''اگر لوگ یہاں ننگے پھرتے ہیں تو کیا ہم بھی ننگا پھرنا شروع کر دیں۔ وہ حد سے بڑھ رہی تھی۔ میں نے اسے پہلے بھی ایک دو بار اشارے کنائے میں منع کیا تھا لیکن وہ ایک ضدی لڑکی ہے۔ یہاں کے رنگ میں پوری طرح رنگی ہوئی ہے۔ آج اسے جو سبق ملا ہے وہ کافی عرصے تک یاد رہے گا۔ آئندہ زندگی میں اس کے کام آئے گا۔'' شہزاد کا لہجہ جذبات کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ ''اور اب میں اس بارے میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔'' شہزاد نے کمبل پھر اوڑھ لیا۔

''اگر اس نے باجی فرزانہ کو اس بارے میں بتایا تو پھر؟''

''بتا دے، سب کو بتا دے۔'' شہزاد نے کمبل کے اندر

سے ہی جواب دیا۔ ''آگے ان لوگوں کے ساتھ ہماری کون سی گاڑھی رشتے داریاں ہیں، جہاں دل آپس میں نہ ملتے ہوں وہاں ایک دوسرے سے دور ہی رہا جائے تو بہتر ہوتا ہے۔''

فاخرہ خاموش ہو گئی لیکن اس کے بیمار چہرے پر اندیشوں کے گہرے سائے صاف محسوس کیے جا سکتے تھے۔

بعد میں شہزاد بھی دیر تک سوچتا رہا۔ کم از کم اسے تھپڑ نہیں مارنا چاہیے تھا۔ یہ کام الٹا بھی پڑ سکتا تھا۔ وہ بھی طیش میں کوئی الٹا سیدھا کام کر سکتی تھی۔ کوئی بات کہہ کر اپنے گھر والوں کو بھڑکا سکتی تھی یا پھر پولیس کے پاس جا سکتی تھی۔ یہاں تو چھوٹا بچہ بھی اپنے ماں باپ کے خلاف مار پیٹ کی رپورٹ درج کرا سکتا تھا۔ یہ تو پھر جوان تھی اور وہ اس کا خونی رشتے دار بھی نہیں تھا۔

دو دن خاموشی سے گزرے۔ اس دوران میں شہزاد کے سر کی چوٹیں قدرے بہتر ہو گئیں...... گردن کے درد میں بھی اب افاقہ تھا۔ وہ پی کیپ پہن کر لیکچر میں شرکت کے لیے بھی گیا۔ تصویروں کی ایک نمائش بھی دیکھی۔ یہ دونوں مصروفیات اس کے ''پیرس شیڈول'' میں شامل تھیں۔ اس دوران میں صرف ایک بار فرزانہ کا فون آیا۔ اس نے فاخرہ سے حال چال پوچھا۔ عینی کے حوالے سے فرزانہ نے کوئی بات کی اور نہ عینی کی بڑی بہن زارا نے۔ یوں لگتا تھا کہ شاید عینی نے یہاں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں ان کو کچھ بتایا ہی نہیں۔

تیسرے دن کی بات ہے شہزاد، کمرے کی کھڑکی کھولے بیٹھا تھا اور دریا کا منظر دیکھ رہا تھا۔ حسب معمول دونوں فرانسیسی بوڑھے آج بھی کنارے پر موجود تھے اور اپنے خیالات میں غلطاں نظر آتے تھے۔ وہ آپس میں بھی شاید بہت کم ہی بات کرتے تھے۔ اچانک کال بیل ہوئی۔ عمیر نے دروازہ کھولا پھر اس کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''آ خا...... دیکھو امی کون آیا؟''

''گڈ ایوننگ'' کی مدھم آواز سنائی دی اور شہزاد کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ یہ عینی ہی تھی۔

عینی فاخرہ اور بچوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ شہزاد نے اٹھ کر بیڈروم کا دروازہ بند کر لیا۔ اسے شدید الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اب کیا لینے آئی تھی یہاں؟

دس پندرہ منٹ گزر گئے، پھر ہولے سے دروازہ کھلا اور فاخرہ اندر آ گئی۔ ''کیا بات ہے؟'' شہزاد کا لہجہ سخت تھا۔

فاخرہ نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ آپ سے معافی مانگنے آئی ہے۔ بہت شرمندہ ہے۔ رو بھی رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے معاف کیا میں نے۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، بس وہ یہ مہربانی فرمائے کہ اپنے گھر میں رہے۔''

''چلیں...... کوئی بات نہیں۔ آپ ایک بار مل لیں اس سے۔'' فاخرہ نے التجا کی۔

اس سے پہلے کہ شہزاد جواب میں کچھ کہتا، وہ خود ہی اشک بار آنکھوں کے ساتھ اندر آ گئی۔ اس نے آتے کے ساتھ ہی ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں جی' میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ کو میری وجہ سے تکلیف پہنچی۔ اس کا مجھے بہت زیادہ افسوس ہے...... میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ...... بہت محتاط رہوں گی۔''

شہزاد خاموش رہا۔ ماتھے پر گہری شکنیں تھیں۔

''پلیز...... میں وعدہ کرتی ہوں۔ کوئی ایسی بات نہیں کروں گی جس سے آپ کی ناراضی کا پہلو نکلتا ہو۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ اپنے لباس کی طرف توجہ دو...... دیکھو اب بھی تم نے جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں وہ گھروں میں پہننے کے لائق نہیں ہیں۔ اپنی بول چال پر غور کرو۔ مختلف عمر کے لوگوں سے بات کرتے ہوئے مختلف لہجہ اپنانا پڑتا ہے۔ حفظ مراتب اسی کو کہتے ہیں تم بہت کچھ بننا چاہتی ہو لیکن پڑھائی کی طرف تمہاری توجہ کتنی ہے؟ پچھلے آٹھ دس دنوں میں، میں نے تو شاید تمہاری زبان سے ایک بار بھی پڑھائی کی بات نہیں سنی......''

شہزاد بولتا رہا اور وہ کسی اسٹوڈنٹ ہی کی طرح سر جھکائے سنتی رہی۔

''آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔'' اس نے آخر میں کہا۔

فاخرہ اسے باہر لے گئی۔

شہزاد چاہتا تھا کہ اب وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جائے لیکن وہ اور فاخرہ باتیں کر رہی تھیں۔ آدھ پون گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ شہزاد کو فاخرہ پر بھی غصہ آنے لگا کہ وہ اسے فارغ کیوں نہیں کر رہی۔ کچھ دیر بعد فاخرہ بیساکھیوں کے ساتھ اندر آئی اور ہولے سے بولی۔ ''وہ اب بھی پریشان ہے، کہہ رہی ہے کہ آپ نے اسے دل سے معاف نہیں کیا۔''

''تو کیا کروں اب؟''

''وہ آپ کے لیے چاکلیٹس لائی ہے، کہتی ہے کہ جب تک آپ اس کا چاکلیٹ نہیں کھائیں گے، وہ یہی سمجھے گی کہ آپ خفا ہیں۔''

یورپ امریکا وغیرہ میں چاکلیٹس شوق سے کھائے جاتے ہیں اور کئی حوالوں سے ان کی اہمیت بھی ہے، بے شمار جگہوں پر مختلف سوئٹس اور خاص طور... سے چاکلیٹس کا استعمال ہوتا ہے۔ کسی کو منانے کے لیے، تحفہ دینے کے لیے۔ Compliments پیش کرنے کے لیے، ہدیہ وغیرہ کے طور پر، اس کا استعمال ہمہ جہتی ہے۔ وہ بھی شہزاد کے لیے چاکلیٹس لائی تھی۔ طوعاً و کرہاً.... شہزاد کو بیڈروم سے باہر آنا پڑا۔ اس نے چاکلیٹ کے ایک دو ٹکڑے کھائے۔ فاخرہ نے چائے اور اسنیکس بھی منگوا لیے تھے۔ انہوں نے اکٹھے چائے پی۔ شہزاد بھی کسی حد تک نارمل ہو گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بدلے ہوئے موڈ کی وجہ سے بچے بھی کچھ بجھ سے گئے ہیں۔ عینی کے ساتھ ان کی خاصی ایسوسی ایشن ہو گئی تھی اور اب عینی کو آزردہ دیکھ کر وہ بھی آزردہ تھے۔

عینی کی خواہش تھی کہ پیرس کی باقی سیر بھی وہ لوگ ان کے ساتھ کریں، اگر ایسا نہ ہوا تو وہ ان کے جانے کے بعد بہت دکھی رہے گی۔ شہزاد ہامی بھرنے سے کترا رہا تھا مگر فاخرہ نے ہامی بھر لی۔

عینی نے اپنے گال پر پڑنے والے تھپڑ کے بارے میں گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ اس نے فاخرہ سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ اس کے ماما پاپا یا زارا وغیرہ سے اس واقعے کا بالکل ذکر نہ کرے۔ وہ آٹھ بجے کے قریب گھر واپس چلی گئی۔ بچے موجودہ صورت حال سے خوش تھے۔ انہیں امید بندھ گئی تھی کہ اب پھر سیر کا موقع ملے گا۔ رات کو جب شہزاد سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو عینی کا چہرہ اس کی نگاہوں میں آ گیا۔ پہلی بار اسے عینی پر تھوڑا سا ترس آیا۔ اسے لگا کہ اس سے زیادتی ہوئی ہے۔ تھپڑ کھانے کے بعد اس نے جس طرح ششدر ہو کر شہزاد کو دیکھا تھا اور اس کا رنگ زرد ہوا تھا وہ واقعی ترس ناک تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ بھی تھوڑا سا پھٹ گیا تھا اور فاخرہ نے بتایا تھا کہ اس رات وہ دیر تک ٹشو پیپر سے ہونٹ کو دباتی رہی تھی۔

جو کچھ بھی تھا، شہزاد کا دل اب بھی یہی چاہتا تھا کہ عینی کے ساتھ ان کی زیادہ میل ملاقات نہ ہو۔ شارق جس طرح کی بے ہودگی کر کے یہاں سے گیا تھا وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی...... عین ممکن تھا کہ اس نے عینی کے والد جمیل صاحب کے کانوں میں بھی کوئی الٹی سیدھی بات ڈال دی ہو اور وہ شہزاد کی طرف سے محتاط ہو گئے ہوں۔ دو چار روز سے ان کی طرف سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ابھی شہزاد یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ ہوٹل کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف جمیل احمد صاحب ہی تھے۔

سلام دعا کے بعد انہوں نے کہا۔ ”شہزاد! عینی نے تمہاری ایک شکایت کی ہے۔“

شہزاد بری طرح چونک گیا۔ ”کک...... کیسی شکایت جی؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ کہتی ہے کہ تم اس کی اور فاخرہ کی بار بار کی درخواست کے باوجود ہمارے گھر نہیں آئے ہو۔“

شہزاد نے ایک سرد آہ بھری۔ ”آپ نے دیکھا ہی ہے بھائی جان! کہ شارق یہاں کیا تماشا لگا کر گیا ہے، اس کے بعد ہماری میل ملاقات کی کم ہی گنجائش رہ جاتی ہے......“

”شارق کو گولی مارو...... میں اس کے نہیں اپنے گھر کی بات کر رہا ہوں۔ میرے گھر کے معاملوں میں دخل دینے والا وہ کون ہوتا ہے اور ویسے بھی اس کی کیا حیثیت ہے۔ وہ موٹے دماغ کا بیکار شخص ہے۔ اپنے طور پر اس نے کچھ نہیں کیا ہے۔ انکل جہانگیر نے جو کچھ کمایا تھا اسی پر اترا رہا ہے اور وہ سب کچھ بھی کتنی دیر تک ساتھ رہے گا۔ ادھر جہانگیر صاحب کی آنکھیں بند ہوئیں، ادھر اس نے سب کچھ اپنی عیاشیوں میں برباد کر چھوڑنا ہے، خیر چھوڑو، وہ اس قابل ہی نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے۔“ جمیل احمد صاحب شارق کے خلاف بھرے ہوئے تھے۔

انہوں نے آخر میں کہا۔ ”بھئی! عینی میری سب سے لاڈلی اولاد ہے اور میرا ایک مشورہ ہے تمہیں۔ اس کی کوئی بات ٹالنا نہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ اس کی بات ٹالنے والا نقصان میں اور ماننے والا فائدے میں رہتا ہے اور یہ تجربہ میں نے کوئی دو چار دن میں حاصل نہیں کیا۔ اٹھارہ انیس سال کا دورانیہ ہے، میں جب بھی...... جب بھی اس کے کہنے پر چلتا ہوں مجھے فائدہ ہوتا ہے۔ چاہے کوئی گھریلو پریشانی ہو، چاہے کاروباری معاملہ ہو یا کوئی اور مسئلہ۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے اندر کوئی خاص کرشماتی ٹائپ کی روح ہے۔ تمہیں پتا ہے جب یہ پیدا ہوئی تھی تو کیا ہوا تھا؟ تم نے وہ مکان گرنے والا واقعہ سنا ہوا ہے؟“

نہیں جی۔“ شہزاد نے کہا۔

”ان دنوں ہم سان فرانسسکو میں تھے۔ پیدائش کے تیسرے روز کی بات ہے۔ گھر آتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کی دادی اسے گود میں لے کر گھر میں چکراتی رہیں۔ یہ پورے گھر میں روتی رہی لیکن جب کچن کے ساتھ والے ایک چھوٹے کمرے میں پہنچتی تھی تو رونا بند کر دیتی تھی۔ آخر ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ کمرا نسبتاً زیادہ گرم ہے اس لیے یہ یہاں آ کر چپ ہو جاتی ہے لہٰذا فرزانہ بھی اس کمرے میں شفٹ ہو گئی۔ اگلے روز صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ شدید زلزلہ آیا۔ اس زلزلے میں علاقے کا بہت جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ خاص طور سے ساحلی علاقے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ میں اس وقت آفس میں تھا۔ ہمارا گھر بھی تقریباً سارا ہی گر گیا تھا۔ صرف وہی کمرا بچا جہاں فرزانہ، زارا، عینی اور ان کی دادی موجود تھیں۔ امدادی کارکنوں نے انہیں بڑی مشکلوں کے ساتھ وہاں سے نکالا اور یہ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے بھئی۔ ہاں اسے تم پہلا واقعہ کہہ سکتے ہو۔ اس لڑکی کی بات مان لینے میں اکثر فائدہ ہی ہوتا ہے۔ اب یہ آخری تجربہ ہی دیکھ لو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ”اسی کے پرزور اصرار پر میں تبدیلی آب و ہوا کے لیے یہاں سوئٹزرلینڈ میں موجود ہوں اور کافی افاقہ ہوا ہے، بے شک مہنگائی بہت ہے اور جیب ہلکی ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ طبیعت بھی تو کافی ہلکی ہوئی ہے۔“ انہوں نے پھر قہقہہ لگایا۔

”ہاں آپ کی آواز سے تو لگ رہا ہے کہ آپ اچھا محسوس کر رہے ہیں۔“

”بالکل۔“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”اس وقت میں سوئٹزرلینڈ کے کیپٹل ”زیورخ“ میں ہوں۔ زیورخ کا دل زیورخ کی جھیل ہے جسے ”زیورخ بے“ کہتے ہیں۔ میں نے اس وقت نیکر پہنی ہوئی ہے۔ ہیڈفون لگا کر ”ایس بی“ پر فریش میوزک سن رہا ہوں اور ہلکی پھلکی جاگنگ کر رہا ہوں۔ واقعی بھئی، کوئی بات ہے سوئٹزرلینڈ میں۔“

اگلے روز عینی اپنی ”پی جو“ گاڑی پر پھر ہوٹل پہنچ گئی۔ اسے دیکھ کر بچے بہت خوش ہوئے۔ ان کی چہکاریں لوٹ آئیں اور چہروں کی رونقیں بحال ہو گئیں۔ شہزاد نے نوٹ کیا۔ وہ حیران کن طور پر بڑا ”سوبر“ لباس پہنے ہوئے تھی۔ شلوار قمیص کے ساتھ ایک اسکارف ٹائپ کپڑا بھی تھا۔ لباس کے علاوہ اس کا چہرہ بھی سنجیدہ نظر آتا تھا تاہم یہ سنجیدگی ایسی نہیں تھی کہ تفریح کے موڈ کو خراب کرتی۔ حسب معمول اس نے اصرار کر کے فاخرہ کو بھی ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ فاخرہ کی طبیعت اب قدرے اچھی تھی۔ حسب معمول بچے عینی کے ساتھ آگے بیٹھ گئے۔ فاخرہ اور شہزاد نے پچھلی نشست سنبھال لی۔ آج وہ دریائے سین کے ساتھ ساتھ نکلے اور راستے میں آنے والی مختلف قابلِ دید جگہوں پر تھوڑی تھوڑی دیر رکتے گئے۔

وہ جو ذرا تناؤ کی کیفیت تھی وہ ایک دو گھنٹے کی سیر کے بعد دور ہو گئی۔ عمیر اور احسن عینی سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ وہ بھی انہیں جواب دینے لگی۔ فاخرہ بھی عینی کو نارمل کرنے کے لیے مسلسل باتیں کر رہی تھی، حالانکہ وہ کم ہی بولتی تھی۔

راستے میں ایک ٹریک سگنل پر ایک عمر رسیدہ فرنچ عورت کو دیکھ کر فاخرہ نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ تو بالکل تائی کلثوم لگتی ہے۔“ سب نے چونک کر عورت کی طرف دیکھا۔ لمبی ناک اور کرخت چہرے والی وہ عورت شاید کسی فلنگ اسٹیشن پر کام کرتی تھی۔ کم از کم اس کی وردی سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ وہ ایک سائیکل سوار لڑکے سے تکرار کرنے میں مصروف تھی جس نے شاید اس کا راستہ کاٹا تھا یا ہلکی پھلکی چوٹ پہنچائی تھی۔ گاڑی اس کے پاس سے گزر گئی۔

عینی نے چونک کر کہا۔ ”ہاں آنٹی! جن کو آپ نے تائی کلثوم کہا ہے یہ وہی ہیں ناں...... جنہوں نے...... میرا مطلب ہے جنہوں نے خالہ نجمہ کو بہو بنایا تھا۔“

”ہاں، وہی ہیں۔ آج کل اپنے بھائیوں کے پاس رہتی ہیں۔ کالے موتیے کی وجہ سے ان کی بینائی بالکل ختم ہو چکی ہے۔“

”ہاں...... ہاں کوئی ایسی بات تو میں نے بھی سنی تھی مگر وہ اپنے بھائیوں کے پاس کیوں ہیں؟“ عینی نے پوچھا۔ اس کے انداز میں گہرا تجسس تھا اور یہ وہی تجسس تھا جو شہزاد اور نجمہ کے حوالے سے اس میں شاید کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ممانی کلثوم بھی اس کہانی کا حصہ تھی۔

فاخرہ نے بتایا۔ ”تایا طفیل تو تیرہ چودہ برس پہلے فوت ہو گئے تھے۔ اس کے بعد تائی کے لے پالک سجاد نے پر پرزے نکالنے شروع کیے۔ باجی نجمہ کے بعد اس نے دوسری شادی کی تھی۔ اس کی دوسری بیوی ایک نمبر کی خرانٹ ہے۔ اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ تائی کے سیر کو سوا سیر مل گیا تھا۔ بیٹے اور بہو نے تائی کو نچا کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ ساس بہو میں مار پیٹ تک کی نوبت آ گئی۔ شاید قدرت نے تائی سے ان ناانصافیوں کا بدلہ لیا ہے جو انہوں نے باجی نجمہ سے روا رکھی تھیں۔“

”بالکل یہی ہوا ہوگا۔“ عینی نے ہنکارا بھرا۔ ”مجھے ماما نے بتایا تھا کہ شادی کے بعد نجمہ خالہ کو ساس اور شوہر نے بہت دکھی کیا تھا۔ اسی دکھ میں ان کی زندگی بھی چلی گئی۔“

”خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے، کبھی کبھی انصاف میں دیر تو لگتی ہے لیکن انصاف ہوتا ضرور ہے عینی۔“ فاخرہ نے کہا۔ ”تائی کلثوم کے لے پالک سجاد نے کاروبار تو پہلے ہی تباہ کر چھوڑا تھا، اب ڈھائی تین سال پہلے اس نے مکان بھی تائی کلثوم سے ہتھیا لیا۔ حالانکہ تائی خود بھی بڑی چوکس عورت

ہیں لیکن پتا نہیں کیسے اس کے چکر میں آ گئیں۔ انہوں نے سجاد کو مختار نامہ دیا اور اس نے گھر بیچ کر بیوی کے ساتھ کوئٹہ کا ٹکٹ کٹا لیا۔ تائی اب بے گھر ہو کر چھوٹے بھائی کے پاس ہے۔ کوئی کیس وغیرہ بھی لڑ رہی ہے لیکن بننا بنانا کچھ نہیں۔ بہو کا بھائی خود بڑا خرانٹ وکیل ہے اور اب تو تائی ویسے بھی چل پھر نہیں سکتی۔ اس کی نظر بالکل ختم ہو چکی ہے۔''

عینی، فاخرہ سے کرید کرید کر سوال پوچھتی رہی اور اس کے سوالوں سے وہ گوناں گوں دلچسپی ظاہر ہوتی رہی جو وہ اس کہانی سے رکھتی تھی۔ اس کے چہرے مہرے سے صاف ظاہر تھا کہ ممانی کلثوم کی شامتِ اعمال کا سن کر وہ خوش ہوئی ہے۔

دریائے سین کے کنارے پر نرم نرم دھوپ کا بسیرا تھا۔ پھول کھلے تھے اور وہ اپنی چاروں طرف ہنستے مسکراتے چہروں کی بہار دیکھ رہے تھے۔ بچے کشتی کی سیر کو مچل گئے۔ شہزاد اور فاخرہ کا خیال تھا کہ کشتی کی سیر کے بجائے یہیں سبزہ زار میں ''میٹ'' بچھا کر بیٹھا جائے اور چائے پی جائے۔ ایک ہی خوبصورت مقام کو بچے اور انداز میں دیکھ رہے تھے جبکہ فاخرہ اور شہزاد اور انداز میں...... فاخرہ اور شہزاد کو ان کی ''تھکاوٹ'' کنارے پر رکھنا چاہتی تھی جبکہ بچوں کو ان کی ''وافر توانائی'' مچلتی لہروں کی طرف دھکیل رہی تھی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ شہزاد بچوں کو لے کر کشتی میں بیٹھے گا جبکہ عینی کنارے پر فاخرہ کے ساتھ رہے گی۔

قریباً ایک گھنٹا کشتی میں سیر کے بعد جب وہ کنارے پر واپس آئے تو شام ہو چکی تھی، پیرس کی دوشیزہ...... ایک ریشمی شب کو اپنے سامنے دیکھ کر انگڑائی لے رہی تھی اور اس کے آنچل میں بے شمار ستارے جھلملانے لگے تھے۔ انہوں نے کنارے پر بیٹھ کر گرما گرم چائے پی اور بسکٹ کھائے۔ ایک تفریحی بجرے پر موجود کچھ منچلے بیئر پی رہے تھے اور میوزک پر مسلسل رقص کر رہے تھے، ان میں لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ غالباً یہ کوئی برتھ ڈے پارٹی تھی پھر ان لوگوں نے آتش بازی شروع کر دی۔ قوس قزح کے رنگوں والی ہوائیاں فضا میں روشنی بکھیرنے لگیں۔

عینی اس آتش بازی میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ اس کے بجائے وہ دور ایفل ٹاور کے روشن ہیولے کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں سیکڑوں ہزاروں قمقمے جل بجھ رہے تھے اور ٹاور کی دلکشی میں اضافہ کر رہے تھے۔

''دیکھیں باجی! کتنی پیاری ہوائیاں ہیں۔'' عمیر نے عینی کو جھنجوڑتے ہوئے آتش بازی کی طرف متوجہ کیا۔

''ہوں۔'' عینی نے مختصر جواب دیا۔

''تمہیں آتش بازی اچھی نہیں لگتی؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''نہیں جی...... یہ خطرناک کام ہے اور آپ کو؟''

''مجھے بھی نہیں لگتی۔'' شہزاد نے کہا۔

وہ مسکرائی۔ ''پر آپ تو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے؟''

''وہ تو یونہی، بچوں کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔''

''پتا نہیں کیا بات ہے، مجھے پٹاخے، آگ، دھواں وغیرہ بالکل اچھے نہیں لگتے اور خاص طور پر اس کی بُو، جو فائر ورک کے ساتھ پھیلتی ہے۔''

ایکا ایکی شہزاد بری طرح چونک گیا، یہی الفاظ...... اسی انداز میں...... کسی موقعے پر کسی اور نے بھی کہے تھے۔

اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔ ہاں بالکل یہی انداز تھا۔ برسوں پہلے ماموں جہانگیر کے گھر کی چھت پر، شبِ برات کے موقع پر سارے کزن مل کر ہلّا گلّا کر رہے تھے۔ آتش بازی ہو رہی تھی۔ نجمہ اس آتش بازی سے بالکل لاتعلق ہو کر موم بتیاں روشن کرنے میں مصروف تھی۔ شہزاد اس کے پاس جا کھڑا ہوا تھا...... اور تب بالکل ایسی ہی باتیں نجمہ نے کہی تھیں۔

وہ گم صم ہو گیا۔ اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں سے بہت دور چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے نجمہ اور عینی میں گاہے بگاہے حیران کن مماثلتیں کیوں نظر آ رہی ہیں۔ وہ ان مماثلتوں سے صرفِ نظر کرنے کی بہت کوشش کرتا تھا، کچھ کو اپنا وہم قرار دیتا تھا، کچھ کو اتفاق کے حوالے سے دیکھتا تھا، لیکن پھر بھی یہ مماثلتیں اور مشابہتیں مسلسل اس کی نگاہوں کے سامنے ابھر رہی تھیں اور ان میں سب سے اہم مشابہت آنکھوں کی تھی۔ عینی کی آنکھوں میں شہزاد بہت کم دیکھتا تھا لیکن جب بھی دیکھتا تھا اسے ایک شاک کی سی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ آنکھوں کی بناوٹ ایک جیسی ہونا اور بات ہوتی ہے...... لیکن یہ تو عینی کی آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ یہ نجمہ کی تھیں اور ان کے اندر بھی جو کچھ تھا وہ نجمہ کا تھا۔ وہ چوتھائی صدی سے زیادہ کا فاصلہ پھلانگ کر پیرس میں رہنے والی عینی کی آنکھوں میں نمودار ہوئی تھی، اب وہ اسے دیکھ رہی تھی، پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں لوٹ کر آؤں گی اور وہ شاید لوٹ آئی تھی۔

مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے

جذبات کے تلاطم سے جنم لینے والی ایک سنسنی خیز داستان عشق

طاہر جاوید مغل

شہرِ محبت

آخری حصہ

چاہت کے سپنے بڑے سُندر اور نازک آبگینوں کے مانند ہوتے ہیں جنہیں بہت سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے بھی کرچی کرچی ہوجاتے ہیں مگر...... یہاں تو حسد ورقابت کی اتنی تیز آندھیاں تھیں کہ کوئی زندگی ہی ہار گیا اور کوئی جیت کر بھی زندگی کا لطف نہ اٹھا سکا۔ حسد ورقابت کے جذبات سے جانے کتنی ہی کہانیوں نے جنم لیا۔ جہاں اپنی مقصد برآری کے لیے لوگ کیا کیا گُر اپنا لیتے ہیں اور کسی کو ذلت کے گڑھے میں دھکیلنے کے لیے کیسے کیسے ہنر آزماتے ہیں لیکن...... قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی...... اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ محبت کے جو لمحات اس کے ہاتھوں سے ریت کے مانند پھسل چکے ہیں یوں اتنے دلکش سراپا میں ڈھل کر اس کے سامنے آکھڑے ہوں گے...... مگر جانے کیوں اس بار اس کی آنکھیں شہرِ محبت کا یہ خواب دیکھنے کے لیے راضی نہ ہوسکیں...... خوشبوؤں کی سرزمین پیرس کی حسین رہ گزاروں میں سفر کرتی ایک گنگناتی خوبصورت داستان۔ محبوب مصنّف طاہر جاوید مغل کے قلم کی دلکش روانی۔

شہزاد کا دم گھٹنے لگا۔ وہ سب کو وہیں گپ شپ کرتے چھوڑ کر دریا کے کنارے چلا گیا...... تاریکی میں خنکی شامل ہوگئی تھی، دن کی روشنی میں نہایت سرسبز نظر آنے والے شاہ بلوط اور بید کے پیڑ تیرگی کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔ عطر بیز ہوا میں ایک نشہ سا تیرتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ گہری سانسیں لینے لگا، گھٹن کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہاں دریا کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے اسے انجانا سا ڈر محسوس ہوا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر ابھی یہاں کہیں سے شارق نمودار ہو جائے تو عینی کو ان کے ساتھ پکنک مناتے دیکھ کر اس کے اشتعال کا کیا عالم ہو۔ شکر کا مقام تھا کہ وہ انگلینڈ واپس لوٹ چکا تھا۔

اگلے روز شہزاد نے اپنے فرانسیسی دوستوں پروفیسر موشیل اور مسٹر شا کے ساتھ دو تین گیلریوں کا وزٹ کیا۔ دوسری جنگِ عظیم کی یادگار راسٹل فوٹو گرافز کی ایک نمائش بھی دیکھی۔ تیسرا روز پھر سیر کا تھا۔ یہ سنڈے تھا اور واقعی سن ڈے بھی تھا۔ بڑی خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ بچے باہر نکلنے کے لیے مچل رہے تھے۔ تاہم فاخرہ آج پھر ''فٹ'' نہیں تھی۔ وہ پرسوں کی طویل سیر کے بعد مسلسل ٹانگوں اور کمر میں درد کی شکایت کر رہی تھی۔ آج چھٹی کی وجہ سے زارا اور اس کا گول مٹول بچہ حمدان بھی ساتھ آئے تھے۔ دونوں بہنوں نے زبردست لنچ کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ گھر میں بنائے گئے ''ڈونرز'' اور ایگ فرائیڈ رائس تھے۔ پروگرام تھا مشہور تفریح گاہ PARC ASTERIX جانے کا۔ یہ ڈزنی لینڈ طرز کی تفریح گاہ تھی اور شہر سے کافی فاصلے پر تھی۔ عمیر اور احسن اس پارک کے حوالے سے بڑے پرجوش تھے۔

جب فاخرہ کے ساتھ جانے کا پروگرام نہیں بنا تو فیصلہ ہوا کہ آج کار کے بجائے میٹرو اور RTR ٹرینوں میں سفر کیا جائے۔ شہزاد کی توقع کے خلاف یہ نیا تجربہ بڑا دلچسپ اور آسان رہا۔ پیرس کو زیادہ قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع بھی ملا۔ شاید وہ اکیلے ہوتے تو یہ ٹرینوں والا تجربہ کبھی نہ کرتے لیکن عینی اور زارا یہاں ہر طرح کے سفر کی ماہر تھیں۔ خاص طور سے عینی کو تو جیسے ہر چیز ازبر تھی، آج وہ غیر متوقع طور پر ساڑی پہن کر آئی تھی، تاہم اس کے پاؤں میں سفید جوگر اور سر پر پی کیپ تھی۔ پی کیپ پہننے کے لیے اس نے بال، ٹائٹ جوڑے کی شکل میں باندھ لیے تھے۔ حسبِ معمول آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ بھی تھا۔ شروع میں شہزاد اور فاخرہ کا خیال تھا کہ شاید وہ شوق شوق میں ساڑی پہن آئی ہے اور گھومنے پھرنے میں دقت محسوس کرے گی لیکن جب وہ چل پڑے تو شہزاد کو اندازہ ہوا کہ وہ اس سلسلے میں بھی تجربہ کار ہے۔ وہ بڑی پھرتی سے چھلانگیں لگاتی ہوئی ٹرینوں اور بسوں پر چڑھتی بھی اور اترتی بھی۔

سب سے پہلے وہ دو بسیں بدل کر ''مین اسٹیشن'' پہنچے۔ وہاں سے زمین دوز پلیٹ فارم پر گئے اور ایک ٹرین پکڑی جس کو ''لائن ون'' کہا جاتا تھا۔ اس شاندار ٹرین سے اترنے کے بعد انہوں نے ایک اور ٹرین لی۔ عینی نے بتایا کہ اسے RTR کہا جاتا ہے۔ یہ ٹرین بھی پہلی ٹرین کی طرح سیکنڈوں کے لحاظ سے درست وقت پر پہنچی اور رخصت ہوئی۔ یہ سب کچھ کمپیوٹرائزڈ نظام کے تحت تھا۔ یہ لمبے فاصلے تک جانے والی نسبتاً تیز رفتار ٹرین تھی۔ وہ جلد ہی پیرس سے نکل کر مضافات میں پہنچ گئی۔ پیرس کے مضافات پیرس کی طرح پرشکوہ نہیں تھے۔ یہ ویسے ہی تھے جیسے عام شہروں کے ہوتے ہیں۔ غالباً دنیا کے ہر بڑے شہر کی مضافاتی آبادیاں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ RTR کا رخ اب پیرس کے ایئرپورٹ کی طرف تھا۔

راستے کے مختلف اسٹاپس سے بہت سے سیاہ فام بھی ان کے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ عمیر مسلسل چہک رہا تھا۔ اس کی زیادہ تر گفتگو عینی کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ اس نے عینی سے مخاطب ہو کر اردو میں کہا۔ ''یہ اتنے سارے بلیک آگئے ہیں اندر، لگتا ہے کہ ٹرین میں اندھیرا ہوگیا ہے۔''

عینی نے اسے گھورا اور تنبیہ کے انداز میں بولی۔ ''یہ لوگ ایسی باتوں کا بڑی جلدی برا منا لیتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ تمہیں پیٹ ڈالیں۔''

''لیکن، میں نے تو اردو میں کہا ہے۔''

''الو بائے! ''بلیک'' تو انگلش میں کہا ہے ناں اور یہی لفظ انہیں زیادہ برا لگتا ہے۔''

''اوکے...... سوری آنٹی۔'' عمیر نے کہا۔

زارا بولی۔ ''اوئے عمیر! یہ کیا؟ کبھی تم اسے باجی کہتے ہو، کبھی آنٹی۔''

''یہ آج ذرا بڑی بڑی لگ رہی ہیں ناں۔ اس لیے غلطی لگ گئی۔'' عمیر نے ترت جواب دیا۔ غالباً وہ ساڑی کی وجہ سے ایسا کہہ رہا تھا۔

''اچھا، اس کا مطلب ہے جب میں ذرا بڑی لگوں گی تم مجھے آنٹی کہو گے جب چھوٹی لگوں گی تب باجی اور اگر زیادہ چھوٹی لگوں گی تو صرف عینی۔'' عینی نے اس کا کان مروڑا۔

''اچھا نہیں کہتا آنٹی...... نہیں کہتا۔'' وہ کان چھڑانے کی کوشش میں دہرا ہونے لگا اور احسن نے ہینڈی کیم سے فلم بندی شروع کر دی۔

''چلو، پہلے کہو باجی۔'' شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''باجی...... باجی۔'' وہ بولا۔

عینی نے کان چھوڑ دیا۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر ایک دم دور بھاگ گیا اور بولا۔ ''آنٹی...... آنٹی۔''

سب ہنسنے لگے، زارا نے کہا۔ ''بھئی! اس کا درمیانی راستہ نکال لیتے ہیں۔ تم اسے آنٹی باجی کہہ لیا کرو۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے، آنٹی باجی۔'' عمیر چہکا۔

''آنٹی باجی۔'' چھوٹے احسن نے بھی تائید کی۔

اسی طرح ہنستے، باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ یہاں سے پارک کے ٹکٹ لیے گئے، یہ خاصے مہنگے تھے، یعنی ایک ٹکٹ ساڑھے بتیس یورو کا۔ اس کے علاوہ پارک تک لے جانے والی شٹل بس سروس کا کرایہ ساڑھے سات یورو فی کس تھا۔ یعنی کل ملا کر تقریباً 40 یورو...... پاکستانی کرنسی کے حساب سے یہ کم و بیش 4400 روپے فی کس بنتا تھا۔ اس حساب سے انہیں خاصی رقم ادا کرنا پڑی لیکن یہاں بھی عینی نے شہزاد کی ایک نہیں چلنے دی اور سارے ٹکٹ خود ہی لیے۔

شٹل بس سروس کے ذریعے وہ لوگ Parc Asterix کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ نہایت صاف ستھری لیکن سنسان سڑکوں کا سفر تھا۔ چاروں طرف ہریالی تھی۔ وہ جوں جوں پارک کے نزدیک پہنچ رہے تھے، بچوں کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کا سفر بچوں کو آدھے دن کی طرح لگ رہا تھا۔

آخر وہ پارک میں داخل ہوئے، یہ ایک نئی دنیا تھی۔ انہیں یوں لگا جیسے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہے ہوں۔ وہی گرد و پیش اور وہی مناظر تھے جو ڈزنی لینڈ کے داستانی کارٹونوں میں نظر آتے ہیں۔ پرانے قلعہ جات...... خوفناک قید خانے، خندقوں پر بنے ہوئے پل اور پھر قدیم غار، جنات اور پری زادوں کے بڑے بڑے مجسمے۔ کچھ تعمیرات کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ رومن دور کی کسی بستی میں آپہنچے ہوں۔ اسی طرز کے مکان، ریستوران، گلیاں اور چوراہے۔ وہ جدھر نظر اٹھاتے تھے حیرت ان کی منتظر تھی۔ بچے گرد و پیش دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور عینی انہیں دیکھ کر۔ ان لمحوں میں وہ بڑی Caring نظر آئی، ہر لحظہ بچوں کا خیال رکھتی ہوئی۔

مختلف جھولوں اور تفریحات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے شائقین کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ کہیں قطاریں چھوٹی تھیں، کہیں بہت لمبی، سب سے لمبی قطار جدید طرز کی رولر کوسٹر کے لیے تھی۔ عینی اور زارا کا خیال تھا کہ وہاں رش

کرشمہ

ہم نے کراچی کے ایک قدیم باشندے سے پوچھا کہ یہاں مانسون کا موسم کب آتا ہے؟ اس بزرگ باراں دیدہ نے نیلے آسمان کو تکتے ہوئے جواب دیا کہ چار سال پہلے تو بدھ کو آیا تھا!

یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ کراچی میں بارش نہیں ہوتی۔ البتہ اس کا کوئی وقت اور پیمانہ معین نہیں ہے لیکن جب ہوتی ہے تو اس انداز سے گویا کسی مست ہاتھی کو زکام ہوگیا ہے۔ سال کے بیشتر حصے میں بادلوں سے ریت برستی رہتی ہے۔ لیکن جب چھٹے چھماہے دو چار چھینٹے پڑ جاتے ہیں تو چٹیل میدانوں میں بیر بہوٹیاں اور بہو بیٹیاں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے نکل پڑتی ہیں۔ اس قسم کا موسم بے تحاشا ''رش'' لیتا ہے۔

مغربی پاکستان میں برکھارت اور کراچی میں جولائی کا مہینا تھا۔ سمت کیماڑی سے مکھیوں کے دل بادل امنڈ امنڈ کر آرہے تھے۔ چنانچہ میں مچھر دانی میں بیٹھا آم چوس رہا تھا کہ مرزا عبدالودود بیگ آ نکلے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ لاحول ولاقوۃ! یہ بھی کوئی موسم ہے...... جیسے کسی اقبالی مجرم کو ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے ہوں! ادھر کمبخت مکھیاں اس قدر لدھڑ ہوگئی ہیں کہ اڑنے کا نام نہیں لیتیں! آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ واقعہ ہے کہ صبح قسائی نے میرے سامنے آدھ سیر ران کا گوشت تول کر قیمہ کوٹا۔ میں برابر پنکھا جھلتا رہا لیکن گھر پر بیگم نے تولا تو پورا تین پاؤ نکلا!

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ''چراغ تلے'' سے اقتباس

زیادہ ہے اس لیے رولر کوسٹر کی سواری بعد میں کی جائے گی۔

شہزاد جھولوں پر بیٹھنے سے کترا رہا تھا۔ تاہم عینی اور زارا کے مجبور کرنے پر اسے ایک دو جھولوں پر بیٹھنا پڑا۔ ہلکی سی گرمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ شائقین کو گرمی سے محفوظ رکھنے کے لیے ان پر متحرک فواروں کے ذریعے پانی کی پھواریں پھینکی جا رہی تھیں۔ خاص طور پر جہاں دھوپ میں قطاریں لگی ہوئی تھیں وہاں کی فضا کو ٹھنڈا کیا جا رہا تھا۔ عینی ایک ایسے ہی فوارے کے عین سامنے کھڑی ہوگئی اور خود کو پوری طرح بھگو لیا۔ اس کی دیکھا دیکھی عمیر اور احسن نے بھی ایسا ہی کیا۔ ماحول کی مستی ہر ایک کو اپنے رنگ میں رنگ رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نے اپنی قمیص اتاری اور پھوار سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس فرانسیسی کی عمر پچپن ساٹھ سال رہی ہوگی، جسم ڈھلکا ہوا، تاہم چہرہ دلکش تھا۔ بہت سے لوگ اس کی طرف توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ زارا نے بتایا۔ ”یہ شخص یہاں کا پاپولر گلوکار ہے...... پال نام ہے اس کا۔ ہالی وڈ کی ایک دو فلموں میں بھی کردار ادا کر چکا ہے۔ پچھلے دنوں ایک جاپانی گلوکارہ سے اس کا معاشقہ بڑا مشہور ہوا تھا۔“

اسی دوران میں ایک دو خواتین نے اس سے بغلگیر ہو کر اس سے آٹوگراف لیے۔

زارا بولی۔ ”انکل جی! آپ بھی تو شوبز سے وابستہ ہیں۔ آپ کی بنائی ہوئی درجنوں کمرشلز پاکستان میں اور پاکستان سے باہر بے حد پاپولر ہوئی ہیں۔ آپ کے اردگرد بھی تو ماڈلز کا ہجوم رہتا ہوگا اور ان میں بہت سی خواتین بھی ہوتی ہوں گی...... بلکہ میرا خیال ہے، زیادہ خواتین ہی ہوتی ہوں گی۔“

”ہاں بھئی، ایسا تو ہر جگہ ہوتا ہے۔“

”آپ جس مزاج کے ہیں، آپ کو تو اس ماحول میں بڑی مشکل پیش آتی ہوگی۔“

”دراصل اپنا ماحول بندہ خود بناتا ہے۔“ شہزاد نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھے برے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور...... اچھا برا ماحول بھی ہر جگہ بنایا جا سکتا ہے۔ ابھی پرسوں کے اخبار میں، میں ایک چرچ کی خبر پڑھ رہا تھا۔ ایک نیم برہنہ لڑکی شدید زخمی حالت میں پائی گئی۔ عبادت گاہ سے مقدس جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے لیکن گمراہ لوگ ایسی جگہوں کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لیتے ہیں۔“

”یہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔“ زارا نے ہنکارا بھرا۔ ”مگر......“ وہ خاموش ہوگئی۔

”مگر کیا؟“

”پلیز، برا نہ مانیے گا۔ میرا مطلب ہے کہ ہماری آنٹی تو ایک عرصے سے بیمار ہیں، کیا آپ کے ذہن میں کبھی دوسری شادی کا خیال نہیں آیا؟“

”بالکل نہیں زارا۔ میں اپنی زندگی سے بالکل مطمئن ہوں۔ سچ پوچھو تو میں اپنے کام میں اتنا مگن ہو چکا ہوں کہ اب میرے پاس ایسی باتوں کے متعلق سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں ہے اور ویسے بھی اب تو زندگی کی شام ہو رہی ہے۔“

زارا نے ایک گہری سانس لی۔ ”شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے انکل! مشرق اور مغرب میں بڑا فرق ہے۔ دونوں جگہوں پر راحتوں اور تکلیفوں کے معنی مختلف ہیں...... اچھائی اور برائی...... مناسب اور غیر مناسب کے پیمانے بھی علیحدہ ہیں۔“

شہزاد نے گھڑی دیکھی۔ ”ڈھائی بج رہے تھے، اس نے ہوٹل میں فاخرہ کو فون کیا اور خیریت دریافت کی۔ اس کے لیے اس نے زارا کا موبائل استعمال کیا۔ سیر کے دوران میں وہ گاہے بہ گاہے فاخرہ سے رابطہ کرتا رہتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک طرف سے عمیر بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے بتایا کہ بڑی رولر کوسٹر جو کچھ دیر کے لیے خراب ہوگئی تھی یا روک دی گئی تھی پھر سے چلنے لگی ہے۔

یہ بڑا سنہری موقع تھا۔ کوسٹر کے رک جانے کی وجہ سے شائقین کی طویل قطار ٹوٹ چکی تھی۔ لوگ دوسری تفریحات میں مشغول ہوگئے تھے۔ اب کوسٹر دوبارہ چلی تو یقینی بات تھی کہ لوگ پھر اس کی طرف دوڑیں گے۔ شہزاد، زارا، عینی وغیرہ چونکہ اس وقت اتفاقاً کوسٹر کے قریب ہی تھے اس لیے انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ سب دوڑتے ہوئے گئے اور قطار میں جا کھڑے ہوئے اور ایسا کرنا ان کے لیے مفید ہی ثابت ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوسٹر والی قطار طویل سے طویل ہونے لگی۔ بہرحال ان کے آگے ڈیڑھ دو سو سے زیادہ افراد نہیں تھے۔ قطار کو درست حالت میں رکھنے کے لیے دونوں طرف آہنی جنگلوں کا سلسلہ تھا۔ شہزاد نے محسوس کیا کہ ایسے جنگلوں اور باڑوں کی ضرورت پاکستان میں کہیں زیادہ ہے۔ اکثر یہ لوگ ان رکاوٹوں کے بغیر بھی نظم وضبط کا مظاہرہ کرتے تھے۔ شہزاد نے یہاں ابھی تک کسی بس یا ٹرین میں ٹکٹ چیکنگ کی کارروائی نہیں دیکھی تھی۔ ٹریفک قوانین پر عمل درآمد کرانے کے لیے بھی کہیں پولیس اہلکاروں کے جمگھٹے نظر نہیں آئے۔ یہی صورت حال باقی شعبہ جات میں بھی تھی۔ سارے نظام، آپوں آپ ایک طے شدہ ہموار رفتار سے چلتے جاتے تھے۔ بے شک نگرانی کے لیے جدید الیکٹرانک آلات بھی ہر جگہ موجود تھے، تاہم ان کی حیثیت ثانوی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں رولر کوسٹر کے سامنے بھی شائقین کی قطار لگے بندھے اصول کے مطابق آگے کی جانب کھسکتی رہی۔ سب سے آگے عمیر اور احسن تھے، پھر زارا اور اس کا بچہ تھے۔ اس کے پیچھے شہزاد اور اس کے پیچھے عینی۔

دائیں طرف کوسٹر حیرت انگیز بلندیوں کو چھوتی، بل کھاتی، غوطہ لگاتی اور برق کی طرح کوندتی ہوئی لوگوں کو محظوظ کر رہی تھی۔ کوسٹر میں موجود شائقین کے چلانے کی آوازیں اس تفریح کا ایک لازمی جزو تھیں۔ آہنی لائنوں کے ساتھ کوسٹر کی رگڑ کی گونج دار آواز کے ساتھ ہی شائقین کے چلانے کی صدائیں بھی بلند ہونے لگتی تھیں۔

جن مقامات پر بے پناہ نظم وضبط کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہاں بھی کسی وقت تھوڑی بہت بدنظمی ہو ہی جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال رولر کوسٹر کے سامنے لگنے والی اس قطار میں بھی پیش آئی۔ ان کے عقب میں شائقین کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ سیاہ فام نوجوانوں کی ایک ٹولی آپس میں جھگڑ پڑی۔ اس جھگڑے کی وجہ سے قطار میں ایک لہر پیدا ہوئی۔ پیچھے سے ایک دم دباؤ آگے کی طرف آیا۔ شہزاد، زارا پر گرا۔ زارا کے آگے بچے تھے۔ شہزاد نے پوری طاقت سے جنگلا تھام لیا تاکہ زارا اور بچوں پر زیادہ دباؤ نہ پڑے۔ عقب سے عینی شہزاد کے اوپر ڈھے گئی۔ عینی کے پیچھے ایک موٹی تازی، میک اپ زدہ فرنچ خاتون تھی۔ اس کی سنہری مائل وگ اتر کر دور جا گری اور وہ واویلا کرنے لگی۔ پریشان کن صورتِ حال کے باوجود لوگ مسکرانے پر مجبور ہوگئے۔

عینی نے بلند آواز میں زارا کو مخاطب کر کے کہا۔ ”بگ سسٹر! تم اپنی وگ سنبھال کر رکھنا۔“

”میری وگ اصلی ہے، تم اپنی ساڑی کا خیال رکھو، کہیں وہ نہ نکل جائے۔“ زارا نے ترت جواب دیا۔

عینی عقب سے شہزاد کے ساتھ چپک گئی تھی۔ شہزاد نے اس کے پورے جسم کو اپنے عقب میں محسوس کیا۔ اس کے سیاہ بال شہزاد کے چہرے پر بکھر رہے تھے۔ اس کے دونوں بازو شہزاد کے بازوؤں کے نیچے سے گزر کر اس کے سینے پر تھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی خود کو گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شہزاد نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور شاید یہ بھی اس کی غلطی تھی۔ اسے ان لمحوں میں اس طرح اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ وہاں نجمہ کی آنکھیں تھیں، وہ آنکھیں جو ہمیشہ بولتی تھیں۔ راز کی باتیں کہتی تھیں...... جن کے اندر گئے وقتوں کے فسانے چھپے رہتے تھے۔

ایک لحظے کے اندر جیسے شہزاد کے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہ نکلا۔ اس کا دل چاہا وہ ایک سیکنڈ میں عینی سے دور چلا جائے۔ اس کے پاس سے، اس کے جسم کی حدت سے، اس کے لمس سے ہٹ جائے اور پھر ہٹتا چلا جائے۔ اتنی دور چلا جائے کہ اس کی سوچ بھی اسے چھو نہ سکے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ کم از کم ان لمحوں میں تو نہیں، دونوں طرف آہنی جنگلا تھا اور قطار کا دباؤ انہیں ایک دوسرے سے پیوست کرتا چلا جا رہا تھا۔ یہ عجیب وغریب لمحے تھے۔

اسی دوران میں گارڈز پہنچ گئے۔ انہوں نے قطار میں موجود ابتری کو تیزی سے ختم کیا اور جھگڑنے والے تین چار نوجوانوں کو قطار سے نکال کر دوسری طرف لے گئے۔ یہ سب کچھ بس دو تین منٹ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ تاہم یہ جو کچھ ہوا تھا شہزاد کے دل ودماغ کے لیے ازحد تہلکہ خیز تھا۔

اسے لگا تھا کہ آج عینی نے نہیں نجمہ نے اسے چھوا ہے۔ ہاں یہ وہی جسم تھا، یہ وہی خوشبو تھی، سب کچھ وہی تھا۔ بس مقام اور وقت بدل گئے تھے۔ تقریباً اٹھائیس سال پہلے کی بات ہے، ایک ون ڈے کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے سب کزن لاہور کے قذافی اسٹیڈیم میں گئے تھے۔ شدید ترین رش تھا۔ انہیں ایک قطار میں اندر جانا پڑا تھا۔ وہاں بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہی ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تب لائن کو لگنے والا دھکا پیچھے سے نہیں آگے سے آیا تھا۔ پولیس والوں نے لوگوں کو دروازے سے دور دھکیلا تھا۔ شہزاد کے آگے فرزانہ تھی، عقب میں نجمہ اس کے پیچھے نجمہ اور فرزانہ کا چھوٹا بھائی سکندر اور پھر حسنات۔ فرزانہ قطار میں ابھرنے والی لہر کے زور سے پیچھے ہٹی تھی تو شہزاد اور نجمہ باہم پیوست ہوگئے تھے۔

ہاں یہ وہی جسم تھا، یہ وہی آنکھیں تھیں لیکن اس ستم کو کیا کیا جاتا کہ درمیان میں پوری ایک نسل کا خلا تھا۔ جس جسم میں شہزاد نے نجمہ کے لمس اور خوشبو کو محسوس کیا تھا وہ عینی کا تھا۔ جو فرزانہ کی بیٹی تھی اور عمر میں اس سے بہت چھوٹی تھی۔

رولر کوسٹر کا سفر جو بس ایک ڈیڑھ منٹ کا تھا نہایت سنسنی خیز تھا۔ زمین وآسمان ان کی نگاہوں میں گھوم گئے لیکن یہ شدید ترین سنسنی خیزی بھی شہزاد کو کم لگی، اس کے دل ودماغ میں تو کچھ اور طرح کا طوفان بپا تھا۔

جب دونوں بچے عینی کے ساتھ پارک کی سیر کر رہے تھے، جھولوں پر چڑھ اور اتر رہے تھے، مصنوعی غاروں میں گھوم رہے تھے، بازی گری کے تماشے دیکھ رہے تھے اور آئندہ تفریحات کے پروگرام بنا رہے تھے...... شہزاد ایک طرف گم صم بیٹھا تھا۔ وہ ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا، اسے جلد

از جلد پیرس سے واپس چلے جانا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز بھی ہالیڈے تھا لہذا پارک سے واپسی پر زارا اور عینی کا پروگرام بنا کہ وہ رات کو شہزاد کی فیملی کے ساتھ ہوٹل میں ہی رہیں گی۔ ہوٹل کے ضوابط کے مطابق تو یہ غلط تھا بہرحال ..... ایسی چھوٹی موٹی بے اصولی تو کی ہی جاتی ہیں۔ رات کو انہوں نے ہوٹل کے لان میں باربی کیو ڈنر کیا۔ یہاں دو تین مقامی آرٹسٹوں کے ساتھ عینی نے بڑے فخر سے شہزاد کا تعارف کرایا اور انہیں بتایا کہ یہ پاکستان میں کیا کرتے ہیں۔ وہ لوگ خوش ہوئے، انہیں خوش دیکھ کر عینی کے چہرے کی چمک بڑھ گئی، وہ ان فرنچ حضرات کو اسٹل کیمرے پر شہزاد کی کھینچی ہوئی تصویریں دکھانے لگی۔ ان تصویروں کے حوالے سے دیر تک ٹیکنیکل باتیں ہوتی رہیں۔ ان لوگوں سے رخصت ہو کر شہزاد کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد زارا عینی اور بچے بھی آ گئے۔ رات کو وہ دیر تک جاگتے رہے۔ لطائف سنائے گئے، لوڈو اور مناپلی کھیلی گئی اور گپ شپ ہوتی رہی، تاہم ان ساری مصروفیات کے دوران میں شہزاد بالکل کھویا کھویا رہا۔ اسے عینی سے ایک جھجک آمیز خوف آنے لگا تھا، وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس کی آواز اور اس کی ہنسی سے کان بند کرنا چاہتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ لڑکی اس کے حواس میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔

زارا کی پرزور خواہش تھی کہ دو تین روز کے لیے پیرس کی کسی اچھی کیمپ سائٹ پر کیمپنگ بھی کی جائے۔ وہ بولی ''یہاں آگے دریا کے کنارے بھی ایک کیمپ سائٹ ہے، ہم چار پانچ دفعہ وہاں جا چکے ہیں۔ یقین کریں انکل مزہ آ جائے گا۔ چارجز بھی کوئی بہت زیادہ نہیں ہیں۔ ایک خیمے کے لیے قریباً 25 یورو روزانہ اور ان 25 یورو میں واش روم، گرم ٹھنڈا پانی، ریسٹورنٹ اور سیکیورٹی وغیرہ کی ساری سہولتیں شامل تھیں۔''

''تو کیا ایک خیمے میں ہم سب آ جائیں گے؟'' فاخرہ نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں آنٹی! ہمارے پاس بڑا ٹینٹ ہے۔ اس کے دو پورشن ہیں، سمجھیں کہ ایک چھوٹا سا گھر ہے بلکہ میں تو کوشش کروں گی کہ ریحان بھی تیار ہو جائیں۔''

''ہاں ...... وہاں ایئرپورٹ پر ایک کیمپنگ سائٹ کی تصویر تو میں نے بھی دیکھی تھی۔ دریا کے ساتھ ساتھ بے شمار خیمے تھے اور بہت سے کاروینز (رہائشی ٹریلرز) بھی کھڑے تھے۔''

''اس کیمپ سائٹ کا بڑا مشکل سا نام ہے...... او گاڈ'' عینی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''بہرحال جگہ اچھی ہے، آپ دیکھیں گی تو مزہ آ جائے گا۔''

بچے بھی اس معاملے میں زبردست دلچسپی ظاہر کرنے لگے۔ کیمپنگ کے لیے جمعے کی شام کا پروگرام بن گیا۔ اس سارے پروگرام کے دوران میں شہزاد بس ہوں ہاں پر اکتفا کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں بس ایک دم گھونٹنے والی دھند کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

دوسرے روز لنچ کے بعد عینی اور زارا وغیرہ گھر واپس چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد شہزاد نے اپنے فرانسیسی دوست مسٹر موشیل کو فون کیا۔ اگلے 36 گھنٹے میں اس نے مسٹر موشیل کے ساتھ مل کر وہ چند ضروری امور نمٹائے جو یہاں اس کے شیڈول کا حصہ تھے۔ اس کے بعد وہ سیدھا ایئر لائن کے دفتر پہنچا۔ اس نے واپسی کے لے دستیاب پہلی پرواز پر نئی ریزرویشن کرالی۔ ریزرویشن کی تاریخ میں تبدیلی کے لیے اسے کچھ سرچارج بھی دینا پڑا جو اس نے بخوشی دے دیا۔ ایک دم ہی پیرس سے، پیرس کی گہما گہمی اور پیرس کے مکینوں سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

گھر آ کر جب اس نے فاخرہ اور بچوں کو یہ اطلاع دی کہ وہ پرسوں پاکستان واپس جا رہے ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ بے شک فاخرہ کی طبیعت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن ایسی بات بھی نہیں تھی کہ وہ آناً فاناً یہاں سے روانگی کا قصد کر لیتے۔ بچوں کے چہرے بھی ایک دم اتر گئے۔

فاخرہ نے حیران ہو کر کہا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مذاق تو نہیں کر رہے؟''

''مذاق نہیں کر رہا ہوں۔'' وہ خشک لہجے میں بولا۔ ''واپس جانا ضروری ہو گیا ہے۔ وہاں دفتر میں ایک دو مسئلے کھڑے ہو گئے ہیں۔ منیجر جمال انہیں حل نہیں کر پا رہے۔ نہ گئے تو کافی نقصان ہو جائے گا۔ کلائنٹس علیحدہ سے مصیبت میں پڑیں گے۔''

''ل ل...... لیکن اتنی جلدی شہزاد؟ کم از کم آٹھ دس دن تو......''

''فاخرہ'' شہزاد نے تیزی سے کہا۔ ''جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ رہی ہو۔ پیرس ہم پھر بھی آ سکتے ہیں لیکن ادھر کام بگڑ گیا تو پھر نہیں سدھر سکے گا۔''

بچوں کے چہرے رونے والے ہو گئے۔ شہزاد کے دل میں بچوں کی مایوسی ایک تیز دھار خنجر کی طرح لگی۔ عام

حالات میں وہ ان کے ماتھے پر ذرا سی شکن بھی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اپنی موجودہ کیفیت میں وہ سب کچھ برداشت کر گیا۔

اس نے علیحدگی میں فاخرہ کو اچھی طرح سمجھایا کہ وہ فرزانہ کی فیملی سے اپنی واپسی کا بالکل ذکر نہیں کرے گی اور نہ ہی بچے اس بارے میں کوئی بات کریں گے۔ شہزاد کا موڈ ایسا تھا کہ فاخرہ سہم کر رہ گئی۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''لیکن شہزاد! چھپانا کیوں ضروری ہے، ہم ان کے پابند تو نہیں ہیں...... اگر واقعی وہاں کوئی کام ہے تو......''

''بس، میں نے کہہ دیا ناں کہ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔'' شہزاد نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''میں یہاں تماشا لگانا نہیں چاہتا۔ ایئرپورٹ سے میں خود فون کر دوں گا ان کو۔ دیٹس آل۔'' شہزاد کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ فاخرہ اثبات میں سر ہلانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔

جس نے کبھی ترش لہجے میں بھی بات نہ کی ہو، وہ اس قدر کرخت انداز میں بولے تو سننے والا گنگ ہو جاتا ہے۔ فاخرہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

☆☆☆

یہ سیر و تفریح کا سفر جتنے دلکش انداز میں شروع ہوا تھا، اتنے ہی دل گرفتہ اور ہنگامی انداز میں ختم ہوا۔ شہزاد نے اپنے مقامی فرنچ دوستوں سے رات کو ہی الوداعی ملاقاتیں کر لی تھیں۔ اس کے بعد پیکنگ کی گئی۔ صبح انہوں نے اپنے ہوٹل کا فون بند کر دیا تاکہ فرزانہ اینڈ فیملی کی طرف سے کوئی کال آئے بھی تو انہیں سننا نہ پڑے۔

گیارہ بجے کے قریب وہ ہوٹل ''لیونا'' سے چیک آؤٹ کر کے ایئرپورٹ روانہ ہو رہے تھے۔ مطلع ابر آلود تھا۔ مسٹر موشیل اپنی ذاتی اسٹیشن وین میں انہیں ایئرپورٹ چھوڑنے کے لیے جا رہے تھے۔ جب وہ ہوٹل سے سو ڈیڑھ سو میٹر آگے آئے، شہزاد کو وہی سرخ پی جو گاڑی نظر آئی جس پر عینی اور زارا ہوٹل آیا کرتی تھیں۔ کار راؤنڈ اباؤٹ سے ٹرن لے کر ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔ شہزاد نے دیکھا۔ اس میں عینی اور زارا موجود تھیں۔ عینی نے گلابی ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ غالباً فون پر رابطے میں مسلسل ناکام ہونے کے بعد وہ خود ان سے ملنے ہوٹل آ گئی تھیں۔ شاید ان کا خیال ہو کہ وہ اکٹھے بیٹھ کر کل کی کیمپنگ کے بارے میں پروگرام کو حتمی شکل دیں۔ شہزاد نے کن انکھیوں سے فاخرہ اور بچوں کی طرف دیکھا، وہ سرخ پی جو گاڑی کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔

ایئرپورٹ پر کسٹم اور امیگریشن وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچے تو فاخرہ نے اسے پھر یاد دلایا کہ وہ باجی فرزانہ یا عینی وغیرہ کو فون پر اپنے جانے کی اطلاع پہنچا دے۔

شہزاد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ویسے وہ اب دیکھ رہا تھا کہ فاخرہ کے لب و لہجے میں حیرت کا عنصر زیادہ نہیں رہا تھا۔ شاید وہ اس معاملے کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔ بچے ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔ فاخرہ نے ہولے سے کہا۔ ''سچ بتائیں شہزاد! معاملہ دفتر کا ہے یا اور کوئی بات ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''دیکھیں، ناراض نہیں ہونا۔ آپ جو کر رہے ہیں ٹھیک ہی کر رہے ہیں اور سوچ سمجھ کر کر رہے ہوں گے لیکن میں اپنی الجھن دور کرنا چاہ رہی ہوں، کیا شارق وغیرہ کی طرف سے پھر کوئی بات تو نہیں ہوئی ہے؟ یا پھر باجی فرزانہ کی فیملی کی طرف سے؟''

''نہیں ایسا تو کچھ نہیں ہوا۔'' شہزاد نے گہری سانس لی۔ ''لیکن مجھے اس سارے میل جول میں اندیشے ہی نظر آ رہے ہیں۔ باقی دفتر والا معاملہ بھی اپنی جگہ موجود ہے۔'' شہزاد نے گول مول بات کی۔ پھر فرزانہ کو اطلاع دینے کے لیے فون بوتھ کی طرف بڑھ گیا۔

ان لوگوں کو اس طرح اچانک اپنی آمد کی اطلاع دینا کافی ناخوشگوار کام تھا، بہرحال شہزاد کو یہ کرنا پڑا۔ ''ہیلو...... کون؟'' دوسری طرف سے فرزانہ کی آواز ابھری۔

''میں شہزاد بول رہا ہوں۔''

''او ہو، شہزاد، کہاں تھے تم لوگ۔ فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔ عینی اور زارا اتنی پریشان تھیں۔ اب وہ تمہاری ہی طرف گئی ہیں۔ ابھی پہنچی نہیں؟'' اس نے پوچھا۔ پھر خود ہی بولی۔ ''میرا خیال ہے سپر مارکیٹ میں رک گئی ہوں گی، عینی کہہ رہی تھی کل کے لیے کچھ سامان لینا ہے......''

شہزاد نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''سوری فرزانہ! میں تمہیں بروقت اطلاع نہیں دے سکا۔ میں اس وقت ایئرپورٹ سے بول رہا ہوں۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد یہاں سے ہماری فلائٹ ہے پاکستان کے لیے۔''

دوسری طرف چند سیکنڈ کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔ تب فرزانہ کی حیرت زدہ آواز ابھری۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو شہزاد۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''میں ایک بار پھر بہت معذرت چاہتا ہوں فرزانہ۔ جو کچھ ہوا اتنی جلدی ہوا کہ کئی کام ادھورے رہ گئے۔ وہاں لاہور کے دفتر میں ایک دو ایسے مسئلے پیدا ہو گئے ہیں کہ میرا

پہنچنا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ فاخرہ اور بچے بھی بڑے پریشان ہیں۔ ہم سب یہاں رہنا چاہتے تھے خاص طور سے آپ سب کی محبت نے یہاں بہت دل لگا دیا تھا ہمارا...... لیکن اب اس مجبوری کو کیا کیا جائے ...... میں کل رات بھی...... آپ کو فون کرتا رہا لیکن آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔'' آخر میں شہزاد کو تھوڑی سی غلط بیانی کا سہارا لینا پڑا۔

فرزانہ واقعی ششدر تھی، اگلے دو تین منٹ میں شہزاد نے اس کی حیرت اور پریشانی کو کم کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ پتا نہیں کہ وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا۔ بہر حال فون پر فرزانہ کو اطلاع دینے کے بعد اس نے خود کو کسی حد تک ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

کچھ دیر بعد جب ان کے جہاز نے پیرس کے نہایت مصروف ایئر پورٹ سے پرواز کی تو سارا پیرس ان کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اپنی تمام تر خوبصورتی اور وسعت کے ساتھ وہ حد نگاہ تک ان کے سامنے پھیل گیا۔ شہر کی رنگت میں سفیدی کا رنگ غالب تھا۔ عمیر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس نے بجھے بجھے سے لہجے میں ایک فقرہ ادا کیا اور اس فقرے سے شہزاد کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''وہ دیکھو حسن...... ایفل ٹاور۔''

وہ پیرس آئے تھے اور ایفل ٹاور بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔

کیا وہ واقعی ایفل ٹاور نہیں دیکھ سکے تھے؟

شہزاد کو شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ وہ ایسی افراتفری میں یہاں سے روانہ ہوئے تھے کہ بہت سے پروگرام درمیان میں ہی رہ گئے تھے اور ان میں ایفل ٹاور کا پروگرام بھی شامل تھا۔ افسوس آمیز مایوسی کی ایک لہر سی شہزاد کے سینے میں پھیلتی چلی گئی۔ کالج میں اس کے انگلش کے پروفیسر افضال قریشی صاحب کہا کرتے تھے...... زندگی میں جو خوشی جائز طریقے سے مل رہی ہو اسے جلدی سے حاصل کر لینا چاہیے۔ اس میں خوامخواہ کی تاخیر بھی کفران نعمت کے زمرے میں آ جاتی ہے۔

ان کا کہا ہوا یہ جملہ آج اس صورت حال پر بالکل منطبق ہو رہا تھا۔ بیس پچیس روز پہلے جب وہ پیرس میں اترے تھے، بچوں نے کھڑکی میں سے ایفل ٹاور کی جھلک دیکھ کر شور مچایا تھا کہ چلیں ابھی ایفل ٹاور دیکھنے چلیں۔ تب شہزاد نے مزہ لیتے ہوئے کہا تھا...... بھئی ایفل ٹاور تو پیرس کی سیر کا کلائمکس ہے۔ کلائمکس ابھی دیکھ لیا تو باقی ''فلم'' کا خاک مزہ آئے گا اور اب بہت سی دوسری چیزوں کے ساتھ یہ کلائمکس بھی رہ گیا تھا۔

شہزاد نے دل گرفتہ ہو کر عمیر کے کندھوں پر بازو رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ڈونٹ وری بیٹا! ہم پھر آئیں گے پیرس اور تب بہت دنوں تک رہیں گے۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ بس کھوئی کھوئی نظروں سے ایفل ٹاور کو دیکھتا رہا۔

نیچے پیرس کے درمیان سے گزرتا ہوا دریائے سین ایک مٹیالی پٹی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس میں کشتیوں اور بجروں کے سفید نکتے متحرک تھے۔ شہزاد نے سوچا اسی دریا کے کنارے کہیں وہ دونوں بوڑھے فرانسیسی بھی بیٹھے ہوں گے، جن کا کام ہی وہاں بیٹھنا اور گئے دنوں کے بارے میں سوچنا تھا۔ شہزاد کا ارادہ تھا کہ پیرس چھوڑنے سے پہلے وہ ایک بار ان دونوں بوڑھوں کے پاس ضرور جائے گا۔ ان کو قریب سے دیکھے گا اور ان سے دو چار باتیں کرنے کی کوشش کرے گا مگر یہ کام بھی اس عجیب و غریب افراتفری کی نذر ہو گیا تھا جو آناً فاناً شہزاد کے دل و دماغ میں سمائی تھی۔ وہ اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔

اس نے جہاز کی کھڑکی سے نیچے متحرک پیرس کو دیکھا جو دھیرے دھیرے بادلوں کے مرغولوں میں گم ہونے لگا تھا۔ ''خدا حافظ پیرس'' اس نے دل ہی دل میں کہا اور نشست سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

وہ پیرس سے لوٹ آیا، لیکن اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا، ٹوٹ کر بری طرح بکھر گیا تھا، اس ''بکھرے ہوئے'' کی کرچیاں گاہے بہ گاہے شہزاد کے سینے کو چھیدتی تھیں۔

وہ رات کو بستر پر لیٹتا تو دو آنکھیں اس کے تصور میں آ جاتیں۔ یہ آنکھیں اس سے کہتیں، شہزاد کہاں چلے گئے؟ کیوں ایک دم مجھے چھوڑ گئے۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا، میں تمہارے لیے، پیرس کی گلیوں میں اور چوراہوں میں بھٹکتی رہوں گی۔ دریائے سین کے کناروں پر اور نوٹرے ڈیم کے آس پاس اور شانزالیزے کی فٹ پاتھوں پر تمہیں تلاش کرتی رہوں گی، تم کتنے سخت دل ہو شہزاد! میں برسوں کا فاصلہ طے کر کے اور جدائی کی لاتعداد گھڑیاں گزار کر تم تک پہنچی ہوں اور تم یوں ایک دم مجھ سے منہ موڑ کر چلے آئے ہو؟

وہ خود کو ملامت کرتا اور سوچتا کہ وہ اس طرح کیوں ''سوچ'' رہا ہے۔ کیوں اس کا ذہن ایک ہی رخ پر چلتا جا رہا ہے۔ وہ نجمہ جیسی آنکھیں ہوں گی...... چلیں مان لیں کہ وہ نجمہ کی آنکھیں ہی ہیں لیکن وہ عینی کے جسم پر ہیں اور عینی...... اس کی ماموں زاد کی بیٹی ہے۔ اس سے اٹھائیس سال چھوٹی ہے۔ اس کے بارے میں تو اس طرح سے سوچنا بھی قابل

مذمت ہے۔ وہ خود کو بہت سمجھاتا مگر...... ٹوٹی ہوئی شے کی کرچیاں مسلسل چبھتی رہتیں۔ اس کے اندر کوئی خلا پیدا ہو چکا تھا اور یہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی وقت اس کے ذہن میں عینی کا چہرہ آتا...... اور وہ زوردار تھپڑ بھی جو اس نے عینی کے گال پر رسید کیا تھا۔ اس تھپڑ کے نتیجے میں عینی کے نچلے ہونٹ پر ننھا سا زخم ہو گیا تھا۔ وہ زخم شہزاد کی نگاہوں کے سامنے آتا اور وہ یاسیت سے بھر جاتا۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ کیا وہ اسے کسی اور طریقے سے نہیں سمجھا سکتا تھا اور اگر اس نے ایسا کر ہی دیا تھا تو کیا بعد میں اس سے سوری نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی ایسی تھی کہ اس نے ایک حرف شکایت بھی زبان پر نہیں لائی تھی۔ ایک ''ناراض نگاہ'' بھی اس پر نہیں ڈالی تھی۔

دن گزرتے رہے۔ پیرس میں فرزانہ کی فیملی کی طرف سے کوئی رابطہ ہوا نہ انہوں نے کیا۔ شارق وغیرہ کی بھی کوئی خبر نہیں ملی۔ شہزاد کراچی میں آتے ہی ایک بار پھر اپنے کام میں غرق ہونے کی کوشش کرنے لگا اور واقعی پچیس تیس روز کے اندر ہی اس کے لیے کافی سارا کام اکٹھا ہو گیا تھا۔ تین چار کمرشلز کو ایک مہینے کے اندر شوٹ کرنا ضروری تھا۔ ایک کمرشل مری میں شوٹ ہونا تھا اور وہاں کئی ہفتوں کے بعد موسم بہتر ہوا تھا۔ شہزاد اپنے مختصر یونٹ کو لے کر مری روانہ ہو گیا۔ مری میں انہیں قریباً چھ روز ٹھہرنا تھا۔ فاخرہ کی طبیعت بدستور ڈانواں ڈول تھی۔ وہ مری سے بھی ہر روز دو تین دفعہ گھر فون کرتا تھا۔ آخری روز جب وہ اپنی دو ''فی میل'' ماڈلز کو آخری شاٹس کے بارے میں فائنل ہدایات دے رہا تھا، اسسٹنٹ نے اسے موبائل فون تھمایا۔ اس نے کال ریسیو کی، یہ کال ایک تشویش ناک خبر کے ساتھ آئی تھی۔ گھریلو ملازم طفیل نے اسے بتایا تھا کہ بیگم جی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر کو گھر بلایا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ انہیں فوراً اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے۔ شہزاد نے باقی کام اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کیا اور خود بھاگم بھاگ مری سے واپس کراچی پہنچا۔ تب تک فاخرہ کو اسپتال میں ایڈمٹ ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔

وہ پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو میں بے ہوش پڑی تھی۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اگلے دو ہفتے شہزاد کے لیے اذیت ناک تھے۔ فاخرہ کی حالت کبھی اچھی اور کبھی خراب ہو رہی تھی۔ اس کی دائیں ٹانگ تو شروع سے ہی نیم مفلوج تھی، اب پورا دایاں پہلو مفلوج ہو گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے جسم کے اس حصے کو حرکت دینے سے قاصر تھی۔

شہزاد ایک طرف بچوں کو سنبھال رہا تھا، دوسری طرف اسپتال کی بھاگ دوڑ تھی، تیسری طرف کام کا دباؤ بھی گاہے بہ گاہے اثر انداز ہو رہا تھا۔ شہزاد کو ڈر لگنے لگا کہ اس شدید تناؤ میں کہیں وہ خود بھی بریک ڈاؤن کا شکار نہ ہو جائے...... بہر حال دو تین ہفتے بعد حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے۔ شہزاد نے پانی کی طرح پیسا بہایا تھا۔ آخر اللہ نے کرم کیا اور فاخرہ اسپتال سے گھر منتقل ہو گئی۔ شہزاد جو گھر اور اسپتال کے درمیان شٹل کاک بنا ہوا تھا قدرے سکون محسوس کرنے لگا۔ فاخرہ کی زندگی تو بچ گئی تھی لیکن وہ مکمل طور پر بستر کی ہو گئی تھی۔ اس کی بہتر نگہداشت کے لیے شہزاد نے دو تجربہ کار نرسوں کا انتظام کیا۔ یوں کم از کم ایک نرس راؤنڈ دا کلاک فاخرہ کے بستر کے پاس موجود رہنے لگی۔ شہزاد خود بھی زیادہ سے زیادہ اسے وقت دینے کی کوشش کرتا تھا۔

قریباً دو ماہ بعد کی بات ہے، نرس اور بچے دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔ رات کے وقت شہزاد اور فاخرہ کمرے میں اکیلے تھے۔ فاخرہ نے اپنا تندرست ہاتھ شہزاد کے ہاتھ پر رکھا ہوا تھا۔ وہ دونوں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ فاخرہ کہہ رہی تھی۔ ''شہزاد! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ پرسوں جواب دوں گا۔''

''کس بات کا جواب؟''

''وہی جو میں نے آپ سے پوچھی تھی۔''

شہزاد نے ایک طویل سانس لے کر ہاتھ سگریٹ کیس کی طرف بڑھایا لیکن پھر ارادہ ملتوی کرتے ہوئے بولا۔ ''فاخرہ! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتا۔ میں بالکل مطمئن ہوں۔''

''لیکن میں مطمئن نہیں ہوں شہزاد۔ میں جانتی ہوں آپ کو ضرورت ہے، آپ کو دوسری شادی کی ضرورت ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میں یہ کام اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے کر جاؤں۔ میں جب خود آپ کے لیے بیوی لاؤں گی تو وہ میرے بچوں کا بھی خیال رکھے گی... اور آپ دیکھ لینا شہزاد، میں جس کو لاؤں گی وہ آپ کی زندگی کو بہت خوبصورت بنا دے گی۔''

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کوئی تمہاری نظر میں ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

''نظر میں تو نہیں لیکن جب میں تہیہ کر کے ڈھونڈوں گی تو مجھے مل جائے گی۔ ضرور مل جائے گی۔'' وہ فالج کے سبب ذرا سا اٹک کر بولتی تھی۔

''ٹھیک ہے، اگر تم ضرور ڈھونڈنا چاہتی ہو تو ڈھونڈو،

لیکن اگر وہ مل گئی تو اس سے شادی تم کو خود ہی کرنا پڑے گی۔ میں نہیں کروں گا۔"

"مذاق نہیں شہزاد۔ میں بہت سنجیدہ ہوں، میں جب آپ کی طرف دیکھتی ہوں تو میرا دل روتا ہے۔ میری روح زخمی ہوتی ہے، میں اندر سے مسمار ہونے لگتی ہوں شہزاد۔" فاخرہ کی آواز بھرا گئی۔

اس کی ایک آنکھ تو ویسے ہی نم رہتی تھی دوسری بھی نم ہوگئی۔ "میں نے ہمیشہ آپ سے لیا ہی لیا ہے شہزاد! اور آپ نے ہمیشہ دیا ہی دیا ہے۔ ایک زندگی بیت گئی ہے، میں آپ کے احسانوں کے بوجھ تلے دبتی جا رہی ہوں...... دبتی جا رہی ہوں۔"

"کون سے احسان؟ اگر کوئی ایسی بات ہے تو پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے پر احسان کیے ہیں۔"

"غلط کہہ رہے ہیں آپ، بالکل غلط۔ باقی باتیں چھوڑیں، چلیں مجھے ایک بات ہی بتائیں، کتنا زمانہ گزر گیا ہے، جب سے میں آپ کو محسوس کیے جانے کی رفاقت دینے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ احسن کی پیدائش کو گیارہ سال ہونے والے ہیں۔ کیا احسن کی پیدائش کے بعد ہم ایک بار بھی میاں بیوی کی طرح وقت گزار سکے ہیں۔ مجھے بتائیں شہزاد! کیا ایک بار بھی ایسا ہوا ہے؟ دنیا نہیں جانتی، لیکن میں تو جانتی ہوں، میرا دل تو جانتا ہے...... نہیں شہزاد! میں نے ہمیشہ آپ کی ہر بات مانی ہے لیکن اب آپ میری یہ بات مان لیں، میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

اس نے دونوں ہاتھ جوڑنے کی کوشش کی مگر ایک ہاتھ ہی اٹھا سکی۔ شہزاد نے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ چوما اور اسے گلے سے لگا لیا۔ "اچھا، اس بارے میں پھر بات کریں گے، اب چپ ہو جاؤ۔ ڈاکٹر نے کیا کہا تھا؟ تمہیں زیادہ بولنا نہیں چاہیے اور پریشان تو بالکل نہیں ہونا چاہیے۔"

"لیکن شہزاد......"

"شی" شہزاد نے اس کے ہونٹوں کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپ دیا۔

پھر ایک روز شہزاد کو اپنے آفس کے پتے پر ایک خط موصول ہوا۔ یہ عینی کا خط تھا۔ خوبصورت لیٹر پیڈ پر یہ خط، انگلش میں لکھا گیا تھا۔ عینی نے سلام اور رسمی کلمات کے بعد لکھا تھا۔ "مجھے پتا تھا، مائی لارڈ! آپ نے خود کبھی رابطہ نہیں کرنا۔ یہ مشکل کام بھی مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔ ہر وقت سوچتی رہتی ہوں، آپ اس طرح اچانک ہم سب کو دکھی کر کے کیوں چلے گئے آپ نے دفتری کام کا کہا لیکن مجھے لگتا ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ کیا کوئی اور بات تھی؟ کیا آپ مجھ سے ناراض تھے، یا پھر ہم میں سے کسی ایک سے؟

مائی لارڈ! جب آپ یہاں پیرس میں تھے تو پیرس ایک دم بدل گیا تھا۔ ہر چیز میں ایک نیا رنگ نظر آنے لگا تھا۔ اب آپ جا چکے ہیں، وہ رنگ بھی جا چکے ہیں۔ اب پیرس کو اپنی اصلی حالت میں آ جانا چاہیے تھا۔ پر پتا نہیں کیوں وہ پرانا پیرس بھی اب مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا۔ وہ سارے راستے، چوراہے، سبزہ زار اور گلیاں بازار بدل گئے ہیں جہاں جہاں ہم سب اکٹھے گئے تھے۔ میں جب بھی ان جگہوں کو دیکھتی ہوں تو ایک عجیب سی اداسی دل و دماغ کو گھیر لیتی ہے۔ میں نے ان سب جگہوں کو آپ کی نشانیوں کے طور پر سنبھال کر رکھا ہوا ہے اور ہاں...... اس کے علاوہ آپ جناب کی ایک اور نشانی بھی ہے میرے پاس۔ وہ تو ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کون سی؟ یہ آپ خود ڈھونڈیں۔

اور کیا لکھوں مائی لارڈ! آپ کو یاد ہے ایک مرتبہ لوور میوزیم میں گھومتے ہوئے آپ نے عمر کا ذکر کیا تھا...... اور کہا تھا کہ آپ عمر میں مجھ سے بہت بڑے ہیں۔ لہٰذا مجھے بہت محتاط ہو کر بات کرنی چاہیے۔ اس وقت میں آپ کو مناسب جواب نہیں دے سکی تھی...... لیکن اب دیتی ہوں کیونکہ اب میرے اور آپ کے درمیان کافی فاصلہ ہے، کم از کم اتنا تو ضرور ہے کہ آپ اپنا ہاتھ گھما کر مجھے تھپڑ نہیں مار سکتے۔ ویسے پھر بھی میں احتیاطاً تھوڑا سا پیچھے ہٹ جاتی ہوں۔ تو جناب بات ہو رہی تھی عمر کی۔ عمر کوئی چیز نہیں ہے مائی لارڈ، ایک دس سال کے ذہین بچے کو بھی ہم دانا اور بڑا کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک نوجوان کو بھی اس کی سوچ اور ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے بچہ کہا جا سکتا ہے۔ یہی مثالیں ہر عمر کے لیے دی جا سکتی ہیں۔ کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ عمر انسان کے جسم سے ظاہر نہیں ہوتی اس کے ذہن سے ظاہر ہوتی ہے اور اس لحاظ سے میں سمجھتی ہوں کہ آپ جوان بلکہ نوجوان ہیں۔ میں آپ میں اور خود میں عمر کا کوئی تفاوت نہیں پاتی...... اور اگر جناب! ہو بھی تو یہ کوئی برائی تو نہیں۔ کسی چیز کے اچھے لگنے میں عمر شرط تو نہیں ہوتی۔ ہمیں پرانے چاول، شراب، درخت، دریا، آرٹ کے نمونے اچھے لگتے ہیں تو پھر عمر کوئی شرط تو نہ ہوئی۔ اسی طرح کم عمر ہونا بھی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا معیار نہیں ہے۔ آپ حیران ہوں گے، پچھلے دنوں میں نے پاپا سے بھی اس بارے میں کھل کر ڈسکس کیا ہے۔ وہ بہت ہنسے، کہنے لگے او شیطان کی بچی، تجھے کسی بڑی عمر کے سائنسدان یا گالف کے کھلاڑی سے تو پیار نہیں ہو گیا۔

میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "پاپا! اگر ہو گیا تو پھر؟" وہ میری گردن دبوچ کر بولے۔

"پھر بس اتنا دھیان رکھنا کہ مجھے اپنے کسی ہم عمر کو بیٹا جی نہ کہنا پڑے۔" اس بات پر ہم دونوں خوب ہنستے رہے۔ ویسے پاپا بھی بڑی پہنچی ہوئی چیز ہیں مائی لارڈ! اب تو انہیں دل کی تکلیف ہو گئی ہے لیکن چھ سات سال پہلے تک وہ بڑے شوقین مزاج تھے۔ خوبصورت چہرے ان کی کمزوری رہے ہیں جی۔ ماما بھی اس بارے میں سب جانتی ہیں لیکن ایک بات ہے جی پاپا نے خواتین سے دوستیاں ضرور کیں لیکن ہمیشہ ایک حد کے اندر رہتے ہوئے اور ادب آداب کے ساتھ۔ میں ان پر پورا یقین رکھتی ہوں...... ہی از اے ویری جولی اینڈ نائس گائے، مائی لارڈ۔ خیر یہ خط لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ میں ایک بار پھر آپ سے کہوں گی کہ میں آپ کو پسند کرتی تھی، کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ آپ کا پکا پکا شاگرد بننے کی خواہش بھی ہمیشہ میرے دل میں موجود رہے گی۔ بہت دل چاہتا ہے، کاش وہ وقت ایک بار پھر سے لوٹ آئے۔ میں، آنٹی، آپ، عمیر اور بچونگڑے ایک بار پھر پیرس میں اکٹھے ہوں، ایک بار پھر ہماری مسکراہٹیں اور ہمارے قہقہے اس نیم مردہ پیرس کو زندہ کر سکیں۔ بچوں کو میری طرف سے بہت بہت پیار دیں۔ عمیر سے کہیں، تمہاری آنٹی باجی، تمہیں بہت بہت یاد کرتی ہے۔ آنٹی فاخرہ تک میرا اسلام پہنچائیں۔ خدا ان کو صحت دے (عینی کو معلوم نہیں تھا کہ پچھلے دنوں فاخرہ کو فالج ہو چکا ہے)

اور ہاں خط کے آخر میں آپ کا تجسس دور کر ہی دوں۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک آپ کے ذہن میں آپ کی دی ہوئی وہ نشانی نہیں آئی ہو گی جو میں نے بہت سنبھال کر رکھی ہوئی ہے تو جناب! وہ نشانی ہے...... وہ نشانی ہے...... میرے نیچے والے ہونٹ پر زخم کا وہ ننھا سا نشان جو آپ کے خوبصورت طمانچے سے بنا تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ نشان کبھی مکمل طور پر ختم نہ ہو۔ آپ سے ایک ہی درخواست ہے کہ آپ مجھ سے کبھی ناراض نہ ہونا۔ پھر ملنے کی آس کے ساتھ گڈ بائی۔"

خط ختم کر کے شہزاد دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ خط کے آخر میں عینی نے اپنا ای میل ایڈریس اور سیل فون نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ اس طرح اس نے جیسے خاموش درخواست کی تھی کہ وہ اس سے رابطہ کرے۔ عین ممکن تھا کہ اسے بھی شہزاد کا سیل نمبر اور ای میل ایڈریس وغیرہ معلوم ہو چکا ہو، تاہم اس نے ابھی تک دانستہ یا غیر دانستہ ان ذرائع کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

شہزاد پر اس خط کو پڑھنے کے بعد عجیب سی جھلاہٹ سوار ہونے لگی، اس نے خط کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ اپنی عزت کا ہمیشہ اسے بہت پاس رہا تھا اور اس عمر میں تو وہ اس طرح کی کوئی صورت حال برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہاں پیرس میں شارق نے جو کچھ کیا تھا وہ شہزاد کے سینے میں گہرے زخم لگا گیا تھا۔ پتا نہیں کہ شہزاد نے وہ سب کچھ کیسے جھیلا تھا۔ بہت مشکلوں سے اس نے اپنے دل و دماغ کو سمجھایا تھا کہ وہاں شارق نے جو کچھ کیا وہ نشے کی حالت میں کیا۔ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا اور وہ سب کچھ کرنے کے بعد، وہ خود بھی پشیمانی کی لپیٹ میں آیا تھا، یہی وجہ تھی کہ پیرس سے فوراً لندن واپس چلا گیا تھا لیکن اب اگر اس لڑکی کی وجہ سے کوئی نیا فتنہ کھڑا ہوتا تو وہ ہرگز اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے گھر میں فاخرہ کو اس خط کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ چند دن بعد اس نے احتیاطاً اپنے گھر کی فون لینڈ لائن بھی تبدیل کر دی۔ اسے اندیشہ رہتا تھا کہ عینی یا پھر زارا، فرزانہ وغیرہ کی طرف سے پھر رابطے کی کوشش نہ ہو۔ دس پندرہ روز بعد ایک شام شہزاد کو اپنے موبائل فون پر عجیب سا میسج موصول ہوا۔ یہ عینی کی طرف سے تھا۔ میسج یوں تھا "موت کی اطلاع بندے کو دکھ دیتی ہے لیکن میں جھوٹ نہیں بول سکتی، مجھے اس موت سے بالکل دکھ نہیں ہوا۔ بالکل بھی دکھ نہیں ہوا۔ آئی ایم ویری ساری۔" یہ مبہم سا میسج تھا تاہم بہت جلد مبہم نہ رہا۔ لاہور سے اطلاع آئی کہ ممانی کلثوم کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ لے پالک بیٹے اور بہو کے ستم سہ سہ کر دل کی مریض بن چکی تھی۔ آج اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی تھی۔ شہزاد کو آخری رسومات میں شرکت کے لیے لاہور جانا پڑا۔ بہرحال اس کے بعد ڈھائی تین ماہ گزر گئے کسی طرح کا کوئی چھوٹا بڑا واقعہ پیش نہیں آیا۔ گرد و پیش میں ایک ہموار سی خاموشی چھائی رہی، مگر یہ خاموشی زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ ایک دن ایک زوردار چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئی۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ فاخرہ کو ہلکا بخار تھا۔ وہ بستر پر لیٹی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ احسن نے اپنا ہینڈی کیمرا، ٹی وی سے اٹیچ کر رکھا تھا۔ پیرس کی سیر کی ریکارڈنگ چل رہی تھی...... نوٹرے ڈیم کلیسا کے پہلو میں عینی اور بچوں کی اٹکھیلیاں اسکرین پر نظر آ رہی تھیں۔ عمیر نے احسن کو کنکری ماری تھی۔ عمیر اور احسن جوشیلے انداز میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ وہ کھیل کے انداز میں ایک دوسرے کو گرانے اور رگیدنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عینی انہیں چھیڑ رہی تھی۔ اس کی آواز ابھر رہی تھی۔ "اوئے الو بوائے! بس کرو، اس کا

سوئٹر پھٹ جائے گا...... اف گاڈ...... کتنا زور ہے ان دونوں میں۔ اوئے بجونگڑے تم ہی چھوڑ دو......''

احسن نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بھائی جان نے مجھے پتھر مارا ہے۔''

''پتھر نہیں یار! چھوٹی سی کنکری تھی۔'' عینی بولی۔ ''لیکن اب تم خود کو واقعی شیطان ثابت کر رہے ہو، چھوڑ دو...... چھوڑ دو۔'' اس کے لمبے بال بھی بچوں کی لڑائی کی لپیٹ میں آگئے، جنہیں اس نے بڑی مشکل سے علیحدہ کیا۔

اچانک گھر کی کال بیل ہوئی۔ شہزاد ٹی وی کے سامنے سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے لان میں پہنچنے تک ملازم طفیل مین گیٹ کھول چکا تھا۔ گیٹ کی دوسری طرف شہزاد کو جس چہرے کی جھلک نظر آئی وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس چہرے کو دیکھ کر شہزاد کے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ یہ بڑے ماموں جہانگیر تھے۔ ان کے عقب میں سڑک پر ان کی لمبی مرسڈیز کار کھڑی تھی۔ اندر باوردی ڈرائیور کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ شہزاد نے آج ماموں جہانگیر کو پانچ چھ سال بعد دیکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس کے ذہن نے خطرے کی ان گنت گھنٹیاں بجادیں۔ بہرحال اس نے آگے بڑھ کر ماموں کا استقبال کیا اور انہیں اندر لے آیا۔ وہ انہیں گھر کے اندر لے جانا چاہتا تھا مگر انہوں نے لیے دیے ہوئے انداز میں کہا کہ وہ ان کے لیے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلوائے۔ شہزاد نے دروازہ کھلوایا اور وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

''آپ کیا لینا پسند کریں گے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''میں یہاں کچھ کھانے پینے کے لیے نہیں آیا اور نہ ہی میرے پاس زیادہ وقت ہے۔ مجھے تم سے بس ایک مختصر سی بات کرنی ہے۔''

''جی فرمائیں۔''

''دیکھو شہزاد! پرانے زخموں کو چھیلا جائے اور وہ پھر تازہ ہوجائیں تو یہ بڑا خطرناک ہوتا ہے اور میں اب بھی امید کرتا ہوں کہ تم ان زخموں کو تازہ کرنے کی حماقت نہیں کرو گے۔''

''میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔'' شہزاد نے پریشان ہوکر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں اندازہ ہوچکا ہے، میں لمبی بات کرنا نہیں چاہتا۔ جو کچھ بھی ہے تمہاری رگوں میں میری بہن کا خون شامل ہے۔ میں خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم اس حد تک نہیں گر سکتے۔ جو باتیں سامنے آرہی ہیں، وہ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔''

''ماموں! آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''میں اپنی نواسی اور فرزانہ کی بیٹی، عینی کی بات کر رہا ہوں۔'' ماموں نے شہزاد کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔ ''وہ شادی سے انکار کر رہی ہے۔ اس نے ہم سب کے لیے بہت بڑا مسئلہ کھڑا کیا ہوا ہے۔''

''مم...... ماموں! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔ اگر ایسا ہے بھی تو میرا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق ہے یا نہیں...... لیکن ایک بات میں تمہیں صاف صاف بتادوں شہزاد! بالکل صاف صاف......'' انہوں نے عجیب ہیجانی انداز میں شہزاد کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''اگر...... کسی موقعے پر، مجھے ذرا سا...... ہاں ذرا سا شبہ بھی ہوگیا کہ تم اس حد تک گر چکے ہو اور عینی کی زندگی پر کسی بھی طرح تمہارا سایہ پڑا ہے...... تو میں اپنے مرے ہوئے بزرگوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں، یہاں ایسا طوفان آئے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔'' ان کا چہرہ سرخ انگارہ ہوگیا۔ گھنی، سفیدی مائل بھوؤں کے نیچے آنکھوں میں بجلیاں سی کوندگئیں، وہ ایک جھٹکے سے کھڑے ہوئے اور ایک لفظ مزید کہے بغیر شہزاد کے گھر سے نکل گئے۔ شہزاد اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

فاخرہ کو بھی ماموں جہانگیر کی آمد و رخصت کا پتا چل گیا تھا۔ شہزاد نے اسے کچھ نہیں بتایا لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی سنگین معاملہ ہے۔ پیرس میں شارق نے جس طرح کی بیہودگی کی تھی، اس کے بعد کسی بھی واقعے کی توقع کی جاسکتی تھی۔ بہرحال شہزاد کا موڈ خراب دیکھتے ہوئے فاخرہ کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس سے تفصیل پوچھ سکے۔

دوسرے روز شہزاد نے فرزانہ کا فون نمبر ڈھونڈا اور وہ اسے مل گیا۔ اس نے اس فون نمبر پر رابطہ کیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ شہزاد کے اندازے کے مطابق پیرس میں دوپہر تھی۔ ہزاروں میل دور سے فرزانہ کی آواز ابھری اور شہزاد کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہیلو کون؟''

''میں کراچی سے شہزاد بول رہا ہوں۔''

چند لمحے کے لیے سناٹا رہا پھر فرزانہ کی دبی دبی آواز آئی۔ ''السلام علیکم۔ آپ کیسے ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں اور تم؟''

''ہاں جی، میں کچھ دیر میں آپ کو خود فون کروں گی...... آپ مصروف تو نہیں ہوں گے؟''

''نن...... نہیں......''

''ٹھیک ہے۔ اوکے بلئے۔''

فون بند ہوگیا۔ شہزاد کو اندازہ ہوا کہ فرزانہ کے پاس کوئی موجود تھا جس کی وجہ سے وہ بات کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد شہزاد کے سیل نمبر پر فرزانہ کی کال آگئی۔ ''ہیلو شہزاد۔ میں فرزانہ بول رہی ہوں۔ تم کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں، اس وقت تم نے بڑی جلدی فون بند کردیا؟''

''بس کچھ ایسی ہی بات تھی، دراصل...... شارق میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آج کل پھر پیرس میں ہے۔''

''کیوں؟ خیریت تو ہے ناں؟''

''خیریت سے ہے بھی اور نہیں بھی۔'' فرزانہ کی آواز بجھی بجھی تھی۔ ''یہاں عینی کی وجہ سے بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔''

''کیا کیا ہے اس نے؟''

''دراصل، ایک بڑا اچھا رشتہ آیا ہے اس کے لیے۔ ابا جان کے گہرے دوست رشید بٹ صاحب کا بیٹا ہے۔ یہاں پیرس میں ہی خاصا بڑا شوروم ہے اس کا۔ گارمنٹس کا کاروبار کر رہا ہے۔ ادھر سیالکوٹ سے چمڑے کی جیکٹس اور دیگر سامان منگواتا ہے۔ ہینڈسم بھی ہے، ابا جان کی بڑی دیر سے خواہش تھی کہ اس لڑکے کے رشتے کی بات عینی کے ساتھ بن جائے۔ پچھلے دنوں لڑکا اور اس کے والد پاکستان گئے تو ابا جان سے ان کی تفصیلی بات ہوئی پھر جب لڑکا واپس پیرس آیا تو میں اور جمیل بھی اسے دیکھ آئے۔ زارا بھی ساتھ تھی، ہمیں بھی لڑکا اور اس کے گھر والے اچھے لگے۔ ابا جان نے پاکستان سے مشورہ دیا کہ عینی سے پوچھ لو اور کم از کم منگنی تو فوری طور پر کرلو۔ ہم سب کا بھی یہی اندازہ تھا کہ اس بار عینی ضرور راضی ہوجائے گی، پر یہ اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا ہے شہزاد۔ وہ بالکل مان کر نہیں دے رہی۔ ابا جان اس پر سخت ناراض ہیں۔ انہوں نے فون پر بھی بہت دفعہ بات کی ہے عینی سے۔ اس کے ساتھ سر کھپا کھپا کر تھک چکے ہیں۔ میرے خیال میں اب وہ دو چار دن تک خود بھی یہاں پیرس آرہے ہیں۔''

''مطلب کہ کافی سنگین معاملہ ہے۔''

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات بن رہی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ابا جان غصے کے تیز ہیں۔ ایک بار جو بات ان کے منہ سے نکل جاتی ہے وہ نکل جاتی ہے۔ عینی سے پیار بھی بڑا کرتے ہیں اور اسی طرح اس پر اپنا حق بھی بہت زیادہ سمجھتے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ ہم سب بھی اس رشتے کے حق میں ہیں۔ یہ ہر طرح سے مناسب رشتہ ہے، ان لوگوں کو بھی شادی کی زیادہ جلدی نہیں۔ دو ڈھائی سال وہ آرام سے نکال لیں گے۔ ہماری پلاننگ بھی یہی ہے کہ دو ڈھائی سال تک شادی کردی جائے۔ تمہیں پتا ہی ہے زارا کی شادی بھی میں نے بائیس تئیس سال کی عمر میں کردی تھی۔ جیسا یہاں کا ماحول ہے، بچوں کی شادی میں زیادہ دیر بھی نہیں کی جاسکتی۔ پڑھائی تو یہاں بعد میں بھی چلتی رہتی ہے۔''

''فرزانہ! کل ماموں جہانگیر مجھ سے ملنے آئے تھے۔'' شہزاد نے گمبھیر لہجے میں اطلاع دی۔ ''انہوں نے چند سخت باتیں کہی ہیں۔ یقین کرو کل سے میں اتنا پریشان ہوں کہ تمہیں بتا نہیں سکتا۔ میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آرہی کہ مجھے اس سارے معاملے میں کس وجہ سے گھسیٹا جارہا ہے۔ اس بارے میں سوچ کر مجھے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہورہی ہے۔''

فرزانہ نے ایک لمبی آہ بھری، دبی دبی جھلاہٹ کے ساتھ بولی۔ ''یہ سارا شارق کا کیا دھرا ہے، اس نے ابا جان کے کانوں میں کچھ الٹی سیدھی باتیں ڈالی ہیں۔ اس نے اپنی بے وقوفی سے ایک ایسی چیز کو وجود دے دیا ہے، جو شاید تھی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو کبھی اس طرح واضح ہوکر سامنے نہیں آنی تھی، تم جانتے ہی ہو، عینی، شارق سے پہلے ہی بڑی الرجک تھی اب اور الرجک ہوگئی ہے۔ وہ اس کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتی بلکہ وہ تو اب اسے ماموں بھی نہیں کہتی۔ سیدھا نام لے کر بات کرتی ہے۔ دو تین دن پہلے شارق کے ساتھ اس کا باقاعدہ جھگڑا ہوا ہے اس نے شارق سے صاف کہا ہے کہ وہ ابھی شادی کا بالکل نہیں سوچ رہی۔ وہ پاکستان جارہی ہے، وہاں وہ تمہارے اور فاخرہ کے ساتھ رہے گی۔ وہ تم سے پڑھنا اور بہت کچھ سیکھنا چاہتی ہے۔ اب پتا نہیں کہ اس نے یہ باتیں دل سے کہی ہیں یا صرف شارق کو جلانے اور آگ بگولا کرنے کے لیے...... بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی آئندہ زندگی کا فیصلہ بھی تمہارے مشورے اور مرضی سے کرے گی۔''

شہزاد تھوڑی دیر سناٹے میں رہا۔ اسے ایسی توقع نہیں تھی۔ ''وہ ایسا کیوں کر رہی ہے فرزانہ! کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں پیرس گیا اور جب آپ لوگ مجھ سے ملنے آئے تو میں ملنے سے انکار نہ کرسکا۔ اس کے باوجود فرزانہ میں نے تمہیں ''وارن'' کردیا تھا کہ اس میل جول کا انجام ٹھیک نہیں ہوگا۔''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر فرزانہ نے

کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا شہزاد کہ تم ایک بار اس سے فون پر بات کرلو۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرو، میں جانتی ہوں کہ وہ تمہاری بہت زیادہ عزت کرتی ہے تم اسے سمجھاؤ گے تو وہ سمجھ جائے گی۔''

''سوری فرزانہ! میں اس معاملے میں اور انوالو ہونا نہیں چاہتا۔ تم اس کے سامنے میری طرف سے ہاتھ جوڑ دینا۔ اس سے کہنا کہ میں تئیس چوبیس سال سے اپنی عزت بچا کر کراچی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اب اس عمر میں وہ میرے ساتھ کوئی ایسا تماشا نہ کرے کہ مجھے ویسے ہی کہیں روپوش ہونا پڑے۔''

''اچھا میرے خیال میں شارق اور ریحان اس طرف آرہے ہیں۔ ہم اس بارے میں پھر بات کریں گے۔'' فرزانہ نے جلدی جلدی کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔

چھ سات دن تک شہزاد بہت پریشان رہا۔ اسے اپنے ذرائع سے معلوم ہو چکا تھا کہ ماموں جہانگیر لاہور سے پیرس کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ بتانے والے نے بتایا تھا کہ وہ اپنے کسی نجی کام سے گئے ہیں۔ اس نجی کام کی نوعیت شہزاد خوب سمجھ رہا تھا، وہاں عینی پر منگنی کے لیے دباؤ ڈالا جانا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا گو تھا کہ یہ مسئلہ بخیروخوبی حل ہو جائے اور اس کے نتیجے میں کوئی طوفان سر نہ اٹھائے۔ اس نے پیرس میں اپنے قیام کے دوران میں عینی کو قریب سے دیکھا تھا اور اس کے مزاج کو کافی حد تک پہچانا تھا۔ وہ نوجوان نسل کی نمائندہ ایک مختلف لڑکی تھی۔ ایسی لڑکی جو اپنی راہیں خود بنانا چاہتی ہو...... جو پرانی قدروں پر چلنے کے بجائے نئی قدریں تخلیق کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ اس کی سوچ میں بغاوت کی چنگاریاں محسوس کی جاسکتی تھیں۔ شاید اسی کیفیت کے اظہار کے لیے وہ شاعری بھی کرتی تھی۔ وہ پیرس میں پروان چڑھی تھی۔ وہ شہر جس کا خمیر ہی محبت اور رومانس سے اٹھا ہے۔ جس کی آب وہوا میں آزاد خیالی اور من چاہی زندگی کی امنگیں رچی بسی ہیں۔ ایسی لڑکی کچھ بھی کرسکتی تھی۔

شہزاد کا کزن اور پرانا دوست حسنات آج کل لاہور میں ہی تھا۔ حسنات کا رابطہ بھی کبھار پیرس میں فرزانہ کی فیملی سے ہوجاتا تھا۔ حسنات آج کل شہزاد کے لیے معلومات کا اچھا ذریعہ ثابت ہو رہا تھا۔ پندرہ بیس روز بعد اسے حسنات سے پیرس کے بارے میں اور فرزانہ کی فیملی کے بارے میں کچھ اور اطلاعات ملیں اور یہ اطلاعات کافی تشویش ناک تھیں وہاں معاملہ سلجھنے کے بجائے اور بگڑ گیا تھا۔

لاڈلی نواسی اپنے نانا کے سامنے بھی خم ٹھونک کر آگئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ شادی ہرگز نہیں کرے گی۔ وہ اپنے، پاکستان جانے والے ارادے پر بھی پوری طرح قائم تھی۔ نانا اور ماموں کبھی محبت اور کبھی سختی کے ساتھ اسے سمجھانے بجھانے میں لگے ہوئے تھے۔ اس سارے معاملے میں عینی کے والد جمیل احمد صاحب کا کردار عجیب تھا۔ وہ اس معاملے میں بیٹی کی طرفداری کررہے تھے اور نہ مخالفت۔ وہ آج کل بھی بڑے اطمینان سے زیورخ میں قیام پذیر تھے اور جھیل کے کنارے جاگنگ کررہے تھے۔ ہاں فرزانہ پریشان تھی اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ عینی اس نہایت اچھے رشتے کے لیے مان جائے۔ حسنات کی باتوں سے یہ بھی پتا چلا کہ اندرون خانہ عینی کے بڑے سوچ رہے ہیں کہ اگر ہوسکے تو منگنی کے بجائے اس کا نکاح ہی پڑھوا دیا جائے۔

پھر ایک روز شہزاد کو عینی کی طرف سے ایک ای میل موصول ہوئی۔ وہ کچھ اس طرح تھی۔ ''مائی لارڈ! انسان کا رویہ بھی بڑی عجیب شے ہے۔ اظہار خیال کی مثال ہی لے لیں۔ کسی وقت کچھ باتیں کہنی بہت مشکل محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے کوئی پہاڑ سر کرنا ہو لیکن کوئی وقت ایسا ہوتا ہے کہ وہی باتیں ایک دم سہل لگنے لگتی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان کو کہنے میں تو کوئی دشواری ہی نہیں۔ میرے ساتھ بھی اس وقت کچھ ایسا ہی ہے۔ مجھے آپ سے یہ کہنا بے حد آسان لگ رہا ہے کہ I Love You۔ میں آپ کو چاہتی ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ یہ چاہت کوئی دو چار روز کی بات نہیں ہے۔ پتا نہیں یہ کب سے میرے اندر موجود تھی۔ شاید بچپن سے، یا شاید میرے دنیا میں آنے سے بھی پہلے، یا شاعرانہ انداز میں کہا جائے تو اس وقت سے جب روحیں تخلیق ہوئی تھیں۔ اسے میرا جذباتی پن نہ سمجھے گا۔ میں جو کہہ رہی ہوں بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ آپ کی زندگی میں شامل ہونا میری سب سے بڑی خواہش ہے اور اگر کبھی کسی طرح یہ ناممکن کام، ممکن ہوسکا تو میں اسے اپنی عظیم خوش بختی سمجھوں گی۔ میں نہیں جانتی کہ میرے بارے میں آپ کے خیالات کیا ہیں اور سچ پوچھیں تو مجھے اس سے غرض بھی نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اور طرز کے آدمی ہیں اور آپ کی بے شمار مجبوریاں بھی ہیں لیکن میرے لیے خوشی کی بات یہی ہے کہ میں نے ان ساری مجبوریوں سمیت آپ کو چاہا ہے اور چاہتی رہوں گی۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو، آج کل نانا جی اور ماموں شارق وغیرہ کی طرف سے مجھ پر شادی کے لیے دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ ایک رشتہ آیا ہے، میری ماما اور زارا وغیرہ کو بھی یہ رشتہ پسند ہے لیکن میرے اندر شادی کی خواہش دور دور تک نہیں ہے۔ ایسا لگتا

ہے کہ میرے دل کے اندر سارے دروازے ایک ایک کر کے بند ہو گئے ہیں۔ بس ایک دروازہ کھلا رہ گیا ہے اور یہ دروازہ اس نگری کی طرف کھلتا ہے جہاں...... جہاں...... آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔ ہاں ہاں، یقیناً سمجھ گئے ہیں۔ اسی لیے تو جناب کا رنگ غصے سے لال ہو گیا ہے۔ میں تصور کی نظر سے دیکھ سکتی ہوں۔ آپ مجھے تھپڑ مارنے کے لیے بے چین ہو گئے ہیں۔ سوری...... بڑی دور ہوں، آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ چلیں یہ سارے تھپڑ آپ سنبھال کر رکھ لیں۔ جب کبھی آپ سے ملاقات ہو گی تو میں اپنا گال پیش کر دوں گی۔ آپ سارا غصہ ایک ہی دفعہ نکال لیجیے گا۔

آنٹی کو سلام۔ عمیرا اور بجونگڑے کو بہت بہت پیار۔

آپ کی پرستار عینا۔"

شہزاد نے ای میل کو دوسری بار پڑھنے کے بعد Delete کر دیا اور دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا۔ آج اس نے وہ بات بالکل واضح طور پر کہہ دی تھی جو تقریباً ایک سال سے ایک دھند میں لپٹی ہوئی شہزاد کے اردگرد چکرا رہی تھی۔ اس ای میل کے بعد شہزاد نے فیصلہ کیا کہ وہ فرزانہ کی بات مانتے ہوئے ایک بار عینی سے بات کرے گا اور اس کا مزاج درست کرنے کی اپنی سی کوشش کرے گا۔

ٹھیک دو روز بعد دوپہر کے وقت لینڈ لائن فون پر عینی کے ساتھ شہزاد کی بات ہوئی۔ اس بات کے لیے فرزانہ نے ایسا موقع چنا تھا جب ماموں جہانگیر اور شارق وغیرہ گھر میں موجود نہیں تھے۔ فرزانہ نے شہزاد کو بتایا تھا کہ نانا جہانگیر کے ساتھ کل بھی عینی کا جھگڑا ہوا ہے۔ نانا اس پر بہت گرجے برسے ہیں۔ جس کے بعد سے وہ روٹھی ہوئی ہے۔ اس نے دو دن سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں اور نہ ہی اپنی کلاسز لینے گئی ہے۔

"ہیلو عینی کیسی ہو؟" شہزاد نے پوچھا۔

"بس طبیعت ذرا بوجھل ہو رہی تھی لیکن آپ کی آواز سننے کے بعد بوجھل کیسے ہو سکتی ہے۔ سچ مجھے تو یقین ہی نہیں آیا، جب ماما نے کہا کہ آپ مجھ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔ تاہم اس کی آواز کی نقاہت شہزاد نے واضح طور پر محسوس کی۔

"تمہارا لہجہ کچھ دھیما لگ رہا ہے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے مائی لارڈ۔ میں اتنی زور سے بول سکتی ہوں کہ میری آواز بغیر فون لائن کے بھی آپ کے کراچی تک پہنچ جائے۔" اس نے شوخ ہونے کی کوشش کی۔

"اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟"

"بس ٹھیک ہی ہے جی لیکن پہلے آپ مجھے آنٹی جی کی طبیعت بتائیں، یقین کریں جب ان کے Paralysis کا پتا چلا کئی ہفتے میں بے حد پریشان رہی۔ جی چاہتا تھا کہ اڑ کر ان کے پاس پہنچ جاؤں۔ دن رات ان کی خدمت کروں، ان کی ساری تکلیف ان سے لے لوں۔ میں ان سے فون پر بات کرنا چاہتی تھی لیکن آپ کا لینڈ لائن نمبر شاید بدل گیا ہے۔"

"ہاں وہ تبدیل ہو گیا ہے۔"

"کیا آپ اب میری بات کرا سکتے ہیں ان سے؟"

"نہیں، اس وقت تو میں سیل فون سے بات کر رہا ہوں اور آفس میں ہوں۔"

وہ سمجھ گئی کہ وہ فی الحال بات کرانا ہی نہیں چاہتا۔ رسمی گفتگو کے بعد شہزاد اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ اس نے کہا۔ "عینی! مجھے پرسوں تمہارا ای میل ملا ہے۔"

اس کا خیال تھا کہ وہ اس بات پر جھجکے گی اور لڑکھڑاتے لہجے میں کوئی وضاحت کرے گی مگر وہ بالکل صاف، پراعتماد آواز میں بولی۔ "ہاں مائی لارڈ! جو کچھ میرے دل میں تھا میں نے لکھ دیا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھ میں اور بے شمار برائیاں اور خامیاں ہوں گی لیکن جھوٹ ان میں شامل نہیں ہے۔"

شہزاد ایک لمبی آہ بھر کر رہ گیا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن عینی! یہ بھی تو کہتے ہیں کہ وہ جھوٹ جو جھگڑے فساد سے بچائے اس سچ سے بہتر ہے جو زندگیاں تلخ کر کے رکھ دے۔"

"مائی لارڈ! آپ کی سمجھ بوجھ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ مگر دیکھیں، اگر ہم سچ جھوٹ کو ایسے پیمانوں سے ناپنے لگیں تو پھر ان دونوں چیزوں کا کوئی وجود ہی نہیں رہ جائے گا۔ ہم اپنے اپنے حساب سے جھوٹ سچ کی تشریح کرنے لگیں گے۔"

"لیکن جو سچ تم بول رہی ہو، جانتی ہو کتنا خطرناک ہے۔"

"لیکن...... وہ سچ ہے۔" وہ عجیب انداز سے بولی۔

اس انداز نے شہزاد کو لرزا دیا۔

چند سیکنڈ توقف کرنے کے بعد شہزاد نے کہا۔ "عینی! تم بہت اچھی لڑکی ہو، میں نے تم میں بہت سی خوبیاں دیکھی ہیں، میری دلی خواہش ہے کہ تم ایک ایسے راستے پر چلنے کی کوشش نہ کرو جس پر بدنامی اور رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس پر چلو گی تو مجھ سے بھی ہمیشہ کے لیے دور ہو جاؤ گی۔"

"میں نے ایسا کون سا راستہ اختیار کر لیا ہے جناب۔" وہ ذرا تیز لہجے میں بولی۔ "میں نے صرف یہی کہا ہے ناں کہ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ یہ میری زندگی ہے، کیا اس پر میرا اتنا سا حق بھی نہیں۔ میں اچھے طریقے سے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کی طرح کچھ بننا چاہتی ہوں اور کون سی بری بات کہہ دی ہے میں نے؟"

"دیکھو، تم بھی فوٹو گرافی کے آرٹ میں دلچسپی لیتی ہو۔ تصویر میں پس منظر کی بھی اتنی ہی اہمیت ہوتی ہے جتنی منظر کی۔ اسی طرح کسی بھی بات سے زیادہ اس کا پس منظر اہمیت رکھتا ہے۔ تم شادی نہ کرنے والی بات جس پس منظر میں کہہ رہی ہو وہ تمہارے لیے ڈھکا چھپا نہیں اور شاید دوسرے بھی اس کو جان رہے ہیں۔"

"وہ جو سمجھتے ہیں، انہیں سمجھنے دیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہی۔ میں ابھی منگنی، شادی وغیرہ کرنا نہیں چاہتی۔"

"دیکھو عینی! اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ اس طرح تم مستقبل میں حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکو گی تو یہ تمہاری بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اور اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ میں خود ہوں، میں تمہیں بالکل صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں میرے لیے تم صرف فرزانہ کی بیٹی ہو۔ میں اس کے علاوہ کسی اور انداز میں تمہارے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ تمہاری باتیں سن کر میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں، میں شرمندگی کے پسینے میں ڈوب جاتا ہوں، تم...... نہ صرف مجھے تکلیف دے رہی ہو بلکہ میری زندگی کو بھی تلخ کرنے کی کوشش کر رہی ہو، میں تمہیں اس کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔"

"مجھے آپ کی کسی اجازت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" وہ ترت بولی۔ "میں کسی سے کچھ مانگ نہیں رہی، نہ کسی کی ذاتی زندگی میں دخل دے رہی ہوں، نہ دینا چاہتی ہوں، اگر آپ چاہتے ہیں تو میں آئندہ کبھی آپ کو فون یا ای میل بھی نہیں کروں گی۔ ذرا سا تعلق بھی نہیں رکھوں گی آپ سے لیکن جو تعلق میرے دل میں ہے...... وہ ہے اور اسے ہمیشہ رہنا ہے۔" اس کا لہجہ گمبھیر ہوتا جا رہا تھا۔

شہزاد نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔ "عینی! سمجھنے کی کوشش کرو، اس میں جگ ہنسائی کے سوا اور کچھ نہیں، میری طرف دیکھو، میں ایک......"

"پلیز...... پلیز، آپ کچھ نہ کہیں۔" اس نے تیزی سے شہزاد کی بات کاٹی۔ "جو کچھ آپ کو...کہنا ہے میں جانتی ہوں، آپ کہیں گے میں ایک اڑتالیس پچاس سالہ شخص ہوں، میرا دماغ اور میرا جسم تھک گئے ہیں، میں اب ایک ٹھہری ہوئی زندگی گزارنا چاہتا ہوں، تم نوجوان ہو، تمہارے اندر جوش جذبہ ہے۔ پوری زندگی پڑی ہے تمہارے سامنے۔ تمہیں اچھے سے اچھا لڑکا مل سکتا ہے۔ تمہاری پوری زندگی کو گل وگلزار بنا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں آپ کی ان ساری باتوں کے جواب میں بس ایک بات ہی کہوں گی۔ محبت دلیلوں کو نہیں مانتی۔ وہ وہیں سر پھوڑتی ہے جہاں اسے نہیں پھوڑنا چاہیے۔ ویسے محبت کے پاس ہر دلیل کا جواب بھی موجود ہوتا ہے اور آپ کی باتوں کا جواب میرے پاس یہ ہے جناب کہ میرے نزدیک بے محبت کی پچاس سالہ زندگی سے، محبت کی چار پانچ سالہ زندگی بھی ہزار درجے بہتر ہے۔"

وہ اس لڑکی کی باتوں سے دنگ رہ گیا۔ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ "مم...... مجھے تمہاری باتوں سے شرمندگی ہو رہی ہے عینی۔"

"اب آپ کو مزید شرمندگی نہیں ہوگی۔" اس نے عجیب اشک بار لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو تنگ نہیں کروں گی۔ وعدہ کرتی ہوں، آپ سے کوئی رابطہ نہیں رکھوں گی۔ آپ آخری بار میری آواز سن رہے ہیں اور آخری الفاظ یہ ہیں کہ میں آپ کو چاہتی ہوں، خدا حافظ...... آپ ہمیشہ خوش رہیں۔" اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

شہزاد ششدر کر رہ گیا۔ کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ گم صم بیٹھا رہا۔ رات کو بھی دیر تک اس نے بستر پر کروٹیں بدلیں۔ یہ کیسی لڑکی تھی؟ یہ کسی آسیب کی طرح شہزاد کے دل و دماغ میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ وہ شہزاد کی بچھڑی ہوئی محبوبہ، نجمہ کی آنکھیں اور اس کی خو لے کر اس دنیا میں آئی تھی...... اور اب وہ سرتاپا نجمہ بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہنے کو تو شہزاد نے پورے وثوق سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے لیے صرف فرزانہ کی بیٹی ہے اور وہ اس کی ذات میں ذرا سی دلچسپی بھی نہیں رکھتا لیکن اب رات کی اس تاریک تنہائی میں وہ چپ چاپ لیٹا سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی ایسا ہے۔ حقیقت کتنی بھی حیران کن ہو لیکن حقیقت یہی تھی کہ پیرس سے ایک دم چلے آنے کے بعد شہزاد نے اپنے اندر ایک خلا محسوس کیا تھا۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ خلا کم ہونے کے بجائے کچھ وسیع ہی ہوا تھا۔ کوئی بے نام کشش تھی جس کی وجہ سے پیرس اور پیرس میں گزرے ہوئے دن بار بار اس کے پردۂ تصور پر نمودار ہو جاتے تھے اور پھر وہ بے رحم تھپڑ جو اس نے کسی کے کومل گال پر رسید کیا تھا۔ وہ ان لمحوں سے دھیان ہٹانے کی بہت کوشش کرتا مگر دھیان ہٹتا نہیں تھا۔ وہ عجیب کیفیت سے دوچار تھا۔

اگر معروضی انداز میں دیکھا جاتا تو اس کے لیے بھی نہایت خوبصورت لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں رہی تھی۔ وہ تتلیوں کی طرح اس کے گرد منڈلاتی تھیں اور ان میں سے بہت سی ایسی تھیں، جو کسی بھی ''کام'' کے لیے اس کے ایک اشارے کو ہی کافی سمجھ سکتی تھیں، لیکن وہ کبھی ایسی صورت حال کی طرف راغب ہی نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کے دل کا وہ حصہ جو صنف مخالف کی دلکشی کو محسوس کرسکتا تھا اور اسے حاصل کرنے کی چاہت کرسکتا تھا مردہ ہوچکا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اپنی موجودہ کیفیت اب اسے زیادہ پریشان کررہی تھی۔ وہ اپنی پریشانی فاخرہ سے شیئر کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی بستر سے لگی ہوئی تھی۔

چند دن خاموشی سے گزر گئے۔ شہزاد کو پیرس، فرزانہ اور عینی وغیرہ کی کوئی خبر نہیں ملی۔ صرف ایک دن اتنا پتا چلا کہ ماموں جہانگیر پیرس سے واپس آگئے ہیں۔ اب شہزاد کو یہ اندیشہ لاحق ہوگیا کہ کسی روز ماموں جہانگیر یا شارق میں سے کوئی اس کا سکون تہ و بالا کرنے کے لیے اس کے دروازے پر دستک نہ دیدے۔ وہ اب تک بہت ضبط کررہا تھا۔ کسی وقت بھی اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہوسکتا تھا۔ اگر ایسا ہوجاتا تو یہ تناؤ باقاعدہ فساد کی شکل اختیار کرسکتا تھا۔ وہ زمانہ گزر گیا تھا جب شہزاد کمزور و ناتواں تھا۔ ایک خاموش طبع والد اور بوڑھی والدہ کے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ اب وہ ایک تناور درخت تھا۔ اب یہاں شہرِ بے مثال کراچی میں اس کی گہری جڑیں تھیں۔ اس کے پاس پیسا تھا، تعلقات تھے، اگر اس کی عزت کو للکارا جاتا اور اسے دیوار کے ساتھ لگانے کی کوشش کی جاتی تو وہ منہ توڑ جواب دے سکتا تھا۔ وہ ماموں جہانگیر اور ان کے بیٹوں کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہوسکتا تھا۔

اس نے اپنے طور پر حسنات سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہاں پیرس میں کیا حالات ہیں۔ پہلے کئی دنوں سے حسنات کا رابطہ بھی فرزانہ یا جمیل صاحب سے نہیں ہوسکا تھا۔ اصل صورت حال سے وہ بھی بے خبر تھا۔ اسی طرح آٹھ دس روز گزر گئے۔ پھر ایک روز آدھی شب کو شہزاد کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ دوسری طرف حسنات ہی تھا۔ شہزاد خاموشی کے ساتھ فاخرہ کے پہلو سے اٹھا اور باہر برآمدے میں آگیا۔

''کیا بات ہے حسنات! خیریت تو ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے یار! وہاں پیرس میں عینی پچھلے دس بارہ دن سے اسپتال میں ہے۔''

''اسپتال میں؟ اوہ گاڈ، کیا ہوا ہے؟''

''وہاں کئی روز بڑا سخت تناؤ رہا ہے، تایا جہانگیر اور شارق کے علاوہ عینی کے والد جمیل صاحب بھی پیرس میں ہی تھے۔ دس بارہ دن پہلے رات کے وقت عینی نے بیئر کے ساتھ بہت زیادہ مقدار میں ٹرنکولائزرز لے لیں اور بے ہوش ہوگئی۔ اسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا جہاں اس کا معدہ واش ہوا اور وہ ہوش میں آگئی لیکن تب سے اس کی طبیعت سخت خراب ہے۔ اسے مسلسل اسپتال میں رکھا گیا ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ۔'' شہزاد نے سر پکڑ لیا۔ ''پتا نہیں، یہ لڑکی کیا کرنے والی ہے۔''

حسنات نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو عینی نے کبھی الکحل وغیرہ نہیں لی لیکن اس رات اس نے جو بھی کیا انوکھا کیا اور اس کی اصل وجہ جہانگیر صاحب ہی تھے۔''

جہانگیر صاحب کا سخت رویہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ وہ وہاں پیرس میں اڑ کر بیٹھ گئے تھے کہ نواسی سے اپنی بات منوا کر ہی واپس جائیں گے۔ کسی حد تک عینی کی والدہ بھی ان کا ساتھ دینے لگی تھیں۔ انہی باتوں سے دل برداشتہ ہوکر عینی نے یہ حرکت کی۔ اسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ اسی روز جہانگیر صاحب اور عینی کے والد جمیل صاحب میں جھڑپ بھی ہوئی۔ جمیل صاحب نے عینی کے نانا سے صاف کہہ دیا کہ وہ ان کے گھریلو معاملے میں اس طرح دخل نہ دیں۔ وہ اپنی بیٹی کو ہر کسی سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اس معاملے میں خوامخواہ ان پر اور ان کے اہل خانہ پر دباؤ نہ ڈالا جائے۔

اسی واقعے کے بعد جہانگیر صاحب نے پیرس سے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور بھناتے ہوئے واپس لاہور پہنچ گئے۔ سنا ہے کہ شارق بھی اب لندن واپس جاچکا ہے۔ شارق کے بارے میں تو عینی نے اسپتال میں صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے آس پاس اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ ان دونوں کے درمیان ماموں بھانجی والا احترام بالکل ختم ہوچکا تھا۔

حسنات سے ملنے والی یہ ساری معلومات بے حد پریشان کن تھیں۔ آہستہ آہستہ شہزاد کے بدترین اندیشے حقیقت میں ڈھلتے جارہے تھے۔ معاملہ بے طرح بگڑ رہا تھا۔ شہزاد کو ایک بار پھر ماموں جہانگیر اور شارق وغیرہ کی طرف سے اندیشہ محسوس ہوا۔ اسے ماموں کی وہ دھمکی بھی یاد آئی جو انہوں نے آخری ملاقات میں دی تھی۔ وہ سوچنے لگا، کیا وہ اس حد تک جاسکتے ہیں کہ اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کرگزریں۔ کیا اسے اپنے وکیل سے پیشگی کوئی مشورہ کرنا چاہیے؟

بہرحال آئندہ دس پندرہ دن خیریت سے گزر گئے تو شہزاد کے اندیشے بھی زائل ہونے لگے۔ ماموں جہانگیر اور شارق وغیرہ کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف پیرس سے بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ انہی دنوں شہزاد کو اپنے کام کے سلسلے میں کاغان اور ناران وغیرہ کا رخ کرنا پڑا۔ اسے اپنے مختصر یونٹ کے ساتھ وہاں پندرہ بیس دن رہنا تھا پھر چند روز اسلام آباد میں قیام کے بعد واپس آنا تھا۔ اس کے ایسے دوروں کے دوران میں فاخرہ کا اکیلا پن دور کرنے کے لیے اس کی والدہ اور بھتیجا شکیل اس کے پاس آجایا کرتے تھے۔ اس مرتبہ بھی شہزاد نے انہیں بلالیا مگر جس روز رات کو شہزاد کو... ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہونا تھا اسے ایک اہم فون کال موصول ہوئی اور اس نے شہزاد کا ہر پروگرام درہم برہم کرڈالا۔ یہ فون کال پیرس سے تھی اور عینی کے والد جمیل احمد صاحب نے کی تھی۔

جمیل صاحب کی آواز کی لرزش اور سنگینی محسوس کرکے شہزاد بری طرح چونک گیا تھا...... ''خیریت تو ہے بھائی جان؟'' اس نے بے حد تشویش سے پوچھا۔

اس سوال کے جواب میں جمیل صاحب نے اشک بار انداز میں جو کچھ بتایا وہ ہرگز اطمینان بخش نہیں تھا۔ عینی کی طبیعت بدستور خراب تھی اور وہ دوبارہ اسپتال میں ایڈمٹ تھی۔ جمیل صاحب نے بتایا کہ یوں لگتا ہے، وہ ٹھیک ہونا ہی نہیں چاہتی۔ نہ دوا باقاعدگی سے کھاتی ہے نہ خوراک کا دھیان رکھتی ہے۔ اسے بخار رہتا ہے جو کبھی کم اور کبھی بہت تیز ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر بے شمار ٹیسٹ کرواچکے ہیں اور ابھی مزید کروارہے ہیں۔ جمیل صاحب نے شہزاد سے کوئی بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رکھی۔ انہوں نے مناسب الفاظ میں شہزاد کو بتادیا کہ وہ عینی کے اس جذبے سے باخبر ہیں جو وہ شہزاد کے بارے میں رکھتی ہے۔ اس جذبے کی بے پناہ شدت بھی ان کے علم میں ہے۔ انہوں نے دلگیر لہجے میں کہا۔ ''شہزاد! میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تم اور صرف تم ہی ہو جو عینی کو سنبھالا دے سکتے ہو۔ اگر تم آگے نہ بڑھے تو...... وہ ہمارے ہاتھوں سے...... خشک ریت کی طرح پھسل جائے گی اور ایسا ہوا تو میں کبھی خود کو معاف کرسکوں گا نہ تمہیں۔''

انہوں نے التجا کا لہجہ اختیار کیا اور شہزاد سے کہا کہ جس طرح اور جیسے بھی ہوسکے وہ دو چار روز کے اندر پیرس پہنچ جائے۔ اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پچھتاووں کے سوا اور کچھ نہیں بچے گا۔

شہزاد کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ جمیل صاحب اسے فوراً پیرس آنے کا کہہ رہے تھے اور یہ کام ایسا آسان بھی نہیں تھا پھر اس میں بہت سے اندیشے بھی موجود تھے۔ بے شک ماموں جہانگیر اور ان کی فیملی ابھی تک خاموش تھی، لیکن وہ کتنی دیر خاموش رہے گی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف جمیل صاحب جس انداز میں بات کررہے تھے، اسے بھی ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

شہزاد نے کہا۔ ''مجھے اس وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا بھائی جان۔ میں تو آج رات اپنے کام سے کاغان وغیرہ کی طرف جارہا تھا۔ بہرحال، میں آپ کو شام کے بعد پھر فون کروں گا۔''

انہوں نے جیسے کراہتے ہوئے کہا۔ ''شہزاد، ویزا وغیرہ کی کوئی فکر نہ کرنا۔ میں ابھی اسلام آباد میں کلیم کو فون کردیتا ہوں۔ وہ سارا کام ارجنٹ کروادے گا بس...... تم کسی طرح پہنچ جاؤ یہاں۔''

کلیم کا نام شہزاد نے پہلے بھی سنا تھا، وہ جمیل صاحب کا سگا بھائی تھا اور یہاں فرانس کی ایمبیسی میں آفیسر کے طور پر کام کرتا تھا۔

وہ رات شہزاد کے لیے انتہائی بے چینی و اضطراب کی رات تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کدھر کا رخ کرے۔ اسے معلوم تھا کہ جمیل صاحب نے جو کچھ کہا ہے انتہائی مجبوری کے عالم میں کہا ہے۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لڑکی آخری حد تک جانے کو تیار تھی اور یہ جو کچھ ہورہا تھا صرف شہزاد کی وجہ سے ہورہا تھا۔

عینی کی آنکھیں پھر اس کے تصور پر چھاگئیں۔ وہ کسی سے عینی اور نجمہ کی مشابہتوں کے بارے میں بات کرتا تو اس کا مذاق اڑایا جاتا لیکن وہ جو کچھ محسوس کررہا تھا اسے ہرگز نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ یہاں ایسا کچھ تھا جو سمجھ سے بالاتر تھا۔ جس کی توضیح کرنا مشکل تھی...... نجمہ کی ہمیشہ بولتی آنکھوں نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت کہا تھا...... شہزاد! میرا انتظار کرنا میں لوٹ کر آؤں گی، میں پھر ملوں گی۔

اور وہ لوٹ آئی تھی لیکن اس مرتبہ اس کے جسم کے گرد بے بسی و مجبوری کی زنجیریں نہیں تھیں۔ اس مرتبہ اس کا سر معاشرے کی کہنہ قدروں کے سامنے... نگوں بھی نہیں تھا۔ اس بار اس کے سینے میں چٹانی حوصلہ تھا، اس کی آنکھوں میں محبت کے دشمنوں کے خلاف بغاوت کی چنگاریاں تھیں۔ اس کے لمبے بال پیرس کی مستانی ہواؤں میں سرکشی سے لہراتے تھے اور اب وہ اپنے جذبے کی بے پناہ طاقت سے اسے اپنی

طرف بلا رہی تھی۔ شہزاد نے خود کو اس کے دیوانے پن کے سامنے بے بس محسوس کیا۔

رات قریباً دو بجے کے قریب اس نے کاغان ناران وغیرہ کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ وہ سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہتا تھا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے اسے زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ حالات خود بخود ہی ایک خاص رخ پر چلتے چلے گئے...... اگلے روز فرزانہ کا فون بھی آ گیا۔ اس نے بھی جمیل صاحب کی باتوں سے ملتی جلتی باتیں ہی کیں۔ وہ بھی بے حد دل گرفتہ تھی۔ اس نے شہزاد کو یہ یقین بھی دلایا کہ اس کی یہاں پیرس میں آمد بالکل صیغۂ راز میں رہے گی بلکہ وہ بھی کسی کو بتائے بغیر ہی یہاں پہنچ جائے تو بہتر ہے۔

کچھ بھی تھا، شہزاد فاخرہ کو تو ان حالات سے بے خبر نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے مناسب لفظوں میں سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔ فاخرہ نے یہ سب کچھ بڑی ہمدردی و غمگساری کے ساتھ سنا۔ درحقیقت وہ پیرس کے قیام کے دوران میں ہی عینی کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ ان دونوں نے اس معاملے میں کھل کر بات تو نہیں کی تھی تاہم ڈھکے چھپے انداز میں اس کا ذکر ہوتا رہا تھا۔ اس معاملے میں شہزاد فاخرہ کے خیالات کو بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ شہزاد کی ''دوسری شادی'' کے لیے ایک منٹ میں عینی کا انتخاب کر لیتی لیکن شہزاد کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ یہ ایک ناممکن کام ہے۔ سماجی اور شرعی لحاظ سے تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر خاندانی سطح پر دلوں میں جو نفرتیں موجود تھیں وہ اس طرح کے کسی اقدام پر شعلہ جوالہ کا روپ دھار سکتی تھیں۔ بہر طور حالات کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کرنے کے بعد فاخرہ نے بھی شہزاد کو مشورہ دیا کہ وہ ایک بار باجی فرزانہ اور جمیل بھائی جان کی خاطر پیرس ضرور جائے۔

ویزا کے بارے میں جمیل صاحب نے جو کچھ کہا تھا ویسے ہی ہوا۔ ان کے بھائی کلیم اللہ نے چار پانچ روز کے اندر ویزا لگوا دیا۔ ایئر لائن کا ٹکٹ جمیل صاحب نے پیرس سے بذریعہ انٹرنیٹ ارسال کر دیا۔ سب کچھ ہنگامی بنیادوں پر لیکن بڑی خاموشی سے ہوا۔ فاخرہ کی امی یعنی شہزاد کی ممانی، ساس اور بھانجے کو بھی بس یہی پتا تھا کہ شہزاد اپنے کام کے سلسلے میں پندرہ بیس روز کے لیے کراچی سے باہر جا رہا ہے۔

☆☆☆

پیرس ایک بار پھر شہزاد کے سامنے تھا۔ رنگوں خوشبوؤں اور سرمست ہواؤں کا شہر۔ اپنی جدت اور قدامت کے حسین امتزاج کے ساتھ وہ حد نگاہ تک شہزاد کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس میں پیرس کے سوا ہے ہی کیا؟ شاید اسی لیے پیرس کو آدھا فرانس بھی کہا جاتا ہے۔

پیرس کی ہواؤں کو چھوتے ہی شہزاد کو وہ ساری خوشبوئیں، لمس اور ذائقے یاد آ گئے جن کا تعلق اس کی سابقہ آمد سے تھا۔ جمیل صاحب اور فرزانہ تو اسے گھر میں ٹھہرانا چاہتے تھے تاہم اس نے ہوٹل کو ہی ترجیح دی تھی۔ ہوٹل کا انتظام جمیل صاحب نے ہی کیا تھا اور یہ ان کی رہائش گاہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ایئر پورٹ پر جمیل صاحب ہی اسے لینے آئے۔ شہزاد پچھلی مرتبہ ان سے ملاقات نہیں کر سکا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں وہ کچھ فربہ ہو چکے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ کندھے جھکے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ ایئر پورٹ سے ہوٹل تک کے راستے میں انہوں نے شہزاد کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کیں اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے شہزاد کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''شہزاد! میں سب کچھ تم پر چھوڑتا ہوں مجھے بس میری بیٹی کی زندگی اور خوشی چاہیے......''

''بھائی جان! میں آپ سے کیا کہوں، یقین کریں......''

''پلیز شہزاد، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے شہزاد کی بات کاٹ دی۔ ''میں تم سے کوئی شکوہ شکایت رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں سب جانتا ہوں یہ جس جس طرح ہوا ہے، میں عینی کی ساری خوبیوں خامیوں سے آگاہ ہوں۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہے، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''اس وقت ہمیں کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت بھی نہیں شہزاد! اس وقت تو بس اسے زندگی کی طرف واپس لانا ہے، وہ دن بدن......'' ان کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکے۔

اس شام شہزاد، پیرس کے وسط میں ایک جدید اسپتال کے اندر عینی کے روبرو تھا۔ وہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ کافی کمزور ہو چکی تھی۔ رنگت کی سفیدی میں جو سرخی شامل تھی وہ اب ناپید نظر آتی تھی۔ اس کے سفیدی مائل ہونٹوں پر ہلکی ہلکی پپڑیاں تھیں اور ان پپڑیوں کے ایک طرف نچلے ہونٹ کے گوشے میں وہ چھوٹا سا سرخی مائل نکتہ تھا۔ شہزاد کے طمانچے کی نشانی۔ یہ ایک چھوٹا سا پرائیویٹ روم تھا۔ کھڑکیوں پر پردے کھنچے تھے۔ دواؤں کی ہلکی سی بو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ شہزاد کو دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ شہزاد نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ نیم دراز کر دیا۔ ''نہیں عینی! پلیز لیٹی رہو۔'' اس نے کہا۔

وہ عجیب نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ فرزانہ نے تھوڑی دیر پہلے اسے بتا دیا تھا کہ شہزاد پیرس پہنچ گیا ہے اور اس سے ملنے آ رہا ہے۔ اس کے باوجود عینی کی آنکھوں میں حیرت کے ستارے چمک رہے تھے۔ پھر یہ ستارے آنسوؤں کی ہلکی ہلکی نمی میں ڈوب گئے۔

''آخر آپ کو خیال آ ہی گیا۔'' وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔

''لیکن تمہیں خیال نہیں آیا۔ نہ میرا نہ کسی اور کا۔ دیکھو کیا حال بنا لیا ہے اپنا، لگ رہا ہے کہ عینی کو نہیں اس کی چھوٹی بہن کو دیکھ رہا ہوں۔''

''میں نے تو آپ سے نہ بولنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔'' وہ عجیب سادگی سے بولی۔

''چلو، اب کیا ہو سکتا ہے۔ ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی۔'' شہزاد اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا کومل ہاتھ بالکل سرد تھا۔

''سچ بتائیں، میرے لیے آئے ہیں یا اور بھی کوئی کام تھا؟''

''اور بھی کام تھا۔''

''کیا؟''

''پیرس میں رہنے والی ایک دیوانی سی لڑکی سے ملنا تھا۔ اس کی عقل کو ٹھکانے پر لانا تھا، اسے ٹھیک کرنا تھا۔''

''اگر وہ...... دیوانی سی لڑکی ٹھیک ہونا ہی نہ چاہتی ہو تو پھر؟''

''کبھی کوئی دیوانہ خود بھی ٹھیک ہونا چاہتا ہے؟ اسے ٹھیک کیا جاتا ہے۔''

''کچھ روگ لا دوا بھی تو ہوتے ہیں جی۔'' اس نے کہا۔

''غلط بات ہے، کہا جاتا ہے کہ قدرت نے مرض بعد میں پیدا کیے تھے پہلے ان کی دوائیں پیدا کی تھیں۔''

''مجھے پتا ہے کہ میں آپ سب کو بہت دکھ دے رہی ہوں اور خاص طور سے آپ کو۔''

''اور یہ دکھ تم ختم کر سکتی ہو، خود کو ٹھیک کر کے۔''

وہ شہزاد سے پاکستان کا حال احوال پوچھنے لگی، اس نے فاخرہ، عمیر اور احسن کے بارے میں کرید کرید کر پوچھا۔ اس دوران میں فرزانہ بھی اندر آ گئی۔ وہ ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے۔ کھڑکیوں سے باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہی۔ گاہے بگاہے کسی ایمبولینس کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔

عینی کو باتیں کرتے دیکھ کر فرزانہ خوش ہو رہی تھی۔ سات بجے کے قریب وہ چلی گئی تاکہ گھر کا ایک چکر لگا آئے اور کھانا بھی لے آئے۔

وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ زیادہ تر باتوں کا تعلق پچھلے سال کے پیرس ٹور سے ہی تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں ہی خوش پوش نرس آئی اور عینی کو چند ٹیبلیٹس کھلا کر چلی گئی۔ وہ پھر گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ شہزاد نے عینی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ عینی نے کروٹ لی اور شہزاد کے ہاتھ کو اپنے رخسار کے نیچے رکھ لیا۔ اس کی بیمار آنکھوں میں عجیب سرخوشی دکھائی دینے لگی۔ شاید دوا کا اثر تھا، باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ چہرے پر اطمینان کی عجیب کیفیت لیے ہوئے وہ سو گئی۔ شہزاد کا ہاتھ نہ صرف عینی کے ہاتھ میں تھا بلکہ اس کے رخسار کے نیچے بھی دبا ہوا تھا۔ شہزاد ہاتھ نکالنے کی کوشش کرتا تو وہ جاگ جاتی۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ اپنے خالی ہاتھ سے ایک میگزین کی ورق گردانی کرتا رہا۔ وہ تصویریں دیکھنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ یہ میگزین فرنچ زبان میں تھا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ شہزاد کا ہاتھ تو عینی کے نیم گرم رخسار کے نیچے دبا رہا۔ وہ عینی کے چہرے کی طرف دیکھنے سے کترا رہا تھا۔ وہ جب بھی ایسا کرتا تھا عینی کے چہرے میں نظر آنے والی ''نجمہ کی مشابہتیں'' ایک دم نمایاں ہو جاتی تھیں...... اور اس کے ساتھ ہی اس کے سینے میں ایک عجیب سی لہر اٹھنا شروع ہو جاتی تھی۔

کچھ دیر بعد عینی کے جسم میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی پلکیں بھی متحرک ہو گئیں، اس نے نیم وا آنکھوں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں غنودگی کا خمار تھا...... شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک سوئی رہی ہے۔ اس نے شہزاد کا چہرہ دیکھا اور لڑکھڑاتے لہجے میں مدھم سرگوشی کی۔ ''سچ بتائیں، مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے تھے آپ۔ میں بڑا روئی تھی اس دن...... آپ نے کیوں کیا تھا ایسا؟''

''بس غلطی ہو گئی تھی، میں تم سے...... تم سب سے معافی چاہتا ہوں۔''

''جھوٹ بولا تھا ناں آپ نے؟ آپ کو آفس کا کوئی کام نہیں تھا ناں؟'' وہ سوئے سوئے انداز میں بولتی رہی۔ ''آپ...... صرف مجھ سے دور ہونے کے لیے گئے تھے ناں...... سچ بتائیں ایسا ہی تھا ناں؟''

کھڑکیوں سے باہر بجلی زور سے چمکی اور شیشوں پر بارش کی تھاپ کچھ تیز ہو گئی۔ دور چند میل کے فاصلے پر نوٹرے ڈیم کلیسا کی بلند و بالا روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' اس نے پھر خمار آلود سرگوشی کی۔

''کیا جواب دوں...... مجھے......خود......اپنی سمجھ نہیں آرہی تھی۔''

''اب آرہی ہے؟''

''اب بھی نہیں آرہی۔''

''لیکن مجھے آرہی ہے، آپ نے اپنے اوپر تہ در تہ بہت سے خول چڑھا رکھے ہیں۔ ان خولوں میں سے کچھ بھی باہر نہیں آسکتا لیکن میرے اوپر کوئی خول نہیں ہے مائی لارڈ! اسی لیے میں بڑی آسانی کے ساتھ آپ سے کہہ رہی ہوں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور اب سے نہیں، بہت پہلے سے۔ شاید تب سے جب...... جب میں نے پہلی دفعہ آپ کی اور نجمہ خالہ کی کہانی سنی تھی۔ آپ دونوں نے جو درد جھیلا تھا، وہ درد بچپن سے ہی میرے دل میں گھر بنانے لگا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی، میں آپ کو دیکھنا چاہتی تھی، آپ سے ملنا چاہتی تھی، کسی ایسی ہی بارش برساتی رات میں آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کی زبان سے اس ٹریجڈی کے بارے میں سننا چاہتی تھی لیکن میں آپ سے بہت کم ملی تھی اور پھر یہاں پیرس میں ہوتے ہوئے تو آپ سے ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میں آپ سے دور رہ کر آپ کو سوچتی رہی......سوچتی رہی اور پھر یہی سوچ دھیرے دھیرے چاہت بن گئی اور محبت میں ڈھل گئی......''

اس نے اپنے نرم رخسار کے نیچے دبے ہوئے شہزاد کے ہاتھ کو ہتھیلی کی طرف سے ہولے سے چوما اور اس کی آنکھ سے بہنے والے گرم آنسو شہزاد کی ہتھیلی پر رینگ گئے۔

اس کے ہونٹ بدستور شہزاد کی ہتھیلی سے ٹکراتے رہے۔ وہ عجیب سوئی سوئی سی سرگوشیوں میں بولتی چلی گئی......

''بہت درد ہوا تھا ناں؟ آپ کو بہت درد ہوا تھا ناں۔ جب نجمہ خالہ آپ سے بچھڑی تھیں۔ میں وہ سارا درد آپ سے لے لینا چاہتی ہوں۔ اس درد کے بدلے آپ کو اتنی محبت دینا چاہتی ہوں کہ آپ کو وہ سب کچھ بھول جائے۔ کاش آپ مجھے ایسا کرنے کی اجازت دے سکیں......کاش۔''

''دیکھو عینی۔'' شہزاد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمہیں یہاں رلانے کے لیے نہیں ہنسانے کے لیے آیا ہوں اور اگر تمہیں ایسے ہی رونا ہے تو پھر میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔''

چلے جانے کی بات پر، عینی کی گرفت شہزاد کے ہاتھ پر سخت ہوگئی۔ اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں جی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے پھر شہزاد کی نم ہتھیلی چومی۔

شہزاد نے بہ آہستگی اپنا ہاتھ عینی کے رخسار کے نیچے سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ اچھی منطق ہے بھئی۔ ایک تو رو رہی ہو، دوسرے کہہ رہی ہو کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ کل کہو گی یہ خوشی کا بخار چڑھا ہوا ہے، یہ خوشی کی کھانسی ہو رہی ہے، وغیرہ وغیرہ......''

وہ روتے روتے مسکرانے لگی۔ شہزاد کے سینے پر گھونسا سا لگا۔ اس کا یہ انداز بھی ہو بہو نجمہ کے انداز سے ملتا تھا۔ روتے روتے ہنسنا، جیسے بادلوں میں دھوپ مسکرائے۔

اگلے پانچ چھ روز تک شہزاد نے روزانہ اوسطاً آٹھ دس گھنٹے عینی کے پاس گزارے، نتیجہ نہایت حوصلہ افزا رہا۔ وہ تیزی سے بہتر ہونے لگی۔ جمیل صاحب بھی گاہے بہ گاہے چکر لگا رہے تھے۔ ایک رات اسپتال کی انتظامیہ سے خصوصی اجازت لے کر شہزاد اور فرزانہ دونوں، اسپتال میں رہے۔ عینی سے گپ شپ کرتے رہے اور کارڈز وغیرہ کھیلتے رہے۔ ان پانچ چھ دنوں میں عینی تھوڑی بہت شاعری بھی کرتی رہی۔ شہزاد کمرے کے ڈسٹ بن میں اور اس کے بستر کے آس پاس مڑے تڑے کاغذ دیکھتا تھا جن پر انگلش پوئٹری کے ''آثار'' ہوتے تھے۔

ساتویں روز عینی اسپتال سے گھر شفٹ ہوگئی۔ وہ واقعی بہت بے باک تھی، کوئی بات بھی اپنے دل میں نہیں رکھتی تھی۔ وہ اب جمیل صاحب فرزانہ اور زارا کے سامنے صاف کہہ دیتی تھی...... میں مائی لارڈ کو پسند کرتی ہوں، ان سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اب آگے ان کی اور آنٹی فاخرہ کی مرضی ہے کہ وہ اس زبردست آفر سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ میری طرف سے تو گرین سگنل ہے اور یہ ہمیشہ رہے گا۔

شہزاد نے اندازہ لگا لیا تھا کہ فرزانہ کسی حد تک بیٹی کے جذباتی پن سے ڈرتی بھی ہے۔ اس کے دل میں جیسے خوف بیٹھا رہتا تھا کہ وہ پہلے کی طرح پھر کوئی ایسی حرکت نہ کر جائے جس سے اس کی زندگی کو نقصان پہنچے۔ وہ اب بتدریج بیٹی کی ہاں میں ہاں ملانا سیکھ رہی تھی۔ جہاں تک جمیل صاحب کا تعلق تھا وہ بالکل اور طرز کے آدمی تھے۔ عرصہ دراز تک فرانس میں رہنے کے بعد وہ بالکل مقامی رہن سہن میں ڈھل چکے تھے۔ وہ اس سارے معاملے کو بے حد Lightly لے رہے تھے۔ ان کے نزدیک اگر ان کی بیٹی ایک بڑی عمر کے بندے کو پسند کر رہی تھی اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھی تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ایک بالغ لڑکی کا ذاتی معاملہ تھا اور اس حوالے سے اسے پوری آزادی حاصل

ہونی چاہیے تھی۔

عینی گھر شفٹ ہوگئی تو اس نے اصرار شروع کر دیا کہ شہزاد بھی ہوٹل چھوڑ کر ان کے گھر آجائے۔ شہزاد نے بڑی مشکل سے اسے روکا۔ بہرحال اس نے وعدہ کیا کہ وہ جتنے روز یہاں ہے سارا دن اس کے پاس گزارا کرے گا۔ جمیل اور فرزانہ دو منزلہ گھر میں رہتے تھے۔ یہ قریباً 50 سال پرانا کلاسیکل ٹائپ فرنچ گھر تھا۔ یہاں بیشتر کام لکڑی کا تھا۔ عام گھروں کی طرح یہاں بھی گیراج موجود نہیں تھا اور گاڑی باہر سڑک پر کھڑی ہوتی تھی۔ ایک دن عینی نے فون پر فاخرہ سے بھی بات کی۔ جب وہ بات کر رہی تھی تو شہزاد بھی کمرے میں موجود تھا۔ اس نے شہزاد کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ کہنے لگی...... ''یہ ہم دونوں کی ذاتی باتیں ہیں، میں آپ کو سننے کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' جب شہزاد نے جانے سے انکار کیا وہ اس کو دھمکانے کے لیے چلانے لگی۔ ''پاپا...... پاپا۔'' شہزاد باہر نکل آیا۔

ایک روز عینی کے ماما پاپا کو ایک تقریب میں جانا تھا۔ زارا کے بچے کو فرزانہ اپنے ساتھ لے گئی تھی کیونکہ زارا آفس سے سات بجے کے قریب واپس آتی تھی۔ اس کے شوہر ریحان کے آنے کا وقت بھی تقریباً یہی تھا۔ عینی اور شہزاد گھر میں اکیلے تھے۔ عینی کو دوپہر اور شام کی دوا کھلانا بھی شہزاد ہی کی ذمے داری تھی۔ اس کے علاوہ اس کے کھانے کا دھیان بھی وہ ہی رکھتا تھا۔ بیمار ہونے کے بعد وہ گھر بھر کی بہت لاڈلی ہوگئی تھی۔ اس کی ذرا ذرا سی بات اور چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا بھی پورا خیال رکھا جا رہا تھا اور وہ اس صورتِ حال کو انجوائے بھی کر رہی تھی۔

اس روز وہ اڑ گئی کہ ہر صورت خالہ نجمہ کی پوری کہانی شہزاد کی اپنی زبان سے سنے گی۔ شہزاد نے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ وہ بڑی ''زبردست'' ہوگئی تھی۔ وہ دونوں ایزی موڈ میں صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ عینی نے اپنی دونوں ٹانگیں سامنے شیشے کی منقش میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ شہزاد نے واقعات سنانا شروع کیے تو وہ پوری دلچسپی سے سننے لگی۔ وہ ہر واقعے کی پوری تفصیل جاننا چاہ رہی تھی۔ روداد سنتے سنتے اس نے اپنا سر شہزاد کے شانے سے ٹکا دیا اور اس کا ہاتھ اپنے کومل ہاتھ میں تھام لیا۔ گاہے بہ گاہے وہ اپنا سر شہزاد کے شانے سے ہٹاتی اور کوئی سوال پوچھتی تھی۔ مثلاً

نجمہ خالہ آپ کی امی جان کو کس طرح پکارتی تھیں؟

نجمہ خالہ نے آپ کو کتنی بار خط لکھا؟

پہلی بار آپ نے نجمہ خالہ کو کب پیار کیا؟

آپ کو اور نجمہ خالہ کو دھوکا دینے والی گڈو اب کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

شہزاد ان سارے سوالوں کے جواب اسے دیتا رہا۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو تھوڑا سا نیچے کو کھسک کر نیم دراز ہوگئی اور اپنا سر کمال بے تکلفی سے شہزاد کی گود میں رکھ دیا...... وہ بہت حساس ہو چکی تھی۔ اپنی طبع کے خلاف ہونے والی ذرا ذرا سی بات کا بہت اثر لے لیتی تھی اور یہ اثر فوراً اس کے زرد چہرے سے ظاہر بھی ہونے لگتا۔ یہی وجہ تھی کہ شہزاد بھی اس کے سامنے خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ وہ اسی طرح اپنے بال شہزاد کی گود میں بکھرائے لیٹی رہی۔

اسی دوران میں کال بیل ہوئی۔ شہزاد نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے فرزانہ اور جمیل صاحب تھے، وہ توقع سے پہلے واپس آگئے تھے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، خاص طور سے فرزانہ بہت پریشان تھی۔ ''کیا ہوا فرزانہ؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''ہمیں پتا ہی نہیں تھا، ابا جان پاکستان سے آئے ہوئے ہیں، ابھی ان کا فون آیا تھا۔ وہ گھر پر آرہے ہیں...... اور......میرا خیال ہے کہ انہیں پتا لگ گیا ہے کہ تم بھی یہاں پیرس میں ہو۔''

شہزاد کے سینے میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ تو گویا معاملہ خراب تر ہونے جا رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے ماما؟'' عینی نے باہر آکر پوچھا۔

فرزانہ پہلے تو تذبذب میں رہی، پھر اس نے صورت حال عینی کے بھی گوش گزار کر دی۔

شہزاد نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے فی الحال یہاں سے جانا چاہیے۔''

عینی تنک کر بولی۔ ''کیوں جانا چاہیے، ہم کوئی چور ہیں کہ اس طرح ڈریں۔ آپ یہیں رہیں گے۔''

جمیل نے بھی عینی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے شہزاد! انکل کوئی خاص تمہارے لیے ہی یہاں نہیں آئے ہیں۔ تم جانتے ہی ہو یہاں ان کی پارٹنر شپ ہے، کام کے سلسلے میں وہ چار چھ مہینے بعد چکر لگاتے رہتے ہیں......''

فرزانہ شوہر کی اس وضاحت سے مطمئن نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندیشوں کے گہرے سائے تھے۔ شہزاد نے کہا۔ ''ٹھیک ہے بھائی جان......لیکن مجھے تو اب ویسے بھی جانا تھا۔ ایک مقامی جرمن دوست سے ملنا تھا۔''

''آپ کہیں نہیں جائیں گے۔'' عینی نے شہزاد کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

شہزاد اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ تین چار منٹ کی تگ ودو سے وہ اسے نیم رضامند کرنے میں کامیاب ہوا۔ فرزانہ نے بھی اس سلسلے میں شہزاد کی تھوڑی سی سپورٹ کی لیکن جس وقت شہزاد باہر جانے کے لیے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا، صورت حال نے پلٹا کھایا...... دروازے سے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ گاڑی کا دروازہ بند ہوا اور کال بیل ہوگئی۔ فرزانہ نے ڈرے ڈرے انداز میں دروازہ کھولا اور اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ سامنے ماموں جہانگیر کھڑے تھے۔ انہوں نے حسبِ معمول قیمتی کپڑے کی شلوار قمیص کے ساتھ سیاہ رنگ کا ویسٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ ان کی مونچھیں بالکل سفید ہوچکی تھیں۔ سر کے تین چوتھائی بال بھی سفید تھے تاہم چہرے پر جوانی والی سرخی اور تمتماہٹ برقرار تھی۔ آج یہ تمتماہٹ شہزاد کو پچھلی ملاقات سے بڑھ کر نظر آئی۔

شہزاد کو باقاعدہ گھر میں دیکھ کر وہ چند سیکنڈ کے لیے متحیر دکھائی دیے، پھر ان کا چہرہ سرخ ہوتا چلا گیا۔ ذرا دیر کے لیے یوں لگا کہ وہ غضب سے پھٹ پڑیں گے...... یا پھر شاید شہزاد پر جھپٹ ہی پڑیں لیکن پھر پتا نہیں انہوں نے کس طرح خود کو سنبھالا۔ فرزانہ اور جمیل صاحب کے سلام کا جواب سر کی جنبش سے دیتے ہوئے سامنے کمرے میں چلے گئے۔ شہزاد تذبذب میں کھڑا تھا۔ عینی نے آگے بڑھ کر پھر اس کا بازو تھام لیا۔ ان لمحوں میں وہ بڑی دلیر نظر آرہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''دیکھیں شہزاد، نانا نے آپ کو دیکھ تو لیا ہے، اب آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ آج انہوں نے جو کہنا ہے کہہ لیں۔ میں بھی ان کو بڑے مناسب جواب دوں گی۔''

''عینی! میں کسی طرح کا جھگڑا نہیں چاہتا، اگر......''

''جھگڑا ہم نہیں کررہے۔'' اس نے تیز سرگوشی میں شہزاد کی بات کاٹی۔ ''جھگڑا نانا اور شارق کر رہے ہیں، ہمارے معاملات میں اور ہمارے گھر میں ''انٹرفیئر'' کر رہے ہیں۔ ماما کو بھی الجھنوں میں ڈال رہے ہیں۔''

اسی دوران میں جمیل صاحب نے بھی شہزاد کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ بھی شہزاد کو رکنے کا کہہ رہے تھے۔

شہزاد سخت تذبذب میں تھا۔ اتنے میں ماموں جہانگیر باہر آگئے۔ ان کے سرخی مائل چہرے پر نظر آنے والی وحشت اب قدرے کم تھی۔ لگتا تھا کہ بہت کوشش کرکے انہوں نے اپنی اندرونی حدت کو کنٹرول کیا ہوا ہے۔ ''تم کب آئے یہاں؟'' انہوں نے سپاٹ لہجے میں شہزاد سے پوچھا۔

''تو دس روز ہوئے ہیں جی۔ آفس کا کام تھا، یہاں پاس ہی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

انہوں نے اس انداز سے شہزاد کو دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں کہ میں اندھا نہیں ہوں جو تمہاری اس بات پر یقین کروں گا۔

چند رسمی باتوں کے بعد انہوں نے ڈرائنگ روم میں نشست سنبھال لی اور شہزاد، فرزانہ وغیرہ سے بھی کہا کہ وہ اندر آجائیں، انہیں ضروری بات کرنی ہے۔ شہزاد، فرزانہ اور جمیل صاحب ڈرائنگ روم میں آگئے۔ عینی دوسری طرف چلی گئی۔ ماموں جہانگیر نے بڑے گمبھیر لیکن دھیمے لہجے میں بات شروع کی انہوں نے سب کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا ان سب کو اندازہ نہیں ہے کہ یہ کتنا خطرناک کام ہورہا ہے اور اس کی وجہ سے پورے خاندان کی عزت وناموس کا کیا حشر ہوگا...... وہ سب خاموش رہے۔ انہوں نے مہیب انداز میں کہا۔ ''دیکھو! میں تم کو آخری بار سمجھا رہا ہوں اور تم میں سے کسی ایک کو نہیں کہہ رہا سب کو کہہ رہا ہوں۔ ایک بچی کے پیچھے نہ جاؤ، ورنہ سب کچھ تباہ ہوجائے گا۔ یہ بڑا نازک معاملہ ہے، اگر ایک دفعہ بگڑ گیا تو ایسا تماشا لگے گا کہ...... اس کا خیال کرکے ہی دل کانپ جاتا ہے۔''

یہی وقت تھا جب اچانک عینی دروازے پر نمودار ہوئی...... اس نے حیران کن لہجے میں کہا۔ ''نانا آپ شادی کو تماشا کیوں کہہ رہے ہیں، کیا شادی تماشا ہوتی ہے؟'' اس کے فقرے نے سب کو مبہوت کردیا۔ یوں لگا جیسے زبردست چھناکے سے ایک بہت بڑا پتھر کسی شیش محل میں آن گرا ہے۔ اس کا انداز دیدنی تھا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ تن کر سب کے سامنے کھڑی تھی۔

''یہ...... کیا...... کہہ رہی ہے؟'' ماموں جہانگیر نے تعجب سے فرزانہ کی طرف دیکھا۔

فرزانہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''عینی! تم اپنے کمرے میں جاؤ، جب بڑے بات کررہے ہوں تو اس طرح نہیں بولتے۔''

اس نے بڑے اطمینان سے فرزانہ کو دوبارہ صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''جب بات میرے بارے میں ہورہی ہو تو پھر مجھے بولنے کا پورا رائٹ ہے۔'' تب اس نے نانا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور بولی۔ ''جی نانا! میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر میں شہزاد صاحب سے شادی کرنا چاہ رہی ہوں تو اس میں تماشا لگنے والی کون سی بات ہے، تماشا تو تب لگ سکتا ہے جب اس میں خوامخواہ روڑے اٹکائے جائیں۔''

فرزانہ پھر کراہی۔ ''عینی...... تم جاؤ یہاں سے۔''

''چلی جاتی ہوں ماما، مگر مجھے اپنی بات تو مکمل کرلینے

دیں۔'' وہ دوبارہ نانا جہانگیر سے مخاطب ہوئی۔ ''ہاں نانا! اگر میں اپنی مرضی سے سوچ سمجھ کر کسی سے میرج کرنا چاہتی ہوں تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہے؟''

شہزاد نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ تیزی سے بولی۔ ''آپ ابھی چپ رہیں جی۔ میں نے نانا سے پوچھا ہے، انہیں جواب دینے دیں۔'' وہ سب پر حاوی نظر آرہی تھی۔

شہزاد کے ماموں جہانگیر کا چہرہ تپتے ہوئے لوہے کی طرح سرخ ہوا۔ ایک بار پھر لگا کہ وہ سینے کی پوری طاقت سے چنگھاڑنا شروع کر دیں گے مگر موقعے کی نزاکت دیکھتے ہوئے بدستور سنبھلے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''عینی! لگتا ہے تو اپنے حواس میں نہیں ہے، تجھے پتا ہے تو کتنی بڑی بات کہہ رہی ہے؟''

''بڑی بات کہہ رہی ہوں، اس لیے بڑے حوصلے سے بھی کہہ رہی ہوں۔ میں جب شادی کروں گی، اپنی مرضی سے کروں گی اور میری مرضی آپ اچھی طرح جان گئے ہیں۔''

''یعنی تم شہزاد سے شادی کروگی؟'' ماموں جہانگیر نے سرخ آنکھیں جھپکائیں۔

''ہاں...... اگر اس شادی کو ہونا ہے تو پھر اس میں کون سی رکاوٹ ہے۔ مجھے بتائیں کون سی رکاوٹ ہے، ایک پڑھی لکھی، عاقل بالغ لڑکی اپنے لیے ایک شریک حیات چنے گی اور وہ شریک حیات ایک پڑھی لکھی لڑکی کو چنے گا۔ درمیان میں آپ کہاں سے آگئے جناب! اور کس ناتے سے آئے؟ مجھے بتائیں، کیا سوسائٹی اس کی اجازت نہیں دیتی؟ کیا قانون اس کی راہ میں رکاوٹ ہے، یا پھر مذہب کا کوئی معاملہ ہے؟''

''مذہب کو درمیان میں مت لاؤ عینی۔'' ماموں جہانگیر نے تنبیہ کی۔

''مذہب کو میں نہیں آپ جیسے ٹھیکیدار ہی ہر جگہ بیچ میں لاتے ہیں۔ میں آپ کو اس کا ثبوت دے سکتی ہوں بلکہ...... ثبوت ہے میرے پاس۔ میں لے کر آئی ہوں، اس نے ایک کاغذ نانا اور والدہ کے سامنے لہرایا، یہ ایک پرانا لیٹر پیڈ تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' نانا جہانگیر نے پوچھا۔

''یہ ایک خط ہے، پچیس چھبیس سال پرانا۔ آپ نے پاپا کو لکھا تھا۔ ماما اس وقت شادی کے بعد سان فرانسسکو میں تھیں۔ اس خط میں آپ نے اس جھگڑے کا ذکر کیا ہے جو خالہ نجمہ کی شادی کے سلسلے میں پیدا ہوا تھا...... اور جس میں پڑنانی کا دودھ پینے کا کوئی معاملہ تھا، یہ دیکھیں...... یہ آپ ہی کا فقرے میں نے انڈر لائن کر رکھے ہیں، یہ پڑھیں...... یہ آپ ہی کا لکھا ہوا ہے۔'' اس نے خط نانا کے سامنے لہرایا۔

وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے، ان کا غضب بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ بولی۔ ''چلیں، میں خود آپ کو پڑھ کر سنا دیتی ہوں۔

آپ جناب نے بڑے عالمانہ انداز میں ارشاد فرمایا ہے، مجھے سوسائٹی کا کوئی ڈر ہے، نہ ہی میں اس کی پروا کرتا ہوں۔ قانون بھی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرے لیے جو کچھ ہے میرا دین ہے اور دین کے احکام ہیں اور دین کا حکم یہ ہے کہ دودھ کی شراکت کی وجہ سے نجمہ کی حیثیت شہزاد کی خالہ کی ہو چکی ہے اس لیے یہ شادی نہیں ہو سکتی۔''

خط کے فقرے پڑھنے کے بعد عینی نے جلتی نظروں سے نانا کو دیکھا۔ ''تو جناب...... اب پچیس سال بعد آپ کا پیمانہ کیوں بدل رہا ہے؟ آپ اب بھی یہی کہیں کہ آپ سوسائٹی، اپنی ذاتی رائے اور اردگرد کے ماحول کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اب بھی کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے آپ کے نزدیک مذہب ہی اہم ترین معیار ہے۔ اب آپ مذہب کو درمیان میں نہ لانے کی بات کیوں فرما رہے ہیں؟''

''تم کیا جانتی ہو مذہب کے بارے میں؟'' ماموں جہانگیر بھڑکے۔ ''تمہارا کیا واسطہ ہے ان چیزوں سے؟''

''ہاں، میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس حوالے سے میری نالج آپ کی طرح نہیں لیکن اپنی زندگی اور اپنے موجودہ مسئلے کے بارے میں ضروری باتیں میں اب بھی جانتی ہوں جناب۔ میں آپ کے ساتھ پوری دلیل سے بات کر سکتی ہوں۔''

ماموں جہانگیر پھنکارے۔ ''مذہب تو یہ بھی کہتا ہے کہ اپنے ماں باپ کے سامنے اف تک نہ کرو...... اور تم کیا کر رہی ہو؟''

''مجھے پتا تھا، آپ کوئی اس طرح کا حوالہ ضرور دیں گے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں آپ نے اس طرح کے حوالے تب کیوں نہ ڈھونڈے جب آپ کا سارے کا سارا زور اس بات پر صرف ہو رہا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے آپ نے نجمہ خالہ کی شادی ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہونے دینی۔ اس وقت کچھ ایسی Opinions بھی سامنے آئی تھیں جن میں ''شک کی رعایت'' دینے کی بات تھی۔ اس وقت آپ نے لچک کیوں نہ دکھائی؟ اس وقت تو آپ کا سارا زور ایسا فتویٰ ڈھونڈنے پر صرف ہو رہا تھا جو آپ کے ذہن کے عین مطابق ہو اور آپ نے دو چار نہیں، آٹھ دس نہیں، بیسیوں فتوے لے ڈالے۔ نہیں محترم نانا صاحب! بات یہ نہیں ہے، بات کبھی بھی یہ نہیں تھی۔ آپ جیسے لوگ مذہب، قانون اور معاشرے

کو صرف اپنے من پسند نتیجے حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آپ کا دین ایمان صرف ''ضد'' ہوتی ہے...... صرف ''ضد''۔''

ماموں جہانگیر نے بہت برداشت کیا تھا۔ ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ ان کا چہرہ دہکا اور وہ اپنے جانے پہچانے انداز میں دھاڑے۔ ''خاموش ہو جا...... اگر اب تو نے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو میں زبان کھینچ لوں گا۔''

''تو کھینچ لیجیے زبان۔ آپ نے ہمیشہ زبانیں کھینچنے کے سوا اور کیا بھی کیا ہے لیکن یاد رکھیے میری آواز کو آپ زبان کھینچ کر بھی خاموش نہیں کر سکتے۔ میں پھر بھی بولتی رہوں گی۔''

''خاموش ہو جاؤ عینی۔'' شہزاد دھاڑا۔

''آپ چپ رہیں، آپ سب چپ رہیں۔'' وہ بھی جواباً دھاڑی۔ ''میں آج انہیں ان کے ہر سوال کا جواب دوں گی، میں دیکھتی ہوں آج ان کا غصہ کہاں تک پہنچتا ہے اور کون سی قیامت ڈھاتا ہے۔ یہ ہمیشہ چلاتے رہے ہیں اور آپ سب لوگ گنگ ہو کر سنتے رہے ہیں لیکن آج یہ چلائیں گے تو میں بھی چلاؤں گی۔ ہاں میں بھی چلاؤں گی۔''

اس کی آواز میں ان منہ زور پانیوں کا شور تھا جو مدتوں کسی پتھریلی دیوار سے سر پٹختے ہیں اور پھر ایک روز پتھروں میں شگاف ڈال کر طوفانی انداز میں بہہ نکلتے ہیں۔ شہزاد کو لگا کہ عینی کے لہجے میں کوئی اور بول رہا ہے۔ کسی اور کی نارسائیاں، مجبوریاں اور بے زبانیاں ہیں جو آج ''مجسم آواز'' ہو کر عینی کے چنگھاڑتے الفاظ کا روپ دھار گئی ہیں۔

ماموں جہانگیر گرجے۔ ''الو کی پٹھی! تیری یہ مجال، میں تجھے جان سے مار دوں گا۔'' انہوں نے عینی کی طرف قدم بڑھائے۔

جمیل احمد درمیان میں آگئے۔ ''نہیں...... انکل...... پلیز ایسا نہ کریں، آپ کی آواز باہر تک جا رہی ہے۔''

''اوئے تم ہٹ جاؤ پیچھے۔'' ماموں جہانگیر دھاڑے۔ ''تم کچھ کرنے کے قابل ہوتے تو آج اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے، تم نے ہی اس بدبخت کو اتنی ڈھیل دی کہ آج یہ ہماری عزتوں کا جنازہ نکال رہی ہے۔''

''پلیز انکل، پلیز۔'' جمیل احمد نے انہیں سنبھالنا چاہا۔

فرزانہ نے پھنکار کر عینی سے کہا۔ ''عینی! کچھ حیا کر، دفع ہو جا یہاں سے۔''

''نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے آج یہ بات ختم کرنے دیں۔'' وہ سرتاپا مزاحمت، بن کر کھڑی تھی۔

ماموں جہانگیر ایک بار پھر اس کی طرف گئے لیکن عینی کو دبوچنے کے بجائے وہ سیدھا بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے لکڑی کا وزنی دروازہ کھولا اور زور سے آواز دی۔

''انوار...... انوار، اندر آؤ۔''

دو تین سیکنڈ میں بڑی بڑی مونچھوں والا ایک گارڈ ٹائپ شخص اندر آگیا۔ وہ ہندوستانی یا پاکستانی تھا۔ اس نے پتلون قمیص پر سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ماموں جہانگیر نے عینی کو بازو سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے پچھلے کمرے کی طرف بڑھے۔ ''میں تجھے تالے میں بند کروں گا...... آج ہی تیرا نکاح پڑھواؤں گا، آج ہی پڑھواؤں گا۔''

عینی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ بیماری نے اسے کمزور تو کر رکھا تھا۔ اس نے چلانا چاہا مگر ماموں جہانگیر نے اس کا منہ ڈھانپ لیا۔ اس کھینچا تانی میں عینی کی قمیص پھٹی اور کہنی بھی زخمی ہو گئی۔ ماموں جہانگیر نے اسے ایک عقبی کمرے میں دھکیل دیا۔ وہ صوفے پر گر گئی۔ ماموں جہانگیر نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ گھومے اور خوفناک لہجے میں شہزاد کو مخاطب کیا۔ ''اگر تجھے بھی اپنی جان عزیز ہے ناں تو یہاں سے چلا جا۔ بس ایک دو دن کے اندر چلا جا۔ ورنہ وہ سب کچھ ہوگا جو تو سوچ بھی نہیں سکتا۔''

عینی کمرے کے اندر چلا رہی تھی، وہ دروازے پر اور کھڑکیوں پر مکے برسا رہی تھی۔ جمیل احمد صاحب نے اپنے لرزتے کانپتے فربہ وجود کو سہارا دے کر آگے بڑھنا چاہا لیکن ماموں جہانگیر کے اشارے پر انوار نامی گارڈ نے انہیں روک دیا۔ ''آپ پیچھے ہٹ جائیں سر۔'' گارڈ نے بے لچک لہجے میں کہا۔ فرزانہ بھی گنگ کھڑی تھی۔

عینی کو کمرے میں بند کرتے ہوئے ماموں جہانگیر یہ بھول گئے تھے کہ اس کے پاس موبائل فون بھی ہے۔ بہ مشکل تین چار منٹ گزرے ہوں گے کہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ گاڑیاں فرزانہ کے گھر کے عین سامنے آرکیں۔ چند لمحے بعد کال بیل ہوئی اور دروازے پر زوردار دستک بھی۔

شہزاد نے دیکھا ماموں جہانگیر کا سرخ انگارہ چہرہ ایک دم بجھ سا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کا موچھیل گارڈ بھی پریشان نظر آیا۔ جمیل احمد صاحب نے دروازہ کھولا، فرنچ پولیس کے قریباً چار عدد باوردی اہلکار اندر گھس آئے۔ انہیں کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، بند کمرے میں عینی کے چلانے کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ایک اہلکار نے ہولسٹر میں سے پستول برآمد کرلیا تھا۔ دوسرے دو اہلکاروں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ عینی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح تیزی سے باہر آگئی۔ وہ فرنچ زبان میں تیزی سے کچھ کہنے لگی۔ وہ اپنی خون آلود کہنی بھی اہلکاروں کو دکھا رہی تھی۔ فرزانہ نے آگے بڑھ کر اسے چپ کرانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں مزید پولیس بھی دروازے پر پہنچ گئی۔

یہ سب کچھ بس تین چار منٹ کے اندر وقوع پذیر ہوگیا۔ عینی کے ابتدائی بیانات سننے کے فوراً بعد پولیس اہلکاروں نے ماموں جہانگیر اور ان کے گرانڈیل گارڈ کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ ماموں کے چہرے کی دائمی سرخی ہلکی سی زردی میں بدل چکی تھی۔ انہیں جیسے حالات کی اس تیز رفتار تبدیلی پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ فرزانہ نے شکستہ فرنچ میں پولیس اہلکاروں سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ یقیناً وہ اپنے والد کے لیے کوئی رعایت حاصل کرنا چاہ رہی تھی لیکن رعایت یہاں کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ ماموں جہانگیر اور ان کے گارڈ کو دھکیل کر گاڑی میں بٹھایا گیا۔ عینی اور جمیل صاحب کو علیحدہ گاڑی میں بٹھایا گیا اور بٹھانے سے پہلے عینی کو کچھ طبی امداد بھی دی گئی، اس کے بعد گاڑیاں تیزی سے پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئیں۔ اردگرد کے گھروں کی کھڑکیوں اور بالکونیوں سے تماشائی آنکھیں جھانک رہی تھیں۔

شہزاد یہاں پردیسی تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کس طرح ری ایکٹ کرے۔ فرزانہ بھی مسلسل رو رہی تھی۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد عینی اور جمیل صاحب تو ٹیکسی کے ذریعے واپس آگئے۔ جہانگیر صاحب اور ان کے ملازم کو بلاتردد سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا گیا۔

☆☆☆

شہزاد کے ماموں جہانگیر کو گرفتار ہوئے چودہ پندرہ روز ہوچکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ''مقامی نظام انصاف'' کے نہایت سخت شکنجے میں آگئے تھے۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے ایک بالغ لڑکی پر تشدد کیا۔ اس کی شخصی آزادی میں سنگین مداخلت کی اور اپنی مرضی کی شادی کے لیے اسے حبس بے جا میں رکھا وغیرہ وغیرہ۔ کورٹ سے ان کی ضمانت مشکل نظر آرہی تھی۔ اس ضمانت کے لیے ضروری تھا کہ عینی اپنے دل میں ان کے لیے نرم گوشہ پیدا کرے اور نرم بیانات دے۔

فرزانہ کا رو رو کر برا حال تھا کبھی وہ عینی کو کوستی، کبھی اس کی منت سماجت میں مصروف ہوجاتی تھی۔ گاہے بہ گاہے اسے اپنے والد کی آتش مزاجی پر بھی رنج ہوتا تھا۔ ماموں جہانگیر کے طیش کی وجہ سے بات نہ صرف کورٹ کچہری تک گئی تھی بلکہ اردگرد کے پڑوسیوں کے ہاتھ بھی ایک دلچسپ موضوع آگیا تھا۔

شہزاد تین چار دن تو ہوٹل میں ہی رہا تھا۔ وہ وہاں سے واپسی کا پروگرام بنا رہا تھا لیکن پھر فرزانہ نے ہاتھ جوڑ کر اسے جانے سے روک لیا۔ اس نے شہزاد کی منت کی کہ وہ عینی کو اپنے بیانات بدلنے کے لیے آمادہ کرے، وہ کسی کی بات نہیں مان رہی ہے۔

اس حوالے سے ایک روز دریائے سین کے کنارے سبزے پر بچھی ہوئی سنہری دھوپ میں شہزاد اور عینی کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ عینی اب روبہ صحت تھی۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں اب پھر سرخی مائل جلد کے نیچے چھپنا شروع ہوگئی تھیں...... اپنی گفتگو کے آخر میں شہزاد نے کہا۔ ''عینی کچھ بھی ہے، ہمیں اس سنگین معاملے کو اب اور سنگین نہیں کرنا چاہیے۔ بہرطور ہمارے آپس میں خونی رشتے ہیں، ہمیں ایک ساتھ جینا ہے۔ اگر اب ماموں کے رویے میں نرمی پیدا ہوئی ہے تو ہمیں بھی کچھ نرمی پیدا کرلینی چاہیے۔ انہیں اس مصیبت سے نکالنا چاہیے۔ میں نے سنا ہے کہ چھ سات روز بعد شارق اور سکندر (ماموں کا دوسرا بیٹا) بھی پاکستان سے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ ہمیں ان کی آمد سے پہلے ہی معاملے میں سدھار پیدا کرلینا چاہیے۔''

''آپ کا مطلب ہے ان دونوں سے ڈر کر؟''

''نہیں عینی! مجھے صرف اور صرف تمہاری ماما کا خیال آتا ہے، کچھ بھی ہے آخر وہ بیٹی ہے۔ جس طرح تمہارے لیے جمیل بھائی جان اہم ہیں، اس کے لیے ماموں جہانگیر ہیں۔''

اس نے دریائے سین کی بہت سی تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں اتاری اور بالوں کو پیچھے جھٹک کر بولی۔ ''ٹھیک ہے مائی لارڈ! اگر آپ کی عدالت نرمی کا مظاہرہ کر رہی ہے تو میں بھی اس بارے میں سوچوں گی۔''

''سوچنا نہیں ہے عینی! یہ کرنا ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر لاڈ سے کہنے لگی۔ ''اوکے...... لیکن میری دو شرطیں ہیں۔''

''وہ کیا کیا؟''

''پہلی یہ کہ پرسوں ہفتہ ہے، پرسوں کا سارا دن، صبح آٹھ بجے سے لے کر رات آٹھ بجے تک آپ میرے ساتھ...... صرف میرے ساتھ، پیرس کی سیر کرتے ہوئے گزاریں گے۔''

''اور دوسری شرط؟''

وہ قدرے سنجیدہ ہوگئی۔ ''دوسری یہ جناب کہ آپ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچتے ہوئے کسی دباؤ کے بغیر سوچیں گے اور جو فیصلہ کریں گے اپنے دل کی آواز کے مطابق کریں گے۔'' وہ دونوں فٹ پاتھ پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

''یہ دوسری شرط کافی کڑی ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

''اور یہی زیادہ اہم ہے جی۔ اگر آپ نے یہ پوری کرنے کا وعدہ نہیں کیا تو پھر میں کچھ نہیں کروں گی۔''

''کچھ نہیں سے کیا مطلب؟''

''نہ کورٹ میں کوئی نرم بیان دوں گی...... نہ ٹھیک ہوں گی۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''ایک دم پھر بیمار پڑ جاؤں گی اور اس مرتبہ شاید آپ جناب بھی مجھے اسپتال سے نکال نہیں سکیں گے۔'' اس کا لہجہ گمبھیر تھا۔

''خبردار، اب بیمار ہونے کی بات نہیں کرنا۔'' شہزاد نے بے چین ہوکر اسے اپنے ساتھ لگالیا لیکن پھر فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ لوگ ان دونوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اس نے جلدی سے اپنا بازو اس کے کندھوں سے ہٹالیا۔ اس کے اس طرح کرنے پر عینی نے چلتے چلتے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دلکش احتجاج نظر آیا۔ بڑے ٹھسے سے اس نے شہزاد کا بازو پکڑ کر دوبارہ اپنے کندھوں پر رکھا اور شہزاد کے بالکل ساتھ لگ گئی۔ اس کا چہرہ شہزاد کے سینے میں دھنس رہا تھا...... اور وہ دونوں اسی طرح چلتے جا رہے تھے۔ شہزاد نے محسوس کیا کہ یہ اس کی غلط فہمی تھی، کوئی بھی ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب اپنے حال میں مست، رواں دواں تھے۔

''کاش یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔'' وہ شہزاد کی کمر میں بازو حمائل کرکے منمنائی۔

شہزاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سامنے ہی وہ بلند و بالا ہوٹل نظر آرہا تھا جہاں شہزاد پچھلی مرتبہ آکر ٹھہرا تھا۔ شہزاد نے چونک کر بائیں طرف دیکھا...... وہاں سڑک سے نیچے اترتی ہوئی چوڑی سیڑھیاں تھیں جو بالکل دریا کے کنارے تک جاتی تھیں۔ یہاں سبزہ تھا اور پتھر کے بینچ پڑے تھے، شہزاد کی نظر دائیں بائیں کچھ تلاش کرنے لگی۔

عینی بولی۔ ''ان دونوں بوڑھوں کو دیکھ رہے ہیں ناں جو یہاں نظر آیا کرتے تھے؟''

''ہاں...... وہ آج تو نظر نہیں آرہے۔''

''اب وہ شاید کبھی نظر نہیں آئیں گے۔'' عینی کھوئی کھوئی سی بولی۔ ''آپ کے جانے کے تین چار ماہ بعد میں بھی یہاں آئی تھی۔ وہ دونوں اس وقت بھی نہیں تھے۔ پھر میں نے یہاں گھومنے والے دو تین بندوں سے پوچھا۔ ایک فرنچ لڑکی نے بتایا۔ ان میں سے ایک، تین ماہ پہلے نمونیے کا شکار ہوکر مر گیا تھا۔ دوسرا یہ جگہ چھوڑ کر چلا گیا۔ شاید کسی دور دراز گاؤں کی طرف۔ وہ فرنچ لڑکی بھی ان دونوں کے بارے میں بس اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ عرصۂ دراز سے یہاں نظر آتے تھے۔ کون تھے؟ کیا کرتے تھے۔ ان کا ماضی کیا تھا؟ اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی آخری نشانی کی طرح وہ چپ چاپ یہاں بیٹھے رہتے تھے۔''

''یعنی، اب ہم ان کے بارے میں کبھی نہیں جان سکیں گے؟''

''ہاں، کبھی نہیں۔''

''تو ٹھیک ہے عینی! پرسوں ہم سیر کے لیے نکلیں گے تو سب سے پہلے ایفل ٹاور ہی چلیں گے۔ کہیں پھر یہ ٹاور بھی ایک تجسس ہی نہ رہ جائے۔''

وہ ہنسی۔ ''ہاں، ہر قسم کے تجسس کو جلد دور ہوجانا چاہیے کیونکہ وقت کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔''

پتھر کی روش پر چلتے چلتے وہ کچھ اور بھی شہزاد کے ساتھ پیوست ہوگئی۔ شہزاد کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اسے ایسا کرنے دیتا۔

☆☆☆

اور یہ ایفل ٹاور تھا۔ ایک ماورائی مقام، کہانیوں اور افسانوں کا محور، سپنوں کی تعبیر...... اور وہ ان کے سامنے تھا۔ نوٹرے ڈیم کلیسا اور مونا لیزا کی تصویر کی طرح وہ بھی کہہ رہا تھا...... ہاں میں ایفل ٹاور ہوں...... فرانس کی اہم ترین پہچانوں میں سے ایک پہچان۔ تم مجھے اور فرانس کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتے .... میں سرتاپا آہن ہوں۔ 7300 ٹن لوہا اپنے اندر سموئے...... اپنے 984 فٹ بلند وجود کے ساتھ میں قریباً 120 سال سے پیرس کے وسط میں کھڑا ہوں اور زمانے کے سرد گرم کا سامنا کر رہا ہوں۔ میں نے دنیا کی دو عظیم جنگیں دیکھی ہیں۔ میں تاریخ کو تہ و بالا کرنے والے لاتعداد واقعات کا شاہد ہوں۔ دریائے سین کے ساتھ میری دوستی غیر متزلزل ہے۔ ہم دونوں نے یہاں اپنے سبزہ زاروں میں محبت کی لاتعداد کہانیاں شروع ہوتے، پروان چڑھتے اور انجام پاتے دیکھی ہیں۔ آج تم میرے روبرو ہو، کل کوئی اور ہوگا...... میں اپنے بے مثال

خالق انجینئر الیگزینڈر ایفل کی طرف سے تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔

یہ ہفتے کی صبح تھی۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ ہلکی پھوار کے بعد چمکیلی دھوپ نکل آئی تھی۔ چاروں طرف سیاح.... اُمڈے پڑ رہے تھے۔ دریائے سین، ٹاور کے پاس سے گزرتا ہے اور قرب وجوار کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ ٹاور کے گرد سبزہ زاروں میں لوگ چادریں اور چٹائیاں وغیرہ بچھائے بیٹھے تھے۔ دریا پر ان گنت چھوٹی بڑی کشتیاں تیر رہی تھیں اور ان پر خوش باش لوگوں کا ہجوم بھی تھا۔ موسیقی کی دھنیں فضا میں بکھر رہی تھیں اور چاروں طرف خوشبوؤں کا بسیرا تھا۔ عینی بڑی بے باکی سے شہزاد کا ہاتھ پکڑے چل رہی تھی۔ اس کے بال ہوا کے زور سے بار بار جھومتے اور شہزاد کے چہرے سے ٹکراتے تھے۔ یہ بال جیسے اسے ''ان چاہی'' راہوں پر چلنے کے لیے اکساتے تھے...... اور وہ بتدریج اپنے اندر کی مزاحمت کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔ ایسا ہو رہا تھا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے ایک جگہ سے چیری لی اور گھومتے پھرتے، کھاتے رہے۔

ٹاور کے اوپر جانے کے لیے دو طرح کے ٹکٹ تھے۔ ایک تقریباً ساڑھے نو یورو کا دوسرا ساڑھے چودہ یورو کا۔ شہزاد کا خیال تھا کہ شاید سستا ٹکٹ لینے والے کو سیڑھیوں کے ذریعے ٹاور پر جانا ہوگا اور مہنگا لینے والے کو لفٹ کی سہولت مہیا کی جائے گی۔ عینی اس پر بہت ہنسی۔ ہنستے ہنستے اس نے شہزاد کو بتایا کہ سستا ٹکٹ ٹاور کی پہلی منزل تک لے جاتا ہے اور مہنگا ٹاور کے ٹاپ پر۔ دونوں ٹکٹ ہولڈرز لفٹ کے ذریعے ہی جاتے ہیں۔

ایفل ٹاور مکمل طور پر لوہے کا ہے جس پر موٹا خاکستری روغن چڑھا دیا گیا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر یہ شہزاد کو لوہے کے ہزارہا چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک مجموعہ نظر آیا۔ جنہیں انجینئر حضرات لاکھوں بولٹس کے ذریعے آپس میں جوڑتے چلے گئے تھے۔ طویل قطار سے گزرنے کے بعد وہ لفٹ تک پہنچے۔ یہ لفٹ خاصی بڑی تھی۔ ایک وقت میں سو سے زیادہ افراد اس میں سما سکتے تھے۔ اس لفٹ نے انہیں ٹاور کی پہلی منزل تک پہنچایا۔ یہاں سے چھوٹے سائز کی پانچ چھ لفٹیں چلتی تھیں جو ٹاور کے ٹاپ تک پہنچاتی تھیں۔ اس جگہ انہیں بیچ در بیچ قطار میں بہت انتظار کرنا پڑا۔ یہاں جوڑے ایک دوسرے میں گم نظر آتے تھے اور بوس وکنار کے مناظر عام تھے۔ شاید یہ ماحول عینی پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے بے تکلفی سے شہزاد کی کمر کے گرد بازو حمائل کر دیتی تھی اور اس کے کندھے سے چپک جاتی تھی۔

اس طویل قطار میں کھڑے شہزاد نے بے حد سنجیدگی سے سوچا۔ ''شہزاد! تم کدھر جا رہے ہو۔ تمہارے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو چکی ہے اور یہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اپنے اندر کی تبدیلیوں پر اچھی طرح غور کر لو۔ کہیں تم بھی تو ان بڑی عمر کے مردوں میں شامل نہیں ہو رہے جو اوپر سے تو پارسا بنتے ہیں لیکن جن کے دلوں میں کسی نازنین کی نگاہوں کا مرکز بننے کی خواہش مچلا کرتی ہے اور جب اتفاقاً ایسی خواہش پوری ہونے کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں تو ان کا نفس خوشی سے پھول کر کپا ہو جاتا ہے۔ وہ اسے صنف مخالف پر ایک بڑی فتح سمجھتے ہیں۔ وہ بظاہر گریز کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کے اندر دبی ہوئی آرزوئیں، انگڑائیاں لے کر بیدار ہو جاتی ہیں۔ ان آرزوؤں کی تکمیل کے پیش نظر وہ ان سارے مسائل کو فراموش کر دیتے ہیں جو ان کے بے جوڑ تعلق سے پیدا ہونے والے ہوتے ہیں...... ہاں سوچ لو شہزاد۔

وہ اپنے خیالوں میں غرق رہا اور خود ہی سے الجھتا رہا۔ اسی کیفیت میں وہ ٹاور کے ٹاپ پر پہنچ گئے۔ یہاں سے پیرس کا نظارہ نہایت دل آویز تھا۔ ٹاور کے دیو ہیکل قدموں میں سبزہ زاروں کی رونق اور دریا کی لہروں پر کشتیوں اور بجروں کے جمگھٹے، یہ سب ہوشربا مناظر تھے۔ ان ہوشربا مناظر کو زیادہ وضاحت سے دیکھنے کے لیے ٹاور پر ٹیلی اسکوپس بھی نصب تھیں۔ ان میں ایک یورو کا سکہ ڈال کر کئی منٹ تک پیرس کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ عینی نے شہزاد کی گردن پر اپنی خوبصورت ناک رگڑی۔ ''کس سوچ میں کھو گئے ہیں مائی لارڈ؟''

''کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔''

''یہ تو کسی انڈین گانے کے بول ہیں؟ کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔ اچھا چلیں چھوڑیں اس بات کو۔ اپنے باکمال ہاتھوں سے میری ایک تصویر کھینچیں۔'' اس نے اپنے طویل بال، ہیئر کیچر میں سے نکالے اور بڑی بے باکی سے پوز بنا کر کھڑی ہو گئی۔ شہزاد نے تصویر کھینچی شہزاد کی کھینچی ہوئی ہر تصویر پر وہ دل وجان سے فدا ہو جاتی تھی۔

کافی دیر تک ٹاور سے پیرس کا نظارہ کرنے کے بعد وہ آٹھ دس زینے اتر کر ذرا کشادہ جگہ پر آ گئے۔ یہاں کرسیاں وغیرہ بھی رکھی تھیں۔ ٹاور سے اتاری گئی پیرس کی بڑی بڑی تصویریں بھی یہاں آویزاں تھیں، عینی نے پتا نہیں کیسے اور کہاں سے دو آئس کریم کونز حاصل کر لیں۔ اس نے اصرار کر کے شہزاد کو آئس کریم کھلائی لیکن اپنی یونہی ہاتھ میں پکڑے رکھی۔ جب شہزاد ایک چوتھائی کھا چکا تو اسی نے شہزاد والی آئس کریم لے کر اس کے ہاتھ میں اپنی تھما دی۔

''یہ کیا؟'' شہزاد نے حیرت سے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک محبت بھری شوخی ابھری۔ وہ کچھ کہے بغیر شہزاد والی آئس کریم کھانے لگی۔ ''میں آپ کو صرف خیالوں اور سپنوں میں دیکھتی تھی۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن آئے گا جب آپ اس طرح میرے ساتھ ہوں گے۔ آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوگا اور ہم پیرس میں گھوم رہے ہوں گے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ قریباً یہی وقت تھا جب شہزاد کی نگاہوں میں بجلی سی کوند گئی۔ کوئی شخص اندھا دھند اس پر جھپٹا۔ اضطراری طور پر شہزاد نے خود پیچھے ہٹایا، ایک اچٹتا ہوا سا ہاتھ، اس کی گردن پر پڑا۔ آئس کریم کون شہزاد کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اسے یقین نہیں آیا لیکن یقین کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ شارق تھا اور ایک بار پھر دیوانہ وار اس پر جھپٹ رہا تھا۔ تب شہزاد نے دیکھا کہ ایک جسم اس کے اور شارق کے درمیان آ گیا ہے۔ یہ عینی تھی وہ زور سے چلائی اور اس نے پوری طاقت سے شارق کو روکا۔ شارق جیسے طیش کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ اس نے اسے کسی گڑیا کی طرح اچھال کر ایک طرف پھینک دیا......

اردگرد تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ مرد وزن شور مچاتے گرتے پڑتے چاروں طرف بھاگے۔

شارق نے لوہے کی ایک کرسی اٹھائی اور پوری قوت سے شہزاد کو دے ماری۔ شہزاد کرسی کو اپنے ہاتھوں پر لیتا ہوا دور جا گرا۔

''حرامزادے...... جنگلی کی اولاد...... آج میں تیری جان لے لوں گا۔'' شارق کا لہجہ خوفناک تھا۔ وہ بالکل جنونی دکھائی دے رہا تھا۔

پھر شہزاد نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ شارق کے ہاتھ میں کوئی سیاہ چیز نظر آئی، بلاشبہ یہ چھوٹے سائز کا جدید پستول تھا۔ ایک بپھرے ہوئے دشمن کے ہاتھ میں اس طرح پستول کو دیکھنا ایک خوفناک نظارہ تھا۔

اس سے پہلے کہ شارق پستول سیدھا کرتا اور شہزاد کو نشانہ بناتا، عینی کسی چیل کی طرح جھپٹی اور شارق سے لپٹ گئی۔ ساتھ ساتھ وہ پکار رہی تھی۔ ''ہیلپ...... ہیلپ۔''

اس کی دلیری دیدنی تھی، اچانک فائر ہوا، یہ گولی شارق کے ہاتھوں سے بے ساختہ چلی تھی۔ شہزاد لپکا اور عینی کی مدد کرنے لگا۔ اس نے شارق کا پستول والا ہاتھ اس طرح مروڑا کہ پستول کا رخ فرش کی طرف ہو گیا۔ یہی وقت تھا جب دو تین پولیس اہلکار بھی شارق سے لپٹ گئے۔ انہوں نے شارق سے پستول چھین کر اسے اوندھا گرایا اور اس کے ہاتھ آہنی ہتھکڑی میں جکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے ہوئے شارق کو بے بس کیا جا چکا تھا۔

اور تب شہزاد کو صورتِ حال کی ایک دوسری سنگینی کا پتا چلا۔ شارق کے پستول سے نکلنے والی اعشاریہ پچپن کی گولی ایک دس بارہ سالہ خوبصورت لڑکے کے جبڑے میں لگی تھی، وہ زخمی حالت میں ایفل ٹاور کے جنگلے کے پاس پڑا تھا اور ایک عورت جو یقیناً اس کی ماں تھی دلدوز انداز میں چلّا رہی تھی۔ لڑکے کا خون کنکریٹ کے فرش پر گل کاری کر رہا تھا۔

ایفل ٹاور پر سے پیرس بڑا خوبصورت نظر آتا تھا مگر ایک دم شہزاد کو لگا کہ پورے پیرس پر خون کے چھینٹے پڑ گئے ہیں۔ منظر اس کی نگاہ میں دھندلا رہے تھے۔ عینی روتی ہوئی اس کی بانہوں میں سما گئی۔

☆☆☆

یہ مکافات عمل تھا۔ شارق ایک ایسے سنگین مسئلے میں پھنس گیا تھا کہ اس کے مقابلے میں ماموں جہانگیر والا معاملہ بھی ہیچ تھا۔ اس کی گولی سے ایک معروف مقامی لیڈی ڈاکٹر کا بیٹا شدید زخمی ہوا تھا۔ جس پستول سے گولی چلائی گئی تھی وہ بھی ناجائز اسلحے کے زمرے میں آتا تھا۔ اس کیس میں شارق کو نو دس سال تک سزا ہو سکتی تھی۔ ماموں جہانگیر اور ان کی ساری فیملی ایک دم اپنے گھٹنوں پر آ گئی۔ وہ لوگ اب عینی اور اس کے والدین کی منت سماجت میں مصروف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اور کچھ نہیں تو خاندان کا سربراہ تو سلاخوں سے باہر آ جائے۔ درحقیقت شارق کی بدقسمتی ہی اسے وقت سے پہلے یہاں پیرس میں کھینچ لائی تھی۔ اسے دس تاریخ کو آنا تھا مگر وہ پانچ تاریخ کو ہی چلا آیا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے معلوم کر لیا تھا کہ شہزاد کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے...... پھر ہفتے کی صبح اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شہزاد اور عینی گھومنے پھرنے کے لیے سرخ پی جو گاڑی پر کس طرف گئے ہیں۔ وہ اس کے پیچھے ہی پیچھے ایفل ٹاور پہنچا اور وہاں وہ سنگین ترین واقعہ رونما ہو گیا۔

قریباً ڈیڑھ ماہ بعد لواحقین کی ان تھک کوششوں اور عینی کی مہربانیوں سے ماموں جہانگیر کی بیل ہو گئی مگر شارق کا معاملہ طویل اور سنگین تھا۔ آئندہ کئی برسوں تک اس کی جان چھوٹتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

شہزاد کا ویزا ختم ہونے میں ابھی آٹھ روز باقی تھے جب پاکستان میں اس کی بات فاخرہ سے ہوئی۔ وہ یہاں کے بیشتر حالات سے آگاہ ہوچکی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ماموں جہانگیر اینڈ فیملی ان واقعات کے بعد مکمل طور پر پسپا ہوچکی ہے۔ کچھ لوگوں کے اصل دم خم کا پتا کڑی آزمائش کے وقت ہی چل پاتا ہے اور ماموں جہانگیر اینڈ فیملی کا بھی پتا چل گیا تھا۔ اس روز فاخرہ نے اشک بار لہجے میں کہا۔ ''شہزاد! میری زندگی کا اب کوئی پتا نہیں۔ زیادہ بھی جیوں گی تو دو تین سال سے زیادہ کیا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنی بات آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔ کیا آپ میری اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کرسکتے؟''

''کیا کوئی نئی بات کرنے جارہی ہو؟''

''نہیں شہزاد! بات تو وہی پرانی ہے۔ کاش آپ کوئی نیا جواب دے دیں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جب آپ یہاں واپس آئیں تو عینی آپ کے ساتھ ہو؟''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ کیسے آسکتی ہے؟''

''آپ کی بیوی بن کر۔ میری بہن بن کر۔ مجھے آپ کی قسم ہے شہزاد! میں اتنا خوش ہوں گی کہ آپ کو بتا نہیں سکتی۔ مجھے لگے گا کہ مجھے ہی نہیں آپ کو اور میرے بچوں کو بھی زندگی بھر کا تحفظ مل گیا ہے۔ میں نے اس لڑکی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے شہزاد۔ وہ جیسی بھی ہے لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ آپ کی اور میرے بچوں کی ساری محرومیوں کو دور کردے گی۔ وہ آپ ہی کو نہیں ہم سب کو بھی بہت چاہتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں شہزاد! میں اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے سیج سجاؤں گی، عینی کو دلہن بناؤں گی۔ پلیز شہزاد...... پلیز......'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فون پر سسکیاں بھرنے لگی۔

فاخرہ نے بہت زور لگایا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر شہزاد چاہے تو وہ ان سات آٹھ روز کے اندر ہی عینی کو بڑی سادگی سے دلہن بنا کر پاکستان لاسکتا ہے...... اور یقیناً ایسا ہوسکتا تھا۔ عینی اور جمیل صاحب کی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ فرزانہ بھی اچھی طرح جان چکی تھی کہ عینی کے کسی فیصلے سے اختلاف کرنا کتنا کٹھن ہوسکتا ہے لیکن شہزاد کا ذہن کسی طور اس طرف نہیں آسکتا تھا۔ اپنی اور عینی کی عمر کا ''تفاوت'' اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا پھر ایک احساس یہ بھی تھا کہ وہ فرزانہ کی بیٹی ہے۔

اس نے اگلے قریباً اڑتالیس گھنٹے میں سیکڑوں ہی سگریٹ پھونک ڈالے۔ اپنے آپ سے الجھتا رہا اور اپنی سوچوں سے برسرپیکار رہا لیکن بدھ کی اس دھند آلود صبح کو جب وہ پیرس سے روانہ ہوا تو اکیلا ہی تھا۔ فرزانہ، جمیل اور عینی تینوں اسے ایئرپورٹ پر الوداع کہنے کے لیے آئے۔ عینی بالکل خاموش تھی۔ وہ پچھلے تین چار دن سے تقریباً خاموش ہی رہی تھی۔ اسے جیسے آخر وقت تک توقع تھی کہ شہزاد کچھ بولے گا، کچھ کہے گا۔ یہاں تک کہ ایئرپورٹ پر آخری لمحوں میں بھی اس کی آنکھوں میں آس کے دیے جل بجھ رہے تھے مگر وہ چپ رہا تھا، کسی پتھر کی طرح اور پھر جب جہاز نے ایئرپورٹ سے ٹیک آف کیا اور نیچے دور تک محبتوں کا شہر پیرس بجھا ہوا دکھائی دیا...... تو شہزاد کا پتھر سینہ پتھر نہ رہا۔ اس کی آنکھوں میں نمی جاگی اور آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ وہ جو زندگی میں کبھی نہ رویا تھا، نمناک تھا اور وہ سخت حیران تھا کہ ایسا کیوں ہورہا ہے۔ اس نے نشست سے ٹیک لگا کر ٹشوز آنکھوں پر رکھ لیے اور خاموش پانی کو بہنے دیا۔

اس نے سوچا، کیا کہیں عینی بھی رو رہی ہے۔ اگر وہ رو رہی تھی تو اس کا مطلب تھا، نجمہ کی آنکھیں رو رہی ہیں۔ اس کا دل جیسے کسی مٹھی میں آگیا۔ وہ دل ہی دل میں کراہا...... مجھے معاف کردینا نجمہ! میں نے تمہاری آنکھوں کو آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دیا، اٹھائیس سال پہلے بھی اور اب بھی۔ مجھے معاف کردینا۔

انگلش میں اناؤنسمنٹ ہورہی تھی۔ معزز خواتین و حضرات ہم 36000 فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے قریباً آٹھ سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے ''جنیوا'' کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جہاز سے باہر درجۂ حرارت ہے منفی 20 سینٹی گریڈ، ہماری فائنل ڈیسٹی نیشن کراچی ہے۔

☆☆☆

اور اب وہ پھر کراچی میں تھا۔ فاخرہ کو چپ سی لگ گئی تھی...... شہزاد نے اس کی ہر التجا رد کردی تھی اور اس کا قلق اس کی آنکھوں سے صاف جھلکتا تھا۔ دھیرے دھیرے دو تین ہفتوں میں شہزاد کی مصروفیات معمول پر آنے لگیں۔ اس دوران میں ایک دو بار شہزاد نے پیرس میں فرزانہ سے رابطہ بھی کیا۔ وہاں ابھی تک سب کچھ ٹھیک تھا۔ شہزاد کو زیادہ اندیشہ عینی کی طرف سے تھا۔ اگر وہ حالات کا زیادہ اثر لیتی تو پھر بیمار پڑ سکتی تھی۔ دو تین بار فرزانہ نے کہا بھی کہ وہ عینی سے بات کرے مگر شہزاد کنی کترا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ عینی جلد از جلد خود کو نارمل کرے اور وہ کرسکتی تھی۔ اس میں قوت ارادی کی کمی نہیں تھی۔ دن گزرتے رہے، واقعات کی گرد میں پرانے

واقعات دبتے رہے۔ پیرس میں شارق پر کیس چل رہا تھا اور اسے سزا ہونا یقینی تھی، ڈھائی تین ماہ بعد پاکستان میں سردیاں شروع ہوگئیں۔ سردیوں کے آغاز میں ہی فاخرہ کی طبیعت پھر بگڑ گئی، یوں تو وہ بستر پر ہی رہتی تھی، اب اس کے لیے وہیل چیئر تک آنا بھی دشوار ہوگیا۔ اسے دس پندرہ روز اسپتال میں رکھا گیا...... کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اسپتال کی بھاگ دوڑ سے پریشان ہوکر وہ پھر گھر جانے پر مصر ہوگئی۔

شہزاد نے کوشش کرکے گھر میں ہی اسے اسپتال کی بیشتر سہولتیں مہیا کردیں۔ ایک نرس تو ویسے بھی ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی۔

کبھی کبھی شہزاد تنہائی میں بیٹھتا تو سوچتا کہ شاید اسے فاخرہ کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ اس نے کتنے درد کے ساتھ التجا کی تھی، بلکہ التجائیں کی تھیں۔ اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہوگیا اور وہ یہ بات اپنے دل میں ہی لے کر چلی گئی تو وہ باقی زندگی خود کو کوستا رہے گا، لیکن اب دوسری طرف وہ دیکھ رہا تھا کہ عینی نے بتدریج خود کو سنبھال لیا ہے۔ پچھلے چھ ماہ میں صرف ایک مرتبہ فرزانہ کی موجودگی میں عینی کے ساتھ فون پر مختصر بات ہوئی تھی۔ وہ نارمل ہی محسوس ہوئی تھی۔ سب سے بڑا اندیشہ جو شہزاد کو اس کی بیماری کی طرف سے تھا وہ بھی غلط ہی ثابت ہوا تھا۔ اس نے کوئی اور الٹی سیدھی حرکت بھی نہیں کی تھی۔ تو کیا وہ آہستہ آہستہ اسے بھول رہی ہے؟ شہزاد سوچتا۔ اس کا کوئی واضح جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ کسی وقت وہ اپنے دل میں جھانکتا تو وہاں سے بھی کوئی واضح جواب نہ ملتا۔ وہاں جو ایک خلا سا پیدا ہوچکا تھا وہ موجود تھا۔ اس خلا میں عینی اپنے تمام تر بچپنے اور تمام تر دانائی کے ساتھ موجود تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، چھوٹی چھوٹی یادیں۔

ایک دن فون پر حسنات سے مختصر بات ہوئی۔ حسنات کو اپنے طور پر پیرس کی تھوڑی بہت خبر رہتی تھی۔ اس نے شہزاد کو بتایا کہ آج کل عینی یونیورسٹی کے ساتھیوں کے ساتھ آسٹریا کے سفر پر نکلی ہوئی ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کا یہ گروپ کسی ''چیریٹی'' پروگرام کے لیے بھی کام کررہا ہے۔ اس گروپ سے کچھ ارکان اسٹیج پر بھی پرفارم کرتے ہیں۔

ہاں تو کیا وہ آہستہ آہستہ اسے بھول رہی ہے؟

ایک رات بستر پر چت لیٹے لیٹے ایک خیالی منظر شہزاد کے پردۂ تصور پر ابھرا اور اس کا دل بے نام درد سے بھر گیا۔ اس نے چشم تخیل سے دیکھا۔ عینی ساڑھی پہنے ہوئے ایفل ٹاور کے سبزہ زاروں میں بھاگ رہی ہے۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اس کا فرانسیسی بوائے فرینڈ ہے۔ ایک کسرتی جسم اور سنہری بالوں والا خوبرو نوجوان...... دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے ہوئے ہیں اور بھاگتے بھاگتے گاہے بہ گاہے ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں۔ ان کے کانوں پر ہیڈفونز ہیں جن سے ابھرنے والی موسیقی کی تیز لہریں ان کی مستی میں اضافہ کررہی ہیں۔ شہزاد دریا کے کنارے پر بیٹھا انہیں دیکھ رہا ہے۔ انہی دو بوڑھوں کی طرح جو شاہِ بلوط کے درختوں تلے گم صم بیٹھے رہتے تھے۔

عینی اور اس کے بوائے فرینڈ کی نظر شہزاد پر پڑتی ہے۔ عینی ہنستے ہوئے انگلش میں کہتی ہے۔ ''آؤ، پروفیسر شہزاد! آؤ ہمارے ساتھ بھاگو۔''

شہزاد خاموش رہتا ہے۔ اس کا بوائے فرینڈ قہقہہ لگاتا ہے، کہتا ہے ''انکل جی کو دھوپ سینکنے دو، یہ یہیں پر اچھے لگتے ہیں۔''

''ہاں، ایسی چیزیں...... ایسی جگہوں پر ہی اچھی لگتی ہیں۔'' عینی بھی تائید کرتی ہے، پھر دونوں ہنستے ہوئے اوجھل ہوجاتے ہیں۔

شہزاد نے اس تصور سے گھبرا کر آنکھیں بند کیں۔ جب آنکھیں بند ہوئیں تو اسے اندازہ ہوا کہ وہاں نمی تیر رہی تھی۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ شہزاد ایک طویل کمرشل کی ریکارڈنگ سے فارغ ہوکر اور ایک اخباری نمائندے کو انٹرویو دینے کے بعد رات بارہ بجے گھر آیا۔ فاخرہ خلاف معمول جاگ رہی تھی۔ کامن روم میں دو اٹیچی کیس پڑے تھے جن پر امارات ایئرلائن کے اسٹیکر لگے ہوئے تھے۔

''یہ کون آیا ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''عینی۔'' فاخرہ نے عجیب انداز سے کہا۔

شہزاد کے سر پر جیسے بم پھٹ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے فاخرہ کو دیکھتا چلا گیا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' دروازے کی طرف سے عینی کی آواز ابھری۔ وہ بڑے ٹھسے سے وہاں کھڑی تھی۔ اس نے گلابی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ آج پہلی بار اس کے پاؤں میں ساڑی کے ساتھ جوگرز کے بجائے سینڈل نظر آرہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔

''کک...... کب آئی ہو تم یہاں؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''میں جانتی ہوں جی کہ یہ اکیلا سوال نہیں ہے۔ اس

کے علاوہ بھی بہت سے سوال ہیں جو آپ کو یہ پوچھنے ہیں۔ آئیے میرے ساتھ، میں سب سوالوں کے جواب دیتی ہوں۔'' اس نے ادا سے جھک کر ساتھ والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ فاخرہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''میں اس تفتیش سے فارغ ہو کر ابھی آتی ہوں آنٹی، آپ اتنی دیر میں یہ ادرک والی چائے پئیں۔''

فاخرہ کو کپ تھما کر اس نے شہزاد کا بازو پکڑا اور اسے علیحدہ کمرے میں لے آئی۔ ''ڈور کلوزر'' نے دروازہ خود بخود بند کر دیا۔ ''جی بتائیے...... اب میں تفتیش کے لیے نیچے بیٹھوں یا آپ کے برابر؟''

''عینی مذاق نہیں۔ میرا دماغ چکرا رہا ہے، تم اچانک......''

''اچانک؟ آپ اب بھی اسے اچانک کہہ رہے ہیں؟'' اس نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔ ''مائی لارڈ! ڈھائی تین برس ہو چلے ہیں اس سارے افیئر کو۔ تب میں بیسویں سال میں تھی اب بائیس سے اوپر ہو چکی ہوں۔''

شہزاد بے دم سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن واقعی چکر کھا رہا تھا۔ وہ عجب مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے بالوں کے نیچے ہاتھ ڈالا اور اپنا لمبا جھمکا اتارنے لگی۔ ''ایک اتاروں یا دونوں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' شہزاد نے کہا۔

''آپ نے تھپڑ وغیرہ نہیں مارنے مجھے؟ آپ کے ہاتھ کو چوٹ لگے گی مائی لارڈ۔ ہوسکتا ہے کہ میرا بھی گال زخمی ہو جائے۔'' وہ عجب معصوم شوخی سے بولی۔

''عینی...... مسخری نہ کرو پلیز...... مجھے بتاؤ، اکیلی آئی ہو یا......''

''بوائے فرینڈ بھی ساتھ ہے، وہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ مجھے یہاں لانا اچھا نہیں لگا، اگر آپ اصرار کریں گے تو پھر سوچ لوں گی۔''

شہزاد کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ یہ رنگ دیکھ کر عینی کے اندر سے ہنسی کسی فوارے کی طرح ابل پڑی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ شہزاد خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر ہنسنے کے بعد اس نے خود کو پرسکون کیا اور بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے مائی لارڈ! میرے تو جو کچھ ہیں آپ ہیں۔ آپ سب ہیں۔ میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ میں آپ کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں۔ نہ ہی میں ان لڑکیوں میں سے ہوں جو ایسے معاملوں میں تھک ہار کر بیٹھ جاتی ہیں۔ پھر ساری زندگی دوسروں سے جھوٹ بولتی ہیں اور اپنے آپ سے بھی۔ جینے کے لیے نئے راستے ڈھونڈ لیتی ہیں۔ نہیں جناب نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہوگا۔''

''تو کیا ہوگا؟''

''ہم دونوں کی شادی ہوگی۔'' وہ بڑے سکون سے بولی۔ ''سب راضی ہیں، سب کے سب۔ بس آپ کے اقرار کی ضرورت ہے۔''

شہزاد نے ایک طویل سانس لی اور اٹھ کر اپنا رخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ ''اور اگر...... میں انکار کر دوں تو؟''

''پھر میں بلیک میلر بن جاؤں گی۔ آپ کو دن میں تارے دکھا دوں گی۔'' وہ مسکرائی۔

''کیا مطلب؟'' شہزاد غصے سے بولا۔

''دیکھیں، میں اسی لیے تو جھمکے اتار رہی تھی۔''

''عینی! تم مجھے تکلیف دے رہی ہو، ہم سب کو تکلیف دے رہی ہو۔''

''میں کسی کو تکلیف نہیں دے رہی اور نہ دوں گی۔ بس اپنے آپ کو تکلیف دوں گی۔'' اس کا لہجہ ایک دم سنجیدہ تر ہو گیا۔ شہزاد نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''جناب! میں وہی کروں گی جو اس سے پہلے کیا تھا...... اور اگر آپ کی بھاگ دوڑ سے بچ گئی تو پھر تیسری بار کروں گی...... اور پھر چوتھی بار۔ یہاں تک کہ مر جاؤں گی، یا آپ مان جائیں گے۔''

شہزاد نے چونک کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر نجمہ کی آنکھیں تھیں اور یہ آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، دل کی عمیق گہرائیوں سے کہہ رہی ہے اور وہ صرف کہہ ہی نہیں رہی بلکہ اس پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ بھی رکھتی ہے، ہاں اس مرتبہ وہ شکست ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس مرتبہ وہ شہزاد کو ہر صورت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ چوتھائی صدی کے طویل انتظار کے بعد لوٹی تھی اور جس روپ میں لوٹی تھی وہ ''روپ'' پیچھے ہٹنا نہیں جانتا تھا۔

شہزاد بے دم سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ آگے بڑھی۔ اس نے جھک کر بڑے اعتماد سے شہزاد کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما...... وہ جیسے پتھرایا ہوا تھا۔ اس نے شہزاد کے ہونٹوں پر ایک بوسہ دیا۔ شہزاد اپنے سر کو ذرا سا پیچھے ہٹانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ اسے چومنے کے بعد وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے شہزاد کے ردِعمل کا انتظار کر رہی ہو۔ اس کے اس انتظار میں ہلکا سا خوف بھی شامل تھا۔

شہزاد مفلوج سا ہو گیا تھا۔ کچھ بھی نہ کر سکا، کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس ایک میٹھا سا درد تھا جو اس کے ہونٹوں سے لے کر اس کے دل تک ایک لہر کی صورت دوڑ گیا۔ شہزاد کو بے حرکت بیٹھے دیکھ کر عینی کے چہرے پر خوف ماند پڑ گیا۔ اس کی بلوری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی جاگی اور اس نے معافی مانگنے کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ شہزاد کے سامنے جوڑ دیے، پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بڑی تیزی سے ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ عینی کو بہت جلدی ہے۔ اس کی جلدی کی وجہ شہزاد کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھی...... دس بارہ دن کے اندر فرزانہ، جمیل صاحب اور زارا خاموشی سے پاکستان پہنچ گئے۔ زارا تھوڑا انتظار کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے شوہر ریحان کو چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ زارا کی خواہش تھی کہ دس پندرہ روز تک وہ آ جائے تو نکاح کی رسم ہو، مگر عینی نے زارا اور فرزانہ سے طویل تبادلۂ خیال کیا اور انہیں آمادہ کر لیا کہ ریحان سے معذرت کر لی جائے۔ جمیل صاحب کی تو کوئی بات ہی نہیں تھی، وہ وہی کرتے تھے جو عینی کہتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ہمیشہ ٹھیک کہتی ہے۔ اس کی کوئی بات غلط نہیں ہوتی۔ انہیں عجیب بھروسا تھا بیٹی پر۔

فاخرہ نے حسبِ وعدہ اور حسبِ خواہش اس مختصر سی تقریب کی تیاری میں بھرپور حصہ لیا وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر بازار گئی۔ عینی کے لیے زیور اور کپڑے وغیرہ لے کر آئی اور پھر اس نے اپنی نگرانی میں عینی کا کمرا آراستہ کرایا۔ وہ اپنی ہمت طاقت سے بڑھ کر کام کر رہی تھی۔ اسے ہر آٹھ گھنٹے کے بعد انجکشن لگوانا پڑ رہا تھا اور چھاتی صاف رکھنے کے لیے گاہے بگاہے وینٹوجین کی بھاپ بذریعہ مشین دینا پڑتی تھی۔

ایک مختصر سی تقریب میں نہایت سادگی سے عینی اور شہزاد رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ کراچی میں شہزاد اور فاخرہ کا کوئی رشتے دار نہیں تھا اور جو کراچی سے باہر تھے انہیں خبر کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ شہزاد کو یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو پا رہا ہے۔ اس صورت حال میں اس کے لیے اطمینان کی صرف ایک ہی بات تھی۔ فاخرہ کے بیمار چہرے پر ایک ایسی آسودگی اور طمانیت نظر آتی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا شہزاد کے لیے ممکن نہیں تھا۔

شادی کی رات عمیر اور احسن، عینی کے ساتھ بیڈ پر موجود تھے۔ وہ اس سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے اور وہ ان سے کر رہی تھی۔ پھر وہ ان دونوں کو لے کر فاخرہ کے پاس چلی گئی، اس نے رات فاخرہ کے پاس اس کی تیمارداری میں ہی گزار دی۔

اگلے روز شام کو معلوم ہوا کہ عینی نے دونوں نرسوں میں سے ایک کی چھٹی کرا دی ہے۔ یہ وہی نرس تھی جو رات کو ڈیوٹی دیتی تھی اور جس کی طرف سے شہزاد کو غفلت کی شکایات بھی تھیں۔ درحقیقت عینی نے فاخرہ کی تیمارداری کا بیشتر کام خود سنبھال لیا تھا اور دوسری نرس کو بھی بس کسی وقت ہی زحمت دیتی تھی۔ اس کا جو تھوڑا بہت وقت بچ رہا تھا وہ بچوں کو دے رہی تھی۔ شہزاد کی طرف سے وہ تقریباً غافل ہی ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان دونوں کی شادی ہوئی ہی نہیں ہے۔ پندرہ روز شہزاد کے ساتھ رہنے کے بعد فرزانہ، جمیل اور زارا فرانس واپس چلے گئے۔ کچھ بھی تھا یہ ایک رقت آمیز منظر تھا۔ شہزاد اور عینی نے وعدہ کیا کہ جیسے ہی فاخرہ کی طبیعت سنبھلے گی وہ سب، بچوں سمیت پیرس آئیں گے اور ایک بار پھر وہی پُربہار محفلیں جمیں گی جو تین سال پہلے جمی تھیں۔

والدین کے جانے کے بعد عینی کچھ اور بھی فاخرہ کی دیکھ بھال میں مگن ہو گئی۔ ایک دن اس نے شہزاد سے کہا۔ ”شہزاد! آپ ایک بات کا برا تو نہیں مانیں گے؟“

”نہیں...... کہو۔“

”ہم پیرس جانے کے لیے کیوں باجی فاخرہ کے صحت یاب ہونے کا انتظار کریں۔ کیوں نہ انہیں صحت یاب کرنے کے لیے پیرس لے جائیں، وہاں علاج معالجے کی سہولتیں کہیں بہتر ہیں شہزاد، پاپا کے کئی دوست ڈاکٹر بھی ہیں۔“ وہ بڑے متفکرانہ انداز میں بول رہی تھی۔

عینی کی اس بات میں وزن تھا۔ فاخرہ کی صحت خراب ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر اس کی ریڑھ کے پرانے زخم میں انفیکشن قرار دے رہے تھے اور ”اسپائنل کینال“ کے خطرناک ترین آپریشن کا امکان بیان کرتے تھے۔ شہزاد کے ذہن میں بھی یہ بات گھر بنانے لگی کہ فاخرہ کے علاج کے لیے بیرون ملک کوشش کی جائے۔

ادھر یہ فیصلے ہو رہے تھے اور ادھر قدرت کی کتاب میں کوئی اور فیصلہ لکھا جا چکا تھا۔ ایک شام جب شہزاد اور عینی...... فاخرہ کو سہارا دے کر وہیل چیئر پر بٹھا رہے تھے تاکہ اسے اسپتال لے جایا جا سکے، اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اس کی سانس اٹک گئی۔ اسے وینٹوجین مہیا کرنے سے پہلے ہی اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے۔ جب وہ سب مل کر اسے گاڑی میں ڈال رہے تھے، اس کی سانسیں پوری ہو گئیں۔ وہ دنیا کے سارے دکھوں سے آزاد ہو گئی۔

یہ ایک قیامت تھی جو ان کے گھر پر گزری...... فاخرہ کی آخری رسومات میں بیشتر عزیزوں نے شرکت کی اور اس وقت بہت سے عزیزوں کو اس شادی کا علم بھی ہوا۔ ممکن تھا کہ درپردہ باتیں بھی بنائی گئی ہوں اور تمسخر بھی اڑایا گیا ہو مگر کسی کو بھی شہزاد کے سامنے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سب جانتے تھے کہ جب اس معاملے میں جہانگیر صاحب اور شارق جیسے لوگوں کو شکست ہوئی ہے اور وہ منہ چھپاتے پھر رہے ہیں تو وہ کس گنتی میں آتے ہیں۔ درحقیقت ایک لڑکی نے ایک پوری برادری کو مات دے دی تھی۔

فاخرہ کی موت کے بعد شہزاد کئی ہفتوں تک بالکل گم صم رہا۔ ایک آرٹسٹ ہونے کے ناتے وہ بے حد حساس طبع تھا۔ فاخرہ کی جدائی کے لیے بے شک وہ کئی مہینوں سے ذہنی طور پر تیار تھا لیکن پھر بھی اس کے اندر زبردست اتھل پتھل ہوئی تھی۔ جو ایک چیز اس کی ڈھارس بندھاتی تھی وہ یہی تھی کہ وقت رخصت فاخرہ اپنے گھر اور اپنے بچوں کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھی۔ شہزاد اور عینی کی شادی کے صرف دو ماہ بعد فاخرہ چلی گئی تھی...... پتا نہیں کیوں شہزاد کو لگتا تھا کہ عینی نے شادی کے لیے جو بے تابی دکھائی تھی اور شادی کے بعد وہ جس طرح اندھا دھند فاخرہ کی خدمت میں لگ گئی تھی، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ جانتی تھی...... فاخرہ کو جلد رخصت ہو جانا ہے۔ شہزاد کو لگتا تھا کہ ایسا ہی ہے۔ جمیل صاحب اکثر عینی کے بارے میں کہتے رہتے تھے کہ وہ درست فیصلے کرتی ہے اور اس میں حالات کو Predict کرنے کی قدرتی صلاحیت موجود ہے۔ اس حوالے سے جمیل صاحب اور کبھی کبھی فرزانہ بھی مختلف مثالیں دیتی تھی۔ اب شہزاد کا دل بھی گواہی دینے لگا تھا کہ ایسی ہی کوئی بات ہے۔ ایک دن اس نے فاخرہ کی موت کے بارے میں عینی سے بات کی اور اس ”جلدی“ کا ذکر کیا جو عینی نکاح کے لیے کر رہی تھی تو عینی نے کہا۔ ”ہاں شہزاد...... ان دنوں میرے اندر عجیب سی بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ ہمارے پاس وقت کم ہے، حالانکہ ان دنوں باجی کی طبیعت بہتر تھی مگر میرے دل میں عجیب سے اندیشے اترے ہوئے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ دو ماہ، بس زیادہ سے زیادہ دو ماہ اور آپ نے دیکھا ایسا ہی ہوا۔“

دن گزرتے رہے۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا...... شارق کو پیرس میں چھ سال قید کی سزا ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی فیملی کو بھاری ہرجانہ بھی ادا کرنا پڑا تھا۔ فاخرہ کو جدا ہوئے اب قریباً چار ماہ گزر چکے تھے اور عینی شہزاد کی شادی ہوئے تقریباً چھ ماہ۔ لیکن وہ اب بھی شہزاد سے اتنی ہی دور تھی جتنی شادی سے پہلے۔ اس کا زیادہ تر وقت صرف اور صرف بچوں کی نگہداشت میں گزر رہا تھا۔ اس نے بچوں کے لیے ماں کا خلا حیران کن تیزی سے پُر کیا تھا۔ وہ ہر وقت ان کے کاموں میں جتی رہتی تھی۔ جیسے ایک مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں سمیٹنے کی کوشش میں رہتی ہے۔ بچے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کر رہے تھے۔ عینی کی شوخی، بچپنا، الھڑپن سب کچھ ایک باوقار سنجیدگی میں چھپ گیا تھا۔ بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرتی، انہیں کھانا کھلاتی، بیڈ ٹائم اسٹوری سناتی وہ چھوٹی عمر میں بھی دانا بینا دکھائی دیتی تھی۔ بچے ابھی تک اسے ”آنٹی باجی“ ہی کہتے تھے تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلد ہی اسے امی یا ماما کہنے لگیں گے۔

دو تین مہینے پہلے شہزاد کو عینی کے بارے میں ایک خاص بات بھی معلوم ہوئی تھی بلکہ یہ بات عینی نے ہی اسے بتائی تھی۔ اس نے شادی کے بعد فاخرہ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ عینی کی طرح اس کا وعدہ بھی بڑا انوکھا تھا۔ اس نے فاخرہ سے کہا تھا کہ جب تک عمیر انیس بیس سال کی عمر تک نہیں پہنچ جاتا اور احسن کالج اسٹوڈنٹ نہیں بن جاتا، وہ خود ماں نہیں بنے گی۔ اس کے اس ارادے سے فاخرہ نے اتفاق نہیں کیا تھا مگر اسے اپنے فیصلوں کے لیے کسی کی تائید یا توثیق کی ضرورت ہی کب ہوتی تھی۔

بہرحال یہ بات تو شہزاد بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ عینی کی موجودہ ”دوری“ کا تعلق اس فیصلے سے ہرگز نہیں ہے۔ وہ ویسے ہی بچوں میں اتنی مگن تھی کہ اسے شہزاد اور اس کی قربت بھولی ہوئی تھی۔ شہزاد کو بھی کوئی ایسی جلدی نہیں تھی۔ وہ بھی اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو مرمت کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جس طرح وہ بچوں کی طرف توجہ دے رہی ہے ایک دن اس کی طرف بھی متوجہ ہو جائے گی۔ اس کا ہر کام اچانک ہی ہوتا تھا۔

اور پھر وہ شام آ گئی۔ سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا، نومبر کی آخری تاریخیں تھیں۔ عمیر اور احسن اسکول کے ساتھ تفریحی ٹور پر ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے۔ انہیں اگلے روز آنا تھا۔ شہزاد آفس سے واپس آ کر کپڑے بدلنے لگا تو وہ بولی۔ ”رہنے دیں، کہیں باہر چلتے ہیں، باہر ہی کھانا کھائیں گے۔“

اس نے چونک کر عینی کی طرف دیکھا۔ وہاں پھر نجمہ کی آنکھیں تھیں اور ان میں وہی امنگ ترنگ تھی جو ماضی قریب میں دریائے سین کے کنارے نظر آتی تھی، اس ترنگ میں خودسپردگی تھی، جوش تھا اور ان پانیوں کی طغیانی تھی جو اپنا راستہ

بنانے کے لیے پتھریلی دیواروں سے مدتوں سر ٹکراتی ہے۔

شہزاد نے ہامی بھری تو وہ ملازمہ کو چائے کا کہہ کر تیار ہونے چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ یہ پیرس کی شام نہیں تھی لیکن اس میں اس کا رنگ ڈھنگ موجود تھا۔ عینی ایک بڑی شال میں لپٹی ہوئی تھی۔ سرتاپا ایک مشرقی لڑکی نظر آتی تھی۔ ''کہاں چلیں؟''

''وہیں جہاں آپ اور نجمہ خالہ جایا کرتے تھے۔'' وہ ایک دم بولی۔ لہجے میں شوخی تھی۔

شہزاد نے گہری سانس لے کر ہنڈا اکارڈ کا رخ ہوٹل میزان کی طرف موڑ دیا۔ وہ ہوٹل میں داخل ہوئے، ایک نوجوان جوڑے نے شہزاد کو پہچان کر اس سے آٹوگراف لیے۔ ڈائننگ ہال کے ساتھ ایک طرف قطار میں فیملی کیبن بنے ہوئے تھے۔ یہ کل پانچ کیبن تھے۔ ابھی آٹھ بجے تھے۔ ڈائننگ ہال اور کیبن تقریباً خالی ہی تھے۔ وہ ہر چیز کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

''کیبن میں بیٹھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''چلو ٹھیک ہے۔''

''کس کیبن میں؟'' وہ بولی۔

''جس میں مرضی۔''

''نہیں اس کیبن میں جہاں آپ اور خالہ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔''

شہزاد زیرِلب مسکرایا۔ ''تم واقعی سنکی ہو۔ اچھا چلو، تم خود منتخب کرو، کون سے کیبن میں بیٹھنا چاہیے۔''

''میرا امتحان لے رہے ہیں مائی لارڈ؟''

''ایسا ہی سمجھ لو، دیکھتے ہیں تمہاری چھٹی حس کیا کرتی ہے۔''

وہ کچھ دیر تذبذب میں کھڑی رہی، پھر اس نے ایک دم کیبن نمبر چار کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کیبن میں پہنچ کر وہ مسکرائی اور اس نے سوالیہ نظروں سے شہزاد کو دیکھا۔ شہزاد نے حیرانی سے بھویں اچکائیں...... ''تم واقعی، چھٹی حس رکھتی ہو بھئی۔ ایکسٹرا آرڈنری۔''

''تھینک یو...... تھینک یو۔'' اس نے مزاحیہ انداز میں جھک کر کہا۔ ''جب محبت سچی ہو تو اندازے اسی طرح درست ثابت ہوتے ہیں۔''

''بیٹھو۔'' شہزاد بولا، لیکن جان بوجھ کر کسی کرسی کی طرف اشارہ نہیں کیا۔

اسے پھر حیرت ہوئی، جب عینی نے بے دھیانی میں چار کرسیوں میں سے وہی کرسی چنی جو اکثر نجمہ چنا کرتی تھی۔

پتا نہیں کہ یہ چھٹی حس کے کرشمے تھے یا اتفاقات تھے یا ان دونوں کے درمیان کوئی چیز تھی، کیبن کا پردہ برابر ہوگیا۔ ریسٹورنٹ کے نیم گرم ماحول میں پہنچ کر سردی کم ہوگئی۔ عینی نے اپنی لمبی شال کی بکل کھول دی۔ شہزاد دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اسے لگا کہ وہ یکلخت اٹھائیس تیس سال پیچھے چلا گیا ہے۔ عینی نے جو لباس پہن رکھا تھا اس نے شہزاد کے ذہن میں ہلچل سی مچا دی۔ یہ وہی اٹھائیس تیس سال پرانے فیشن کا لباس تھا اور وہ یہ لباس پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ ایک دو بار نہیں کئی بار۔ ہاں یہ وہی لباس تھا ہلکے گلابی رنگ کی شلوار، سفید قمیص جس پر بڑے بڑے گلابی پھول تھے اور گلابی دوپٹا جس پر سفید لیس تھی۔ وہ ان کپڑوں کو پہچان گیا۔ یہ نجمہ کے کپڑے تھے' ان کپڑوں میں اس کم نصیب کی مہک رچی بسی تھی۔

''تمہیں کہاں سے ملے یہ کپڑے؟'' شہزاد نے ششدر ہو کر پوچھا۔

''یہ ماما کے پرانے اٹیچی کیس میں تھے۔ ماما نے چھوٹی بہن کی نشانی کے طور پر رکھے ہوئے تھے۔ تین چار سال پہلے میں نے انہیں اٹیچی سے نکال کر سنبھال لیا تھا۔ ان میں سے مجھے تیس برس پہلے کی بھولی بسری کہانی کی خوشبو آتی تھی۔ میں انہیں پہننا چاہتی تھی لیکن کسی بہت اچھے موقعے پر۔ اس اچھے موقعے کے لیے مجھے قریباً چار سال انتظار کرنا پڑا ہے۔''

شہزاد نے تعجب سے دیکھا۔ یہ لباس عینی کے جسم پر تقریباً پورا آیا تھا۔ اس نے بال بھی نجمہ کی طرز پر بنائے تھے۔ ان تبدیلیوں کے بعد وہ کافی حد تک نجمہ کے مشابہ نظر آنے لگی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس میں ساٹھ ستر فیصد نجمہ کی شباہت پائی جارہی تھی۔ شہزاد نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ آج وہاں ملن کا موسم تھا۔ اس کی ہلکی براؤن پتلیوں میں محبت کا بستر بچھا ہوا نظر آرہا تھا۔ شہزاد سمجھ گیا کہ آج رات وہ اس کے بہت قریب ہوگی۔

اس کی ہمیشہ بولتی آنکھوں نے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ''شہزاد! میں نے کہا تھا ناں کہ میں لوٹ کر آؤں گی۔ میں آگئی ہوں۔''

ڈائننگ ہال کے آڈیو سسٹم پر بڑے دھیمے سروں میں ایک غزل کے بول گونج رہے تھے۔

سبز جنگل میں پرندوں کے ٹھکانوں میں کہیں
وقت چھوڑ آیا ہمیں گزرے زمانوں میں کہیں
گم بھی ہوسکتے ہیں تاریخ کے اوراق میں ہم
مل بھی سکتے ہیں مگر تازہ فسانوں میں کہیں